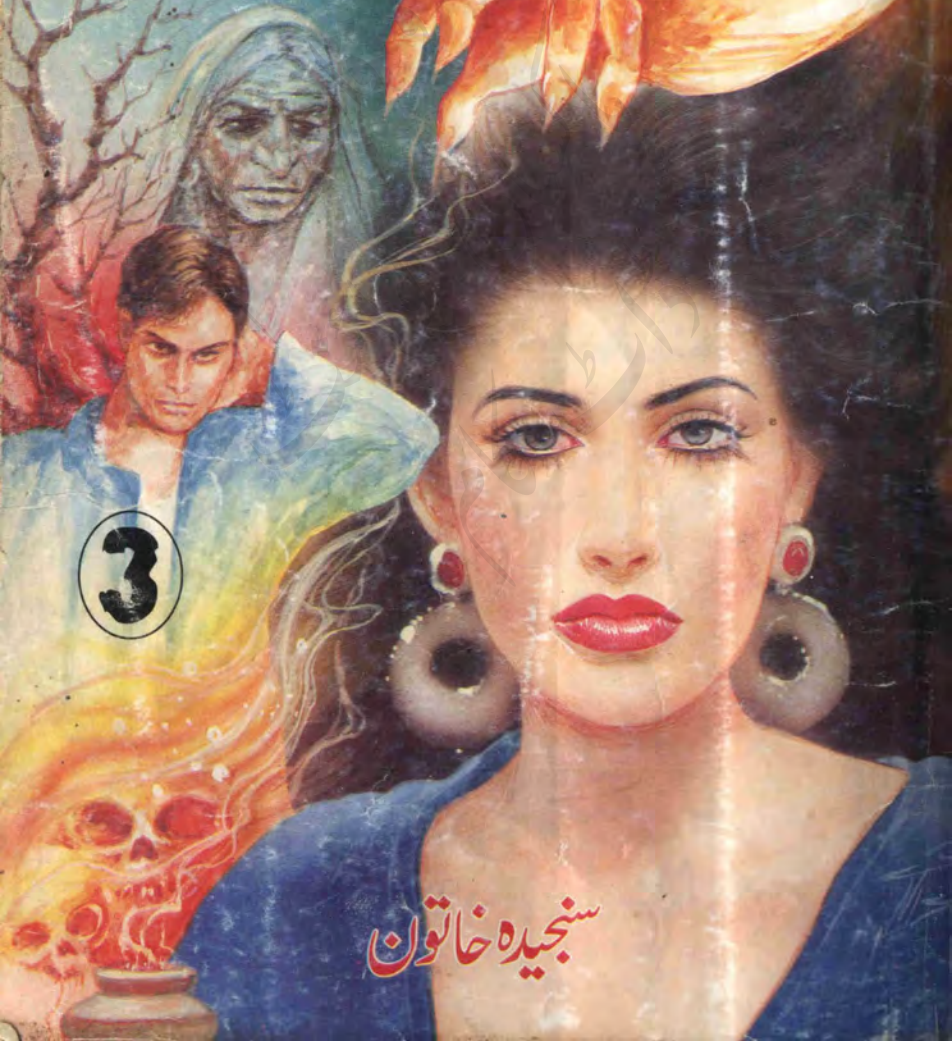


جنات اور کالے اعظم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

حکمت زاد



3

سنبیدہ خاتون

جن زاد

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

جنبل کی گود میں سوئے ہوئے سرہانی گاؤں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دھیمی آواز میں گنگلتا ہوا درہائے جنبل کہیں سبک اور کہیں تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ چاند نے کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں سینے کے بل آگے بڑھ رہا تھا کہ موتی نے سرگوشی کی۔ ”بس ٹھاکرا اب اور آگے جانا خطرناک ہے۔“

ہم دونوں گوجاری کنویں کی عقبی سمت سے بڑھتے ہوئے کنویں کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے موتی کی بات مان لی اور رک کر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔

میں نے آگرہ پولیس کے چیف وجے سنگھ کو کچھ ہی فاصلے پر دیکھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ بار بار کنویں کی دیوار بے سرائٹھا کر سامنے نظر آنے والی گینڈنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں مجھے اسی سمت سے آنا تھا۔ سارے انتظامات میں نے اپنے سامنے مکمل ہوتے دیکھے۔ تقریباً ساٹھ پولیس والے مختلف سمتوں میں چھپے ہوئے تھے، لیکن کنویں کی عقبی سمت کوئی نہیں تھا۔ ادھر سرہانی گاؤں تھا اس طرف سے گویا میرے آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں بھلا کیوں گاؤں سے گزرنے کا خطرہ مول لوں گا؟ پولیس چیف نے یہی سوچا ہو گا کہ حالانکہ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں گاؤں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا۔ پولیس چیف نے میرے ہی سامنے دس مسلح سپاہی کنویں میں بھی اتارے تھے۔ یہ سارے انتظامات

غالباً اس لئے کئے گئے تھے کہ اگر میرا پورا گردہ بھی مقابلے پر آجائے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ گینڈنیوں کی دونوں جانب اونچی اونچی چٹانیں تھیں اس لئے وہاں چھپنے کی اچھی جگہ تھی۔ پولیس چیف نے حکم دیا تھا کہ بلونت سنگھ اور اس کے ساتھی جب تک کنویں کے بالکل قریب نہ پہنچ جائیں انہیں نہ چھیڑا جائے۔ بلونت سنگھ انتہائی چالاک شخص ہے۔ پولیس کی ذرا سی بھی سن گن۔ ملتے ہی وہ سپاہیوں کی زندگی سے کھیلتا ہوا نکل بھاگے گا۔ اس کی نظر میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ جیسے ہی بلونت سنگھ کنویں کے قریب

”دردی میں نے اتاری ہے اور سردی تمہیں لگ رہی ہے۔“ پولیس چیف کی آواز میں طنز تھا۔
”تم میری قیض اور پیٹ میں پتھر بھر لو اور اس کا بنڈل بنا لو۔“ پولیس چیف نے فوجدار کو حکم دیا اس کے
بعد وہ کنویں کی گھر سے سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اسی وقت دور سے ایک اونٹ آتا دکھائی دیا۔ اونٹ کی گردن میں گھٹی بندھی ہوئی تھی۔ گھٹی کے
شور سے سنانا جیسے لرز رہا تھا۔

”جلدی کرو۔“ پولیس چیف نے فوجدار کو مخاطب کیا۔ ”بلونت سگھ آ رہا ہے۔“ پھر دبے سگھ نے
اپنا پستول تان لیا اور بولا۔ ”بلونت سگھ کے ساتھ اونٹ پر کوئی اور شخص بھی بیٹھا ہوا ہے، دو آدمی ہیں۔“
پولیس چیف دبے سگھ یہ کہہ کر گھٹوں کے بل بیٹھ گیا اور تیز نظروں سے ادھر دیکھنے لگا جدھر سے اونٹ
آ رہا تھا۔

میں یہی تماشا دیکھنے وہاں آیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ پولیس کی حماقت پر زور زور سے ہنسون، لیکن
ضبط کر گیا۔ میری ہنسی یہ بازی پلٹ سکتی تھی۔

فوجدار نے پتھر بھر کر بنڈل تیار کر لیا اور پولیس چیف نے اس میں اپنا پستول چھپا دیا۔ اونٹ تیزی
سے قریب آ رہا تھا۔ ایک سوار نے ہاتھ میں لائینن تھامی ہوئی تھی جو اونٹ کی کج رفتاری کے باعث فضا
میں جھولتی محسوس ہو رہی تھی۔

”صاحب! وہ قریب آ رہا ہے، اسے پھونک دو۔“ فوجدار تیزی سے بولا۔
”کیا کہتے ہو؟ مجھے بلونت سگھ کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔“ دبے سگھ نے فوجدار کے شانے پر ہاتھ
مارتے ہوئے کہا۔

”مگر ان کے شانوں پر رانٹھیں کیوں نظر نہیں آ رہی ہیں؟..... شاید انہوں نے پہلو میں
ریوالبور چھپا رکھے ہوں گے۔“ فوجدار نے خود ہی سوال کیا اور جواب بھی دے دیا۔

”کوئی بات نہیں۔“ پولیس چیف کی آواز ابھرنی۔ ”تم یہیں چھپے رہو میں، بانکے کا آدمی بن کر
کنویں پر بیٹھا ہوں۔“ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”بے وقوف بانکے اب تک نہیں آیا۔“

اونٹ اب صرف دس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اونٹ پر سوار دونوں افراد کے چروں پر نشانیں
تھیں۔

دبے سگھ سر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بنڈل اور دوسرے میں ٹارچ تھی۔ اسی
وقت ایسی آواز آئی جیسے اونٹ کے پیچھے کوئی چیز گھٹ رہی ہو۔ پھر اونٹ کی لگام کھینچی گئی۔ دبے سگھ
مزید آگے بڑھا۔ اسی لمحے ایک سوار کے ہاتھ سے لائینن چھوٹ گئی، ساتھ ہی ہاتھ سے لگام بھی نکل گئی۔
آگے بیٹھا ہوا سوار قطعی سناٹ تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر پولیس چیف کی آواز سنائی دی۔ ”ٹھاکرا
نیچے اتریں..... مال لے آیا ہوں۔“

دبے سگھ کی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ سواروں میں سے ایک نے پیر کی ایزی مار کر اونٹ کو
بٹھانے کی کوشش کی۔ دبے سگھ نے بنڈل میں اوپر ہی رکھا ہوا پستول گرفت میں لے لیا۔ ٹریگر پر انگلی رکھ

آئے اسے گھیر لیا جائے اور فرار کے تمام راستے مسدود کر دیئے جائیں، اس سے پہلے نہیں۔ اپنے پولیس
چیف دبے سگھ کی اس قدر احتیاط پر اس کے دوا یک ماتحتوں نے اظہار حیرت بھی کیا تھا۔

”یہ شیر کا شکار ہے جس میں زندگی داؤ پر لگانا پڑتی ہے۔“ پولیس چیف نے کہا تھا۔
مجھے خوب علم تھا کہ پولیس چیف نے میرے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ میں کنویں
پولیس کو بل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”اس کی نظریں اتنی تیز ہیں کہ وہ پچاس گز دور کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے،
دوست ہے یا دشمن۔“ دبے سگھ نے اپنے ماتحتوں کو میرے متعلق بتایا، پھر بولا۔ ”اگر وہ صرف دو
آدمیوں کے ہمراہ آیا تو سارا معاملہ پانچ چھ منٹ میں ختم ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی صورت یہ
گولی چلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔“

کنویں کی گھر کے پیچھے اس کے برابر فوجدار بھی چھپا ہوا تھا۔ میری نظریں اس پر بھی پڑی۔
”ابھی تک بانکے نہیں آیا؟ کیا بات ہے؟“ پولیس چیف نے فوجدار سے سوال کیا۔

”صاحب! وہ بس آنے ہی والا ہو گا۔“ فوجدار نے جواب دیا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی یقیناً
مجھ سے بہت خوفزدہ تھا۔

”کیس آخری وقت وہ پیچھے نہ ہٹ جائے۔“ پولیس چیف نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ ”یا بلونز
سگھ کا خوف اس پر غالب آ جائے۔ وہ ایسا آدمی تو نہیں ہے؟“

اس سوال کا جواب دینے کی بجائے فوجدار نے اپنے رخسار پر ہاتھ مارا۔ ”بڑبڑایا۔“ سارے مجھ
بہت ہیں یہاں۔“

”اسی طرح یہاں ڈاکوؤں کی بھی بہتات ہے۔“ پولیس چیف بولا، پھر پوچھا۔ ”بانکے کو سب کچھ
سمجھا تو دیا ہے؟“

”ہاں ہاں صاحب! اس کے ساتھ سادہ لباس میں ہمارا آدمی بھی ہے۔ دوسرے پہلے میں خود تما
معاملات ٹھیک کر کے آیا ہوں۔ اس نے کارٹوسوں کی پٹنی میں پتھر بھر کر تیار رکھے تھے۔ وہ جانتا ہے کہ آ
آخری وقت میں پیچھے ہٹ گیا تو جیل جانا پڑے گا۔ ہمارا آدمی اسے بھاگنے نہیں دے گا۔“ فوجدار۔
پولیس چیف کو اطمینان دلایا۔

”پھر اب تک وہ آیا کیوں نہیں؟“ پولیس چیف آسانی سے فوجدار کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا
”اگر بانکے کی آمد سے پہلے بلونت سگھ آ گیا تو؟“ کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر دوبارہ پولیس چیف ہی
آواز سنائی دی۔ ”پھر ایک ہی صورت ہے کہ خود کو بانکے کا آدمی ظاہر کر کے بلونت سگھ سے بات
جائے۔“ اس نے فوراً عمل سوچ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ آسانی سے ہمت ہار جانے والا آدمی نہیں ہے۔ ہرچہ
کہ وہ میرا دشمن تھا مگر بزدل دوست سے بہادر دشمن اچھا ہوتا ہے۔

دبے سگھ کو میں نے قیض اتارتے دیکھا پھر وہ صرف نیکر اور بنیان میں نظر آنے لگا۔ پیٹ بھ
اس نے اتار دی تھی۔ فوجدار کے جسم کو میں نے نمایاں طور پر کانپتے دیکھا۔

کر اس نے ٹارچ کا بیٹن دبایا۔ اندھیرے کا سینہ جھرتی ہوئی روشنی کی لکیر اونٹ کے سر سے گزرتی ہوئی دونوں سواروں کے چروں سے ٹکرائی۔ آگے بیٹھے ہوئے سوار کی گردن نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ پیچھے بیٹھا ہوا سوار اچانک ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی چونک اٹھا مگر اس نے دونوں ہاتھ بلند کر کے زور زور سے بلانا شروع کر دیے۔ وجہ سنگھ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اونٹ کے پاؤں جیسے ہی نیچے بیٹھنے کے لئے مڑے تو اس کی پشت پر بیٹھے ہوئے دونوں سوار نیچے آ رہے۔

”خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ ورنہ تم دونوں پھونک دیئے جاؤ گے۔“ سنائے میں پولیس چیف کی آواز گونجی۔

چند ہی لمحے بعد پولیس چیف کے اس ہاتھ کو حرکت ہوئی جس میں ٹارچ تھی۔ ارد گرد چھپے ہوئے سپاہیوں کے لئے یہ مخصوص اشارہ تھا۔ جلد ہی مجھے یہ بات معلوم ہو گئی۔

”بلونت سنگھ! تمہیں ہر طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ وجہ سنگھ کی آواز میں حکم تھا۔

کنویں میں اور ارد گرد چھپے ہوئے تم سپاہی سامنے آ گئے۔ فوجدار ان سب کے پیچھے تھا۔ اسی وقت اونٹ کے پیچھے کچھ حرکت ہوئی۔ وجہ سنگھ نیچے جھٹکا ہوا اونٹ کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے اونٹ کی گردن کے نیچے روشنی ڈالی اور اچھل پڑا۔ میں اب کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا تاکہ اپنے ڈرامے کا آخری منظر دیکھ سکوں۔

”فوجدار!“ وجہ سنگھ کی گرج اتنی بلند تھی جیسے چنبل کے کٹاؤ دار کنارے قہقہے لگا رہے ہوں۔ فوجدار دوڑ کر قریب پہنچ گیا۔ وجہ کو یقیناً اپنی بصارت پر شبہ ہوا ہو گا۔ اس کے سامنے بانٹے اور رام سنگھ زمین پر پڑے تھے۔ سپاہیوں کی انھی ہوئی رائفلیں ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں۔ رام سنگھ پولیس کے اس سادہ لباس آدمی کا نام تھا جسے میں نے مصطفیٰ زندہ چھوڑ دیا تھا۔ وجہ سنگھ نے فوجدار کو ٹارچ تھمائی اور ان دونوں کے قریب گیا۔ بانٹے کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ رام سنگھ کی آنکھوں میں خوف اور شرمندگی تھی۔ اب وجہ سنگھ نے دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کی پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ بانٹے کا لباس خون سے تر بہ تر تھا۔ رام سنگھ کی نقاب کے نیچے اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے پولیس سے بھیانک مذاق کیا تھا۔

ان دونوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا گیا۔ اس دوران وجہ سنگھ نے اپنی وردی پہن لی۔ رام سنگھ کے منہ سے کپڑا نکالا گیا تو وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ پولیس چیف ’فوجدار اور سپاہیوں کو وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔ بانٹے کی لاش زبان حال سے وہ سب کچھ بیان کر رہی تھی جو گزر چکا تھا لیکن ظاہر ہے، ابھی تک کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکا ہو گا کہ سب کچھ کس طرح ہوا؟ رام سنگھ کو اپنے حواس میں آنے کے لئے کچھ وقت لگا۔

وجہ سنگھ کو اس پر غصہ آ گیا۔ ”اب منہ سے بک تو سی کہ کیا ہوا؟“ پھر رام سنگھ نے سب کچھ بک دیا۔ ”اتحق! جب تو نے بلونت سنگھ کے سامنے زبان کھول ہی دی

تھی تو پھر اونٹ پر سوار ہو کر یہاں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم یہاں پورے دو گھنٹے سے پریشان بیٹھے ہیں۔“ وجہ سنگھ نے کہا۔ ”اگر میں فائر کرتا تو تم زندہ نہ بچتے۔“

”صاحب! بلونت سنگھ نے مجھے بانٹے کے ساتھ ہاتھ کر اونٹ پر بٹھا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں گوجاری کنویں کی طرف روانہ ہو جاؤں، اگر گھوم کر دیکھا تو گولی مار دی جائے گی۔ ہم تمہارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔“ رام سنگھ نے جواب دیا۔

”مگر اتحق کے بیٹے! اس بات کا تو یقین کر لینا تھا کہ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آ بھی رہے ہیں یا نہیں۔“ وجہ سنگھ نے غصے سے بے قابو ہو کر رام سنگھ کے ایک ہاتھ جڑی دیا۔

”صاحب!..... وہ میرے پیچھے، بلکہ اونٹ کے برابر تھا کیا آپ نے اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی۔“ رام سنگھ رخسار سہلاتے ہوئے بولا۔

وجہ سنگھ نے اونٹ کی طرف توجہ دی تو اس پر حقیقت کھل گئی اونٹ کی دم سے جوتوں کی ایک جوڑی بندھی ہوئی تھی۔

”صاحب! یہ!..... یہ تو بانٹے کے جوتے ہیں۔“ رام سنگھ نے بتایا۔

”اب بکواس بند کر۔ یہ بتا کہ بلونت سنگھ نے تجھے زندہ کیوں آنے دیا؟“ وجہ نے سوال کیا۔

”صاحب! ایک تو یہ کہ میں نے اس سے جھوٹ نہیں بولا اور سب کچھ بتا دیا اس لئے دوسرے..... وہ بانٹے کی لاش کے ساتھ آپ کو ایک پیغام بھی بھیجنا چاہتا تھا۔“

”کیا!..... کیا پیغام ہے وہ؟“ وجہ نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا۔

”اس نے کہا ہے کہ اپنے چیف سے کہہ دینا اگر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنا ہے تو مرد کی طرح سامنے آئے۔ ڈرپوک شکاری کی طرح چھپ کر جال بچھانا چھوڑ دے۔“ رام سنگھ نے بتایا۔ اس نے لفظ بہ لفظ میرا پیغام پولیس چیف وجہ سنگھ کو پہنچا دیا تھا۔

”بلونت سنگھ کو خود پر اتنا گھمڑا ہے۔“ وجہ کے نکتے پھولنے پھٹنے لگے۔ ”ابھی بات ہے، میں اسے بتا دوں گا کہ میں کیا ہوں۔“

پولیس چیف وجہ سنگھ کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ ناکام لوٹا پڑا۔ بانٹے کی لاش اس کے ساتھ تھی جو اس کی ناکامی کا افسانہ بیان کر رہی تھی۔

نصف شب کے قریب میں چنبل کے غاروں میں پہنچا تو روپا، کنہائی، صوبیدار اور تحصیلدار سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ جاتے ہی میں نے روپا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور اسے گردش دینے لگا ”بٹیا روپا! بھگوان نے آج تجھے میری جان بچانے کے لئے بھیج دیا۔“ میں پورے طور پر بلونت کا کردار ادا کر رہا تھا ورنہ اللہ کی جگہ میری زبان پر بھگوان کا نام نہ آتا۔ ”میری بات سچ ثابت ہوئی۔ بانٹے پولیس سے مل گیا تھا اور پولیس گوجاری کنویں کے پاس گھیرا ڈال کر پڑی تھی۔“ میں زور سے ہنسا۔ غار گونج اٹھا۔

اسی روز سے روپا میرا دایاں ہاتھ بن گیا۔ میں نے اسے خود را کھل چلانا سکھایا۔ روپا کو خود بھی بے حد شوق تھا۔ ڈاکے ڈالتے ہوئے وہ میرے ساتھ آگے آگے رہتا۔ چند ہی روز میں روپا انتہائی سفاک اور

بے لگام ہو گیا۔ میرے سوا وہ کسی اور کی بات نہیں سنتا تھا۔ میں بھی اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ہمت اور ذہانت سے بھرپور رویا علم جیوتش میں بھی ترقی کرنے لگا۔ اپنے باپ جھاد رام کی ساری کتابیں وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ بتادوں کی گردش کو وہ گھنٹوں بغور دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ اچانک مجھے کسی کام سے روک دیتا۔ ”تایا! آج ڈاکا ڈالنے نہیں جائیں گے۔ یہ اچھی گھڑی نہیں ہے۔“ روپا کہتا۔ ”نھیک ہے، آج نہیں جاتے۔“ میں اس کی بات مان لیتا حالانکہ مجھے جیوتش وغیرہ پر یقین نہیں تھا۔

روپا کے ساتھ میرا لاڈ موتی کی آنکھوں میں کھلنے لگا۔ بلونت کا رشتے دار اور پرانا ساتھی ہونے کے باوجود وہ کم درجے پر آگیا تھا۔ یہ بات یقیناً اس نے محسوس کر لی تھی کہ میں اس کے مقابلے میں روپا کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ روپا اور موتی کے درمیان اسی وجہ سے کبھی کبھار تلخی بھی ہو جاتی۔ ایسے موقع پر میں درمیان میں آ جاتا۔ ”موتی! تم دونوں میرے دائیں بائیں بازو ہو، اگر تم دونوں آپس میں لڑو گے تو یہ اچھی بات نہیں۔“ میری مصالحت سے وہ دونوں چپ ہو جاتے۔ گوجاری کنویں کا واقعہ پیش آنے کے بعد اپنے گردہ کو میں نے اور مضبوط کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج نہیں تو کل پولیس، چنبل کے کٹاؤ میں میرا محاصرہ ضرور کرے گی۔

کھیزا راٹھور گاؤں سے اسی عرصے میں یہ خبر آئی کہ نیتا رام اب بھی گاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسے پولیس کا پورا تحفظ حاصل تھا۔ دوسری طرف روپا، نیتا رام کو ختم کرنے کی جلدی کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ”روپا! جلدی نہ کر۔ ابھی بہت تیاری کرنا باقی ہے۔“

جگہ جگہ میں نے اپنے چھپنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔ گاؤں گاؤں میرے مخبر موجود تھے۔ اس طرح پولیس کی نقل و حرکت کے بارے میں بھی مجھے تمام اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اسلحہ فراہم کرنے والے بااعتماد افراد بھی مجھے مل گئے تھے۔ میں رفتہ رفتہ وہی نظام قائم کرنے لگا جو گول وادی میں قائم کیا تھا۔ ڈاکا ڈالنا میرے نزدیک حکومت کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ اس کام میں ذرا سی بھی غفلت موت سے ہمکنار کر دیتی ہے اور نرمی ہو نہیں سکتی۔ لوگ اب مجھے راجا بلونت سنگھ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اب مجھے ڈاکو کہنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ میں بھی اکثر یہی کہتا کہ میں ڈاکو نہیں بائی ہوں۔ میں نے ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کی ہے۔

میں ایسا کہنے میں حق بہ جانب تھا۔ میں ڈاکا ڈالنے کے باوجود عموماً غریبوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ ہر ڈاکے کے بعد میں ایک مخصوص رقم خیرات کرتا، غریبوں کی لڑکیوں کو جیز دیتا۔ رکنی بھی اس کاہر خیر میں میرا ہاتھ بٹاتی۔ میرا اصول تھا کہ میں کبھی کوئی برات نہ لوں، کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتا، اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ میرے لئے ایک رکنی ہی کافی تھی۔ وہ مجھے اتنا سیراب رکھتی کہ کبھی تشنگی محسوس نہ ہوتی۔ رکنی کے سوا اب میری نظر میں کوئی چٹا ہی نہیں تھا۔ عبادت گاہ کسی کی بھی ہو، میں اس کا احترام کرتا۔ مندر، مسجد، گرجا اور گرد و دوارے سب میرے نزدیک قابلِ تکریم تھے۔ گاؤں گاؤں لوگ میرے گن گاتے۔ ان میں زیادہ تعداد غریبوں کی ہوتی کیوں کہ غریبوں سے مجھے خاص طور پر ہمدردی تھی۔

میرے دل میں غریبوں کے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے میں رکنی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک مرتبہ مندر میں آرتی اتارتے وقت میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مندر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ مجھے مندر کے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ ”تایا! روپا نے مجھے مخاطب کیا۔“ چلیں ورشن کر آئیں۔“ وہ بہر حال برہمن زادہ تھا۔ مجھے اتنے عرصے تک ہندوؤں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے رسم و رواج اور عقائد نیز طریقہ عبادت کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔

”مگر روپا! کیا بدوق بھی ساتھ لے چلو گے؟“ میں نے ساتھیوں کو رکنے کے لئے کہہ کر روپا سے پوچھا۔

”نہیں۔“ روپا نے جواب دیا۔ ”بھگوان کے سامنے سر جھکانے میں دنیا کا دھیان نہیں ہونا چاہئے۔“

میں اس کی بات پر ہنسا اور اپنی بدوق شانے سے اتار کر روپا کے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کے سپرد کر دی۔

مندر میں آرتی اتاری جا رہی تھی۔ ہم دونوں مندر کے اندر داخل ہو گئے۔ مندر گاؤں سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا اس لئے سات آٹھ آدمی ہی مندر میں تھے ادھیر عمر پجاری کچھ دیر بعد آرتی کا تھال آگے کر کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”بھولا تاتھ کا پرشاد لو! پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔“

میں نے اس کی طرف نرم نظروں سے دیکھا۔ اس وقت اگر کوئی پجاری سے یہ کہتا کہ اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی مشہور اور خوفناک ڈاکو تھا کہ بلونت سنگھ ہے تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ آرتی کے تھال سے پرشاد (تبرک) لے کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر روپے تھال میں رکھ دیے۔

پجاری کی آنکھیں چاندی کے روپوں کا چھوٹا سا ڈھیر دیکھ کر پھیل گئیں اور اس نے دعا دی۔ ”بھگوان تمہارا بھنڈار (خزانہ) بھرا رکھے۔“

آہستہ آہستہ لوگ مندر سے رخصت ہو گئے۔ میں مندر کا جائزہ لینے لگا۔

”تایا! اب چلیں۔“ روپا بولا۔

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”روپا! مندر بھگوان کے گھر ہوتا ہے۔ انسان اپنا گھر اچھا رکھتا ہے، مگر بھگوان کے گھر کا حال دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی۔ بھگوان کا گھر بالکل کھنڈر بنا ہوا ہے۔“

”بھگت! تمہاری بات سچی ہے۔“ مندر کے پجاری نے کہا۔ ”آرتی کے تھال میں تم نے مٹھی بھر کے روپے ڈالے، اسی وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ رقم مندر کے کام میں لگاؤں گا۔“

میں نے غور سے پجاری کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلو سے بندھی ہوئی روپوں کی تھیلی کھول کر پجاری کے ہاتھ میں دے دی۔

”مہاراج! آرتی کے روپے آپ کے لئے تھے۔ مندر کی مرمت اس رقم سے کرانا۔“ میں بولا۔
”بھولا ناتھ نے میری دعا سن لی۔“ یہ کہتے ہوئے پجاری کی آواز بھرا گئی۔ ”میں بھگوان سے دعا کرتا تھا کہ کسی داتا کو اس مندر کی مرمت کے لئے بھیج دے۔“

”میں نے سنا ہے مہاراج کہ یہ مندر گاؤں کے ٹھاکر نے بنوایا ہے اور اس کے وارث مندر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ پھر مندر کی ایسی حالت کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ دن گئے بھگت!“ پجاری نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اب جو گاؤں کے ٹھاکر ہیں، میں ان سے گزشتہ پانچ برسوں سے مندر کی مرمت کے لئے کہہ رہا ہوں، مگر جب بھی وہ میری بات سنتے ہیں ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، شکر بھگوان تو اس کھنڈر میں بھی رہ سکتے ہیں۔ انہیں آخر ظاہری سجاوٹ کی کیا ضرورت ہے؟“

پجاری کی بات سن کر میں چونکا اور دریافت کیا۔ ”پھر گاؤں کے لوگ چندہ جمع کر کے مندر کی حالت کو بہتر کیوں نہیں بناتے؟“

”بھائی، میں نے یہ بھی سوچا، مگر ٹھاکر نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر گاؤں کے لوگ مندر کی مرمت کرائیں گے تو ان کے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ جسے وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔“ پجاری نے بتایا۔

”تمہارے ٹھاکر کبھی مندر نہیں آتے؟“ میں نے معلوم کیا۔ روپا کے چہرے پر بیزاری تھی مگر وہ خاموش تھا۔

”ٹھاکر یہاں سال میں ایک بار آتے ہیں، کاتک پونم کی شام کو مندر کا گھنٹا چڑھانے۔“ پجاری نے جواب دیا۔

”مندر کا گھنٹا چڑھانے آتا ہے مگر مندر کی حالت دیکھ کر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ میں نے اظہار حیرت کیا۔

”اسے گھنٹا چڑھاتے وقت ارد گرد کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت نشے میں مست ہوتا ہے۔“ پجاری نے قدرے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

اس مرتبہ روپا بھی خاموش نہ رہ سکا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا۔ ”کیا بات کرتے ہو پجاری! وہ بھگوان کے دربار میں نشہ کر کے آتا ہے، تم یہ کس طرح برداشت کرتے ہو؟“

پجاری، روپا کا غصہ دیکھ کر کانپنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر روپا کو مخاطب کیا۔ ”کیا کریں بھائی، راجا کو کون روک سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نشے کے بغیر اس کی کوئی شام نہیں گزرتی۔ گئے سال کی بات ہے، اس کا بوڑھا باپ عاجزی کرنے لگا کہ کاتک کی ایک شام تو شراب کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ جواب میں اس نے اپنے باپ کی زبان کٹوا دی۔ مرتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں اپنے بیٹے سے جیسے التجا کر رہی تھی کہ بیٹا، کچھ بھی ہو شکر بھگوان کی پوجا نہ چھوڑنا، باپ دادا کی جو روایت ہے اسے قائم رکھنا۔“

”اس نے بوڑھے باپ کی زبان کٹوا دی پھر بھی گاؤں والے خاموش رہے؟..... بزدل۔“ میں

غصے میں بولا۔
”آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن بائیس گاؤں کے مالک کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ لوگ کس سے فریاد کریں؟“

”پجاری! اب آنے والی کاتک پونم میں بس چند روز رہ گئے ہیں۔ وہ جاگیردار اس مرتبہ گھنٹا نہیں چڑھائے گا۔ میں تمہیں وجہ دیتا ہوں۔“ میں کہا۔

”اگر ٹھاکر بابو گھنٹا نہیں چڑھائیں گے تو پھر کون.....“
”میں چڑھاؤں گا۔“ میں بول اٹھا۔ ”پجاری! تم مجھے نہیں جانتے، ٹھاکر بلونت سنگھ بائیس گاؤں کے مالک سے نہیں ڈرتا۔“

میرا نام سن کر پجاری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، میری نظریں اس کے چہرے ہی پر تھیں۔ ”آپ..... آپ راجا بلونت سنگھ۔“ پجاری گڑ گڑایا۔ ”آپ میرے مندر میں آئے۔“

”اب پونم کی آرتی کے وقت آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ ”اور سنو! کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہ ہو۔“

”بہتر حضور!“ پجاری نے کہا۔
میں، روپا کو ساتھ لے کر مندر سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

کاتک پونم کی دوپہر ہی سے مندر کے میدان میں انسانی سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس سمندر کا ایک حصہ میں بھی تھا۔ سال بھر ٹوٹی رہنے والی عمارت ایک دن کے لئے لوگوں سے بھر جاتی تھی۔ شکر بھگوان کے درشن کی تمنا، میلے کی موج، پرشاد کالاچ، کسی نہ کسی بھانے آس پاس کے گاؤں والے یہاں جمع ہو جاتے۔ مختلف دیہات کے مہاجن اور کھیا بھی حاضر رہتے تھے کیوں کہ بائیس گاؤں کا مالک اس مندر میں گھنٹا چڑھانے آتا تھا۔ طرح طرح کے بھیل تماشے بھی ہوتے اور کہیں کہیں جوا بھی کھیلا جاتا۔ گزشتہ سال کی نسبت اس مرتبہ مندر کی رونق میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے پرانے جھنڈے کی جگہ اب نیا جھنڈا لگا دیا گیا تھا۔ مختلف اقسام کے درختوں کے پھول پتوں اور جھنڈیوں سے پورا مندر سجایا گیا تھا۔ سیاہ دیواریں اب قلعی ہونے کے بعد چمکنے لگی تھیں۔ مندر کی سجاوٹ دیکھ کر لوگ آپس میں مختلف تبصرے کر رہے تھے۔

”ٹھاکر صاحب نے اس بار خرچ کیا ہے۔ مندر کی سجاوٹ ہی کچھ اور ہے۔“ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

سورج مغرب کی طرف چھکا اور آرتی کی آواز بلند ہوئی۔ نوبت بجنے لگی۔ لوگ دو رویہ قطاروں میں مندر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ٹھاکر صاحب کی کبھی دیکھ کر چھوٹے بڑے سبھی، سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح خاموش ہو گئے۔ کچھ لوگ استقبالیہ نعرے لگوانے وہاں پہلے سے موجود تھے۔

ٹھاکر صاحب خود کبھی سے نہیں اترے بلکہ دوویو قامت آدمیوں نے انہیں کبھی سے اتارا۔ سر پر

سامنے جھکنے کی بجائے سینہ تان کر کھڑا ہے۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، میں نے اسی لئے ہنر سے بچنے کی خاطر ہاتھ کی آڑ کر لی۔ ایک آواز کے ساتھ ہنر میری کلائی سے لپٹ گیا۔ میں نے جھکا دے کر ہنر محافظ سے چھین لیا اور کہا۔ ”بھگوان کے سوا میں کسی کے آگے نہیں جھکا اور گالی کا جواب ٹھوکر سے دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے ایک محافظ کے پیٹ پر بھرپور لات ماری۔ وہ جیج کر الٹ گیا۔ اسی کے ساتھ لوگوں میں شور مچ گیا۔

”ٹھاکرا! گھٹنا چڑھانے کا وقت گزر رہا ہے۔“ پجاری ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔“ ”بھائی! جھگڑا بند کرو۔ بھگوان کے گھر میں جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔“ پجاری کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے سمجھا رہا ہو۔

”بھگوان کا گھر۔“ میں نے زور سے کہا۔ ”پجاری! بھگوان کے گھر میں ایک شرابی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہونا چاہئے۔ اس پانی کے ہاتھوں مندر کا گھٹنا نہیں چڑھے گا۔“

جاگیردار کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا تھا۔ اس کے منہ پر تو کیا شاید پیٹھ پیچھے کسی نے ایسی بات کہنے کی ہمت نہیں کی ہو گی۔ پھر بھلا عوام کی موجودگی میں اپنی یہ بے عزتی اس سے کیسے برداشت ہوتی۔ بائیس ٹاؤں کے مالک نے پہلو سے لپکتی ہوئی تلوار نیام سے باہر کھینچنے کے لئے اس کے دستے پر ہاتھ رکھا۔

تلوار ابھی نیام سے آدمی باہر آئی ہو گی کہ میں نے اس کے ہاتھ پر ہنر مارا۔

”جاگیردار! اپنی تلوار نیام ہی میں رہنے دے۔“ میں تیز اور سخت آواز میں بولا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ کے سامنے ہتھیار اٹھانے کے لئے تجھے دوسرا جہنم لینا پڑے گا۔“

لوگوں نے جیسے ہی میرا نام سنا، سناٹا سا چھا گیا۔ جاگیردار کے آدمیوں کے بلند کئے ہوئے ہتھیار اسی طرح رہ گئے۔ جاگیردار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔ پھر بھی کیوں کہ میں نہتا تھا اس لئے بارعب آواز میں اس نے آدمیوں کو لٹکارا۔ ”ارے سب کھڑے کیا ہو، پیٹ ڈالو اسے۔“

یہ کہتے ہی وہ دو آدمیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

”جا جا بڑل! خاموشی سے اپنی حویلی واپس چلا جا۔ شکر بھگوان کے مندر کا خیال ہے ورنہ.....“

میں نے یہ کہہ کر مجمع کی طرف ہاتھ بلند کر کے مخصوص اشارہ کیا۔ ”دیکھ لے، یہ رانٹیلیں خاموش نہیں رہیں گی۔“

میرے اشارے کے ساتھ ہی مجمع سے بیک وقت کئی رانٹیلیں بلند ہوئیں۔ سب کے سامنے سے گزرتا ہوا روپا مجمع سے باہر آیا اور میرے برابر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کن آنکھوں سے جاگیردار کی طرف دیکھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو بائیس گاؤں کے مالک! زندہ واپس جانا ہے یا.....“ روپا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جاگیردار کی طرف رانٹل تان کر بولا۔ ”صرف ایک گولی کی ضرورت ہے۔“

روپا کا بھیا تک روپ دیکھ کر جاگیردار کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اسے کھڑا رہنے کے لئے دو آدمیوں کا سہارا لینا پڑا پھر اچانک اسے جانے کیا سوچی کہ اس نے ایک نظر اپنی طرف اٹھی ہوئی رانٹل پر ڈالی اور کسی سارے کے بغیر مٹھیاں کس کر دوڑ لگا دی۔ موت کے خوف سے شاید اس کے اندر اتنی ہمت پیدا ہو

جن زاد ☆ 12 ☆ تیسرا حصہ

سفید صاف، پیروں میں نخل کے جوتے، بند گلے کا جو دھوری کوٹ اور نیچے تقریباً جسم سے چپکا ہوا پاجامہ، کمر سے بندھی ہوئی تلوار اور آنکھوں میں نشے کا خمار۔ یہ تھے بائیس گاؤں کے مالک۔ لڑکھائے قدموں اور پھڑکتے ہونٹوں سے ٹھاکر صاحب آگے بڑھے۔ ان کی آمد کا اعلان کیا گیا اور لوگ نعرے بلند کرنے لگے۔ نعرے سن کر ٹھاکر صاحب کے چہرے پر جوش نظر آیا۔

”ہماری مونچھوں کے بل چڑھاؤ!“ ٹھاکر صاحب نے اپنے دونوں طرف ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قوی نیکل افراد کو حکم دیا۔

ٹھاکر صاحب کی یہ حالت دیکھ کر کچھ لوگ زرب لب مسکرا رہے تھے۔ کچھ کے چروں پر مجھے نفرت نظر آئی۔ اس کے باوجود سبھی جیسے مشینی انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ ایک قوی نیکل شخص کے ہاتھ میں گرچھ کی دم کا ہنر تھا اور دوسرا فضا میں تیلی کی لکڑی لہراتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہی لوگوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ قریب سے گزرنے پر لوگ، ٹھاکر صاحب کو جھک کر سلام کرتے ورنہ لکڑی یا ہنر پڑتا۔

مندر کی میزھیوں کے قریب کھادی کے کپڑوں میں ملبوس پجاری ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، مگر اس کی نگاہیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں ابھی تک اس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس دوران ٹھاکر صاحب، پجاری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پجاری نے نمستہ کہنے کے لئے سر جھکا یا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اسی وقت لوگوں کی بھیڑ سے نکل کر میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بالکل مندر کی میزھیوں کے پاس۔ میں، ٹھاکر صاحب کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

”اے! راستے سے ہٹ جا۔ دیکھتا نہیں ٹھاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔“ ہنر والے شخص نے مجھے سختی سے مخاطب کیا۔

”ابے گدھے! اس طرح کیا کھڑا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو نمستہ کر۔“ دوسرا جی حضور یا بھی بولا۔

میں نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔ دونوں جی حضور یے کچھ ہچکچائے۔

”ہاٹ جا احمق!“ ٹھاکر صاحب نشے میں ڈوبی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے سامنے کھڑے دیکھ کر بڑبڑائے، مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ یہ دیکھ کر ٹھاکر صاحب گرجے اور اپنے دونوں محافظوں کو حکم دیا۔ ”سالے کو ہنر لگاؤ۔“

”زبان سنہال ٹھاکرا!“ میں پیچھے ہٹنے کی بجائے چند قدم آگے بڑھ کر تیز آواز میں بولا۔

”خواہ مخواہ یہ بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔“ لوگ اظہارِ افسوس کرنے لگے۔ ”بھلا بائیس گاؤں کے جاگیردار کا راستہ روکنے والا کس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔“

پجاری کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جاگیردار کے عقب میں مسلح آدمی چونکا ہو گئے۔ میری تیز آواز سن کر ٹھاکر صاحب کی ادھ کھلی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ”سالے کی زبان کھینچ لو۔“ جاگیردار چیخا۔ غصے کے سبب اس کا چہرہ بڑک گیا۔

جاگیردار کے حکم پر ہنر والے کا ہاتھ اٹھا اور دوسرا غصے میں بولا۔ ”بے وقوف، ٹھاکر صاحب کے

”نہر جاؤ جاگیردار! میں گھنٹا چڑھاتا ہوں، یہ تو دیکھتے جاؤ۔“ میں نے بھاگتے ہوئے جاگیردار کو لٹکارا، پھر جہوم سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ بالکل نہ گھبراتا۔ اطمینان رکھو، میری موجودگی میں کسی کا بال بیکا نہ ہو گا۔“ مجھے اندازہ تھا کہ کچھ ساہوکار اور مہاجنوں کے سوا باقی لوگوں کو مجھ سے کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عام لوگ تو خود مجھے دیکھنے کے آرزو مند رہتے تھے۔ وہ شخص جس کے تذکرے دن رات سنتے اور وہ جو غریبوں کا ہمدرد تھا، وہ جو مظلوموں کا ساتھی تھا، وہ جو کھلے ہاتھوں خیرات کرتا تھا لوگوں کے چہرے اسے اپنے درمیان دیکھ کر مسرت سے چمک رہے تھے۔ میں ان کے چہروں سے دلی جذبات کا اندازہ بہ آسانی لگا سکتا تھا۔

پجاری نے پوجا کا آغاز کیا۔ میں نے چھت کا نیا گھنٹا چڑھایا۔ جاگیردار جو میری لٹکار پر رک گیا تھا، مردہ چہرے لئے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمی بھی دم بخود ہو کر مجھے گھنٹا لٹکاتے دیکھ رہے تھے۔ لوگ جوش میں آکر ”راجا بلونت سنگھ کی ہے“ کے نعرے لگا رہے تھے۔

”نہیں نہیں!“ میں نے ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو نعرے لگانے سے روک دیا۔ ”بھگوان کے گھر میں انسان کی جے نہیں ہوتی۔“ اس پر لوگ ”شکر بھگوان کی ہے“ کے نعرے مارنے لگے۔ پھر میں بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے آدمیوں کو لے کر جہوم سے الگ ہو گیا۔

جاتے جاتے میں نے جاگیردار کو مخاطب کیا۔ ”تم بائیس گاؤں کے مالک ہو تو عوام کو بھی اپنی اولاد سمجھو۔ اب ہر سال یہاں گھنٹا چڑھانے میں آؤں گا۔“

”بہتر ہے جناب!“ جاگیردار فرماں برداری سے بولا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے چلا آیا۔ رفتہ رفتہ میرا حلقہ اثر بڑھتا گیا۔ اگرہ ضلع سے یو پی کے دوسرے شہروں، چنبل کے کنارے راجستھان اور مدھیہ پردیش کے علاقوں میں بھی میں نے پاؤں پھیلا دیئے۔ مجھے اطلاع ملی کہ دوسرے صوبے والوں نے یو پی کے حکام سے فراد کی۔ ”تمہارا بلونت سنگھ اب ہماری حد میں بھی دھاوے بھرنے لگا ہے، اسے روکنے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“

یو پی پولیس کی عزت گویا دن دہڑائے نیلام ہو گئی۔ مجھے خبریں ملتی رہیں۔ صوبے کے اعلیٰ حکام جمع ہوئے۔ پولیس کی پیشانی پر لگا ہوا داغ دھونے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ ”آپریشن بلونت سنگھ“ ایک منصوبے کا نام رکھا گیا۔ کسی طرح، کتنے ہی خرچ پر مجھے ہلاک کرنے کا حکم ہوا۔ چنبل کے کٹاؤ میں تین طرفہ حملہ کر کے مجھے گھیرنے کا پلان بنا۔ میرا اڈا کہاں ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے خفیہ پولیس کے ہوشیار اور مستعد افراد کو مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہر پولیس افسر کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ مجھے کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ میں یہ تمام اطلاعات بڑے سکون و اطمینان سے سنتا رہا۔

اسی دوران ایک رات روپا کو ٹھکانے تک واپسی میں دیر ہو گئی تو میں اس کی طرف سے فکرمند ہو

سنسناٹی ہوئی ہوا چنبل میں گرج رہی تھی۔ گہرے تاریک کناروں کے کٹاؤ میں میرے ساتھی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے میں اور میرے ساتھی لکڑیوں کا ڈھیر جلا کر جسموں کو گرمی پہنچا رہے تھے۔ شعلوں کی سرخ زبانیں اس طرح لپک رہی تھیں جیسے آڈھوں کی زبانیں بار بار ان کے دہانوں سے لپک رہی ہوں۔ مجھے سوچ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر برابر بیٹھے موتی نے پوچھا۔ ”ٹھاکرا! کس گرمی سوچ میں گم ہیں؟“

”سوچ رہا ہوں، روپا اب تک کیوں نہیں آیا؟“ میں نے پگڈنڈی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”میں نے اسے کئی بار ٹوکا ہے کہ اکیلے باہر نہ جایا کرو، پولیس کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، کبھی مشکل میں پڑ جاؤ گے، مگر وہ مانتا ہی نہیں۔“

”بڑا ہمت والا ہے۔“ موتی بولا۔ مجھے خبر تھی کہ روپا سے حسد کرتا ہے۔ وہ محض میری دل دہی کی خاطر روپا کی تعریف کر رہا تھا۔

معا میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ روپا ہی ہے۔ چیتے جیسی چال کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“ پھر جب روپا قریب آ گیا تو میں نے اپنی گرم ہتھیلیاں اس کے ٹھنڈے رخساروں پر رکھ دیں اور بولا۔ ”تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔“ میرے لیے میں اس کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

روپا نے سر پر بندھا ہوا کپڑا ایک طرف پھینکا، رائفل ایک جانب رکھی اور میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”مجھے دیر ہو گئی۔ اس بھیانک کٹاؤ میں اکیلے تفریق کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔“

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا خبر لایا؟ پلے ہوئے کتے آج کل کس طرف گھوم رہے ہیں؟“

میری نفرت اب روز بروز پولیس والوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اسی لئے ہمیشہ انہیں حقارت سے یاد کرتا تھا۔ یہ نفرت بلا سبب نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس ہمیشہ سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہے اور غریبوں کو قانون کی آڑ لے کے تنگ کرتی رہتی ہے۔ پولیس، ظالموں کا ساتھ دیتی تھی اور خود بھی ظالم تھی۔

”ساری پولیس پلٹن قریب ہی پڑی ہے تاؤ!“ روپا نے آگ میں مزید لکڑیاں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں دور سے دیکھ کر چلا آیا۔“ پھر اس نے یقیناً میرے چہرے پر فکرمندی سے، آثار دیکھ لئے اور کہنے لگا۔ ”فکر نہ کرو، وہ اب تک دوسری سمت میں جھک مار رہے ہیں۔ کل صبح ہی صبح وہ شمال کی طرف جائیں گے جب کہ ہم جنوب کی طرف بڑھیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے روپا کے چہرے پر جوش سا نظر آیا۔ پھر وہ مزید بولا۔ ”اپنے مخبروں نے انہیں الٹے راستے پر لگا دیا ہے۔“

روپا کے آخری الفاظ سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ کچھ دیر بعد حقہ گزرگا کر میں نے پوچھا۔ ”اور کوئی خبر؟“

”اس نیتا رام کو سیدھا کرنا پڑے گا۔“ روپا نے دانت پیس کر کہا۔ ”وہ ہمارے مخبروں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ایک مخبر تواری کو روپوں کا لالچ بھی دیا ہے کہ وہ اسے ہمارا پتا بتا دے۔“ خاصے

سرد ہوا ہے تو جلد یا بدیر اسے سزا ضرور ملے گی۔“ پھر میں نے کہا۔ ”روپا اور موتی! آج رات ہمیں ڈاکا ڈالنے جانا ہے اس لئے تیار رہنا۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس وقت تک تمام لوگ آرام کر لیں، صرف چار آدمی پہرا دیں گے۔“

☆=====☆=====☆

روٹی صاف کرنے والے کارخانے کا بڑا گیٹ بند ہونے والا تھا۔ اسی وقت روٹی سے بھری ہوئی ایک بیل گاڑی اندر گھس آئی۔ روٹی کے ڈھیر پر میرے ساتھ روپا بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ہی اونچے چوڑے پر کارخانے کا مارواڑی سیٹھ ٹانگیں پھیلائے اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سانس لینے کے سبب اس کی موتی اور پھولی ہوئی توند پھول پچک رہی تھی۔ سیٹھ کا منہ روپے گن گن کے کپڑے کی تھیلیوں میں بھر کر لکڑی کی ایک میز پر رکھ رہا تھا۔ بیل گاڑی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر سیٹھ اور منہ دوڑی ہوئی نے سر اٹھائے۔ سیٹھ نے بیل گاڑی والے کو گالیاں بکنا شروع کر دیں کیوں کہ کارخانے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ بیل گاڑی جیسے ہی چوڑے سے قریب ہوئی میں رانٹل تھامے ہوئے کودا اور رانٹل کی نالی سیٹھ کی طرف کر دی۔ سیٹھ کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ روپا گاڑی سے کود کر سیٹھ کی گردی پر بیٹھ گیا۔

”کیوں سیٹھ، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“ روپا نے سیٹھ کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ سیٹھ کی نظرس جھک گئیں تو روپا نے منہ سے کہا۔ ”منہ جی! تمہارا حساب کیا کرتا ہے، تجوری میں کتنی رقم ہے؟“ یہ کہتے ہوئے روپا کی رانٹل کا رخ منہ کی طرف ہوا۔

منہ جی کے کان پر رکھا ہوا قلم گر گیا۔ مونے ٹیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں خوف کی شدت سے بند ہونے لگیں۔ چند لمحے تک منہ نے باری باری روپا اور میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ سیٹھ کے پیٹ پر دھوتی ڈھیلی ہو گئی۔ سیٹھ اور منہ نے ایک دوسرے کو کھنکھیں سے دیکھا۔

”میں ذرا پیشاب کر کے آتا ہوں۔“ منہ نے ڈری ڈری آواز میں کہا اور اٹھنے لگا۔

ابھی وہ پوری طرح کھڑا نہیں ہو سکا تھا کہ روپا کی رانٹل کی نال اس کے پیٹ سے ٹکرائی اور وہ دم سے دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”منہ جی! سیٹھ تمہیں حساب کتاب رکھنے کی تنخواہ دیتا ہے پولیس کو اطلاع دینے کی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔“ روپا نے سختی سے کہا، پھر رانٹل کی نال اس کے پیٹ پر مارنے ہوئے بولا۔ ”بے وقوف! ہمیں دیکھ کر تیرا پیشاب خطا ہونے لگا۔“

اسی وقت میرے آٹھ دس آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں موتی بھی تھا۔ میں گرجا۔ ”سیٹھ! اگر تجھے اپنی زندگی عزیز ہے تو جتنی رقم موجود ہے وہ ہمارے حوالے کر دے ورنہ تجھے جہنم میں پہنچا کر میں تیرے کارخانے کو بھی آگ لگا دوں گا۔“

مارواڑی سیٹھ نے روٹی صورت بنا کر اپنے منہ کو دیکھا۔ منہ نے میز کی دراز کھولی اور کانپتے اٹھوں سے روپوں کی تھیلیاں روپا کے سامنے رکھ دیں۔ یہ سات تھیلیاں تھیں۔

دن سے وہ تیواڑی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”لگتا ہے اس کتے کے دن پورے ہو گئے ہیں۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”اپنے بھائی میا رام کی طرح اس کی موت بھی اسے پکار رہی ہے۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔“

”نہیں تایا، وہ تمہارے ہاتھوں ہلاک نہیں ہو گا۔“ روپا نے اپنی رانٹل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ حساب میں صاف کروں گا۔ میں سب انتظام کر کے آیا ہوں۔ میں نے تیواڑی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس کی باتوں میں آجانے کی اداکاری کر کے چار دن کے بعد اسے اکیلا اپنے گھر بلائے۔ پھر میں اسے دیکھ لوں گا۔“

”نہیں روپا، تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ ممکن ہے، تیواڑی اداکاری کرتے کرتے واقعی بدل جائے اور تمہیں پھنسا دے۔“ میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

”تایا! آپ مجھے ہر معاملے میں نہ روکا کریں۔“ روپا نے کہا۔ اس کی آواز میں جوش تھا۔ ”میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا تاکہ آئندہ کسی میں یہ ہمت نہ پیدا ہو کہ بلونت سنگھ کے آدمیوں کو ورغلا سکے۔“ روپا کی آواز میں سختی آ گئی۔

میں خاموش ہو گیا اور میری یہ خاموشی گویا اجازت کے مترادف تھی۔

”تایا! ایک بات اور سنی ہے۔“ روپا نے موتی کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا۔ موتی چونک اٹھا۔ میں نے حقے کی لئے رکھتے ہوئے روپا اور موتی کی جانب باری باری دیکھا۔ روپا مزید کچھ کہتے ہوئے تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔ ”اپنے ایک ساتھی کے بارے میں عورتوں کو جھپڑنے کی شکایت آئی ہے۔“

”ہمارے ساتھی، عورتوں کو جھپڑتے ہیں۔“ میں نے سختی سے کہا۔ ”تمہیں یہ کس نے بتایا؟“

”شیو پوری کے کھیا نے بتایا ہے۔“ روپا نے نظرس نیچی کر کے جواب دیا۔ ”ہمارے ایک ساتھی نے ایک غریب کسان کی حسین و نوجوان بیوی کی عصمت دن دیمارے لوٹ لی ہے۔“

”روپا!“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”بول! ٹھاکر بلونت سنگھ کے نام کو کس نے داغ لگایا؟ جلدی اس کا نام بتا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے قریب رکھی رانٹل اٹھالی۔

میرے تمام ہی ساتھیوں کو معلوم تھا کہ میں ایسا جرم کبھی معاف نہیں کرتا۔ ان کے چہروں سے اسی لئے خوف جھلکنے لگا۔

”تایا! کھیا کو نام کا ہتا نہیں، مگر اس عورت نے یقین سے کہا ہے کہ عزت لوٹنے والا بلونت سنگھ کا ساتھی تھا۔ سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی ہے اس لئے وہ عورت گاؤں چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔“ روپا نے بتایا۔

”شیو پوری کے کھیا نے نام نہیں بتایا، اس میں ضرور اس کی کوئی چال ہے۔“ موتی بولا۔ ”کسی اور نے اس عورت کی عزت لوٹی ہوگی۔ کھیا، بلونت سنگھ کے ساتھی کا نام لے کر یقیناً ہمارے درمیان پھوٹ ڈلوانا چاہتا ہے۔“

”موتی! ہو سکتا ہے، تمہارا کہنا ٹھیک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پھر بھی اگر یہ جرم ہمارے کسی آدمی سے

”ان تھیلیوں میں کتنے روپے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔
”چار ہزار چھ سو اٹھ روپے۔“ منشی نے بمشکل جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ نو آنے اور سات پائی۔“

”تجھ سے آنے پائی کا حساب کون پوچھ رہا ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اگر میں یہاں سے دس ہزار روپے سے کم رقم لے کر گیا تو اس سے تمہارے سیٹھ کی بے عزتی ہوگی۔ بتاؤ اور روپے کہاں ہیں؟“ میں نے رانقل کی نال اب سیٹھ کی طرف کردی۔ ”تو بول سیٹھ!“

”جناب! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اتنے ہی ہیں اس سے زیادہ ایک پائی نہیں۔“ مارواڑی سیٹھ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

”معلوم ہوتا ہے، تجھے چڑی سے زیادہ دمڑی پیاری ہے۔“ میں تیز آواز میں بولا، پھر سوال کیا۔ ”یہاں اور کتنے گلے ہیں؟“

”یہاں تو اور کوئی نہیں البتہ دکان میں پچاس ساٹھ سے زیادہ گلے نہیں ہوں گے۔“ سیٹھ نے خوفزدہ آواز میں جواب دیا۔

”اس دکان کے پیچھے ایک تہ خانے ہے اور اس تہ خانے میں ایک تجوری ہے اس تجوری میں کتنے روپے ہیں؟“ میں نے چھپتے ہوئے لمبے میں دریافت کیا۔ سیٹھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا جو میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ میں نے سیٹھ کے بارے میں تمام اطلاعات معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ سیٹھ کو دھمکانے کی خاطر میں نے موتی کو مخاطب کیا۔ ”جاؤ، یہاں جتنی روٹی ہے سب کو آگ لگا دو۔ سیٹھ کو شاید ہولی دیکھنے کی آرزو ہے۔“

میرا حکم سنتے ہی موتی آگے بڑھا۔ اسی وقت سیٹھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی ڈھالی دھوٹی کو سنبھالا اور گڑگڑایا۔ ”نہیں نہیں حضور اسے روکیں۔ مم..... میں جتنی رقم ہے سب دے رہا ہوں، مگر..... مگر میری پشت در پشت کا دھندا تو خراب نہ کریں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ر پڑا، پھر دھوٹی کمر پر کس کر باندھتا ہوا چوتھے سے نیچے اتر آیا۔

”میں سیٹھ کے ساتھ جا رہا ہوں۔“ میں نے اپنی رانقل روپا کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر سیٹھ چلاؤ دھمکانے گا تو میں اسے ختم کر دوں گا۔ منشی اگر چالاکی کرے تو تم کارخانے کو آگ لگا دینا۔“ پھر میں روپا کے مزید قریب ہو گیا اور سرگوشی کی۔ ”رقم لے کر میں سیدھا دریا پار کر کے آ رہا ہوں تم لوگ یہاں سے فرما ہو جانا۔“

”نمایا! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ایک کی بجائے دو ہوں تو خطرہ کم رہتا ہے۔“ روپا۔
”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”مارواڑی سیٹھ اب رقم دے دے گا۔ تمہارا ضرورت نہیں۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جاؤ اور جو رقم یہاں سے ہاتھ لگی ہے اسے بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ میری فکر نہ کرنا پتول میرے پاس ہے۔“

دو گھوڑوں کی کبھی میں بیٹھ کر میں، مارواڑی سیٹھ کے ساتھ اس کی دکان پر پہنچا۔ وہ چراغ جلائے کا وقت تھا۔ بازار میں سناٹا تھا۔ سیٹھ نے کانپتے ہاتھوں سے دکان کا تالا کھولا اور میں اس کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

کبھی سے اترتے وقت میں نے کبھی چلانے والے سیٹھ کے ملازم کو دھمکی دی تھی کہ وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلا تو اس کے سیٹھ کو گولی مار دی جائے گی۔ کبھی خود سیٹھ کی تھی۔

دکان میں گھستے ہی میں نے اندر سے کنڈی لگا دی اور پستول نکال کر سیٹھ پر تان لیا، پھر اسے مخاطب کیا۔ ”ہزاری مل! اگر تو نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تیری پھولی ہوئی توند کو گولی مار کر پچکا دوں گا۔“

”بھائی صاحب! پستول دور رکھو۔ جو چاہو لے جاؤ مگر..... مگر میری جان بخش دو۔“ سیٹھ خوفزدہ آواز میں بولا۔

”تو پھر جلدی کرو، وقت ضائع نہ کرو۔“ میں نے اس کی توند پر پستول کی نال رکھ کر دھکا دیا۔ ہزاری مل نے دکان کے دوسرے حصے میں جانے کے لئے قدم بڑھائے تو میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”ادھر کہاں جا رہے ہو، اب بھی تم چالاکی سے باز نہیں آ رہے۔ چلو یہ گدی اٹھاؤ۔ تمہ خانے کا راستہ گدی کے نیچے ہے۔“ مجھے اپنے تجربوں کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان پر پورا یقین تھا۔ سیٹھ نے چرے پر شرمندگی نظر آنے لگی۔

”پستول دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔“ سیٹھ نے اپنی صفائی پیش کی۔

گدی ہٹانے کے بعد نائل بٹایا گیا۔ تہ خانے میں اندر تھا۔ دکان کے ایک کونے میں مجھے لالین نظر آگئی۔ سیٹھ کو میں نے لالین جلائے کا حکم دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا۔ لالین جلنے کے بعد میں اسے اٹھائے تہ خانے کے راتے تک آیا، پھر لالین رکھ کر اندر جھانکا۔ نیچے اترنے کے لئے کنڈی کی ایک میٹھی موجود تھی۔

”ہزاری مل! پہلے تم تہ خانے میں اترو۔“ میں نے سیٹھ کو حکم دیا۔

سیٹھ اتر گیا تو میں تیزی سے نیچے پہنچ گیا۔ لالین میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی میں، میں نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں تجوری موجود تھی۔ لالین چھت سے لٹکا کر میں نے سیٹھ سے تجوری کی چابیاں طلب کیں۔ اس نے چابیاں دے دیں۔ تجوری کھولتے ہی مجھے روپوں سے بھری بے شمار تھیلیاں نظر آئیں۔ وہ رقم میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے اور سیٹھ کے درمیان دس بارہ قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ میٹھی کے قریب کھڑا تھا۔ میں تو تجوری سے تھیلیاں نکالنے میں مصروف تھا اور ادھر سیٹھ ہزاری مل میری موت کا سامان کر رہا تھا۔ اس کی خبر مجھے تب لگی کہ جب وقت گزر چکا تھا۔

اچانک اپنے عقب میں مجھے کھٹکا سانسائی دیا تو تیزی کے ساتھ پلٹا اور جیسے میرے حواس گم ہو گئے۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ جانے کب کی کب میں بد معاش سیٹھ میٹھی کے ذریعے اوپر چڑھ

احتیاط کے ساتھ بوریاں وہاں سے اٹھانا شروع کر دیں۔ میں اب ان بوریوں کو تہ خانے کے وسط میں اس جگہ رکھ رہا تھا جہاں پانچ فٹ اوپر تہ خانے سے نکلنے کا راستہ تھا۔ جلد ہی میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے تجوری سے نکالی ہوئی روپوں کی تھیلیاں چادر میں باندھیں اور بوریوں پر چڑھ گیا۔

تہ خانے کے راستے پر رکھا ہوا ٹائل خاصا بھاری تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر آخر کار اسے جگہ سے ہٹا ہی دیا۔ اس کے بعد مجھے تہ خانے سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب مجھے اس دکان سے نکلتا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ تہ خانے کے راستے پر میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ ٹائل رکھ دیا تھا۔

دکان کی چھت پر سینٹ کی چادر پڑی تھی اور چھت تک پہنچنا بھی زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں نے اس کے لئے وہ میڑھی استعمال کی جو مارواڑی سینٹھ نے تہ خانے سے باہر کھینچ لی تھی۔ دکان ہی میں مجھے ایک تھوڑی پڑی نظر آگئی۔ میں وہی تھوڑی لئے میڑھی پر چڑھ گیا۔ سینٹ کی شیٹ توڑ کر اتنا غلاتا لینا مشکل نہ ہوا کہ میں جس سے گزر کر دکان کی چھت پر پہنچ سکوں۔

چھت پر چڑھ کر میں دکان کی عقبی ست پتلی سی ایک گلی میں کود گیا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں اس گلی میں دبے قدموں آگے بڑھا اور پھر گلی کے اختتام پر ٹھک کر رک گیا۔ میں نے خطرے کی بوسوگھ لی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے باوردی پولیس والے نظر آ گئے۔ ان بھی کے ہاتھوں میں مجھے رانٹیں نظر آرہی تھیں۔ ان کی تعداد دو درجن سے بھی زیادہ تھی۔ گاؤں میں جتنی پولیس کو نفری تھی، تھانے کا انچارج شاید بھی کو ساتھ لے آیا تھا۔ غالباً اسے یہ خطرہ لاحق رہا ہو گا کہ کہیں میرے ساتھی مجھے چھڑانے نہ آجائیں۔ ان سے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہے پولیس کی زیادہ نفری کی ضرورت تھی۔

تمام سپاہیوں کو میں نے دکان کے دروازے پر جمع ہوتے دیکھا۔ ان کی رانٹوں کا رخ دکان کی طرف تھا۔ میں اب گلی سے نکل کر آڑ لیتا ہوا کچھ آگے آ گیا تھا، لیکن ابھی میرا وہاں سے فرار ہونا خطرناک تھا۔ آڑ سے نکلنے کی صورت میں کسی بھی سپاہی کی نظر مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ نتیجے کے طور پر میں ایک بیل گاڑی کی آڑ میں چھپا رہا۔ بیل گاڑی میں شاید اناج بھرا ہوا تھا، مگر بیل وہاں نہیں تھے۔ میں ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ سینٹھ کی دکان کا دروازہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے اور دکان کے دروازے کے درمیان چند ہی قدم کا فاصلہ ہو گا۔ میں بے حس و حرکت اسی جگہ کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

”سینٹھ! دکان کا تالا کھولو۔“ پولیس افسر نے سینٹھ ہزاری ل ل کو مخاطب کیا۔

”جج..... جی صاحب!“ سینٹھ ہکھلایا اور کانپتے قدموں سے آگے بڑھا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں سینٹھ! ہم تمہارے ساتھ موجود ہیں۔“ پولیس افسر نے سینٹھ کی ہمت

بندھائی۔

مارواڑی سینٹھ نے آخر تالا کھول ہی دیا دکان کے اندر لالین کی روشنی تھی۔ مارواڑی سینٹھ اتنا سرا سیدہ اور بوکھلایا ہوا تھا کہ اس اجتنی نے غور ہی نہیں کیا کہ جو لالین تہ خانے میں تھی، اوپر دکان میں

گیا تھا اور اب میڑھی بھی اس نے اوپر کھینچ لی تھی۔ اسی کے کھٹکے سے میں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ جست بھر کر میں تہ خانے کے راستے کے نیچے پہنچا مگر مجھے دیر ہو چیک تھی اس وقت تک مارواڑی سینٹھ تہ خانے کے راستے پر بھاری ٹائل رکھ چکا تھا۔ دانت پیس کر میں سینٹھ کو گالیاں بکتے لگا۔ میں اس طرح کبھی بے بس نہیں ہوا تھا۔ سینٹھ نے دکان کا دروازہ کھول کر پھر غالباً باہر سے بند کیا تو یہ آوازیں بھی میں نے سنیں۔

زندگی میں پہلی بار میں گھبرا گیا۔ تہ خانے کی چھت میرے سر سے پانچ فٹ بلند تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر میں نے تہ خانے کی دیواروں پر ٹھوکریں مار کر ان کی مضبوطی کو آزمایا۔ باہر نکلنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مارواڑی سینٹھ نے مجھے کسی چوہے کی طرح چوہے دان میں بند کر دیا تھا۔ یقیناً وہ پولیس کو اطلاع دینے گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں پولیس آ کر دکان کو گھیر لے گی۔ کیا پولیس مجھے اس بے بسی کے عالم میں گرفتار کر لے گی؟ کیا میرے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا؟ ابھی تو نیتا رام بھی زندہ ہے۔ اس سے انتقام لینا باقی ہے۔ اگر روپا اس وقت میری مدد کے لئے آجائے تو..... میرے دل میں امید کی کرن پیدا ہوئی، مگر میرا خیال خام تھا۔ روپا سے تو میں خود کہہ کر آیا تھا کہ وہ چلا جائے، میں ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔

اس تہ خانے میں کوئی ذی روح بھی نہیں تھا کہ میں، بلونت کے جسم سے نکل کر کسی اور جسم میں داخل ہو جاؤں۔ پولیس یقیناً اسی وقت تہ خانے میں اترتی جب اسے میری موت کا یقین ہو جاتا۔ وہ اوپر ہی سے مجھ پر جسم کے دہانے کھول دیتے۔

میرا دل بیٹھنے لگا اور میں نے سوچا، اے علیالیش! اے جن زاد! کیا اسی آدم زاد کے جسم میں تیری موت لکھی تھی؟

☆=====☆=====☆

چند لمبے مجھ پر حزن و ملال کی کیفیت طاری رہی۔ تہ خانے کا جائزہ لیتے ہوئے جیسے ہی میری نگاہ تجوری پر پڑی تھی، میں اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ پھر میں نے وہاں موجود کسی بھی شے کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں وہاں جس غرض سے آیا تھا، وہ پوری ہو چکی تھی تو پھر کسی اور طرف کیوں دیکھتا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ مجھے اب دولت کے حصول سے زیادہ اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔

”مجھے ہر قیمت پر اس تہ خانے سے نکلنا ہے۔“ میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ”میں کوئی آدم زاد نہیں کہ جی ہار بیٹھوں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر۔ اداسی کی دھند جیسے چھٹ گئی۔ میری نگاہ تیزی سے تہ خانے میں گھوم گئی۔ اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس تہ خانے سے فرار کی راہ نظر آ گئی تھی۔ تہ خانے کی ایک دیوار کے ساتھ مجھے تلے اوپر بوریاں رکھی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ بوریاں تہ خانے کی چھت تک جتنی ہوئی تھیں۔ میں لپک کر ان بھری ہوئی بوریوں تک جا پہنچا۔ بوریوں میں گیسوں بھرے ہوئے تھے۔ میں نے

کس طرح پہنچ گئی؟ تمہ خانے سے میں نے ہی لائین باہر نکالی تھی کہ دکان کا جائزہ لے کر وہاں سے فرار ہونے کی کوئی تدبیر سکوں۔

پولیس افسر سمیت تمام سپاہیوں کو میں نے دکان کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ فرار ہونے کے لئے مجھے بہر حال دکان کے سامنے سے گزرننا پڑتا۔ سو میں نے فی الحال یہ خطرہ مول نہیں لیا۔ ہاں تھوڑا سا آگے اور کھسک آیا۔ اب دکان کے اندر ہونے والی سرگرمی بھی میرے احاطہ نظر میں تھی۔

میں نے سیٹھ کو تمہ خانے کے راستے پر رکھے ہوئے ٹائل کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔
”ادھر کیا ہے؟“ پولیس افسر نے سوال کیا۔

”یہ..... یہی تہ..... تمہ خانے کا راستہ ہے۔“ سیٹھ نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔
چار بھری ہوئی رانٹلوں کے ساتھ جن کی ٹائیں تمہ خانے کے راستے پر جھکی ہوئی تھیں، پولیس والوں نے ٹائل کو اس کی جگہ سے ہٹایا۔

”بیچھے ہٹ جاؤ۔“ پولیس افسر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”وہ اندر سے گولی بھی چلا سکتا ہے۔“

”جج..... جی ہاں صاحب.....! وہ..... اس کے پاس ریوالور ہے۔“ مارواڑی سیٹھ نے تصدیق کی۔

سپاہی بیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سبھی کے چروں پر مجھے تناؤ نظر آ رہا تھا۔
معاذ مجھے پولیس افسر کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ اپنی دانست میں گویا مجھ سے ہمکلام تھا۔ ”ٹھاکر بلونت

سنگھ! تم گھر چکے ہو اس لئے ہتھیار پھینک دو۔“
ظاہر ہے اس کی آواز کا جواب کون دیتا۔ میں تو تمہ خانے میں تھا نہیں۔

”ہم دکان کو آگ لگا رہے ہیں۔“ پولیس افسر کی آواز پھر گونجی۔ ”بلونت سنگھ! تم اس طرح زندہ جل جاؤ گے ورنہ تمہ خانے سے باہر آ جاؤ۔“

”نن..... نہیں صاحب! ایسا نہ کرنا..... مم..... میری دکان میں آگ نہ لگائیں۔“
مارواڑی سیٹھ جلدی سے بولا۔ ”میری ساری رقم اس طرح بھسم ہو جائے گی۔“

جواب میں پولیس افسر نے سیٹھ کو گھور کر دیکھا، پھر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سیٹھ ہزاری مل غالباً سمجھ گیا کہ پولیس افسر نے محض دھمکی دی تھی۔ اس کا ارادہ واقعی دکان کو آگ لگانے کا نہیں تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ تمہ خانے میں اتر سکے۔ انہیں غالباً یقین تھا کہ ان میں سے جس نے بھی پیل کی اس کی زندگی ختم ہو جائے لازمی ہے۔ میری نظر پولیس افسر کے چہرے پر تھی۔ اس کے چہرے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گرفتار کرنا کوئی آسان کام نہیں اور یہ کہ میں اس کی دھمکی میں آ کر تمہ خانے سے نہیں نکلوں گا۔

پولیس افسر نے آخر کار اس مسئلے کا ایک حل سوچ ہی لیا۔ مجھے اس کی دھیمی آواز سنائی دی۔ اس

نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”تم لوگ بہ یک وقت چاروں رانٹلیں تمہ خانے میں ڈال کر ٹریگر دبا دو۔“ یہ حکم اس نے قریب کھڑے چار مسلح سپاہیوں کو دیا تھا۔

حکم کی تعمیل میں سپاہیوں نے دیر نہیں کی۔ چاروں رانٹلیں ایک ساتھ گرج اٹھیں۔ رانٹلوں کے دھماکوں سے دکان کی دیواریں جیسے ہل گئیں لیکن تمہ خانے کے اندر بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسی وقت کسی سپاہی کی نظر دکان کی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ دھماکوں کی وجہ سے سینٹ کی چادر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر اس کے اوپر گرا تھا۔ پولیس افسر نے بھی سپاہی کی نظروں کا تعاقب کیا اور تقریباً اچھل پڑا۔ چھت میں اسے سوراخ نظر آ گیا تھا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ یقیناً فرار ہو چکا ہے۔ وہ تمہ خانے میں نہیں ہو سکتا۔“ پولیس افسر بولا۔
”مم..... مگر کس..... کس طرح صاحب؟ میں..... میں تو اسے تمہ خانے..... پھر چھت..... دکان کی چھت کس نے توڑی.....؟ اور..... اور یہ لائین..... یہ بھی تو.....“

”چپ رہو!“ پولیس افسر نے اسے ڈانٹ دیا۔ اسے غالباً میرے فرار کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ اسی لئے بے دھڑک آگے بڑھا اور تمہ خانے کے راستے کے قریب بیٹھ کر اندر مارچ کی روشنی ڈالی۔ ظاہر ہے اسے وہاں بوریاں رکھی نظر آ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”بلونت سنگھ نے انہی بوریوں پر چڑھ کر تمہ خانے کا بھاری ٹائل اٹھایا ہو گا اور پھر پولیس کی توجہ اسی طرف رکھنے کے لئے تمہ خانے سے نکل کر دوبارہ ٹائل پیس رکھ دیا ہو گا۔“

پولیس افسر نے غلط نہیں کہا۔ میں نے پولیس کو الجھانے کے لئے ہی ایسا کیا تھا۔ سارا معاملہ ہو چکا تھا اس لئے پولیس کو وہاں سے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اپنی حفاظت کی خاطر مارواڑی سیٹھ نے پولیس افسر سے درخواست کر کے دو مسلح سپاہیوں کو روک لیا تھا۔ دکان بند کر کے وہ بھی سپاہیوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے بہر حال اس عیار سیٹھ سے انتقام لینا تھا جس نے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ غاروں کا رخ کرنے کے بجائے میں ایک بار پھر اس غرض سے سیٹھ کے کارخانے کی طرف چل دیا۔ روٹی بہت جلدی آگ پکڑتی ہے اس لئے مجھے کارخانے کو آگ لگانے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔

سارا گاؤں برب سیٹھ کا جتنا ہوا کارخانہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا تھا تو میں تیزی کے ساتھ غاروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں جب غاروں میں پہنچا تو اپنے سبھی ساتھیوں کو مضطرب دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی روپا کہنے لگا۔ ”ہم تو ڈر رہے تھے تاہم کہ آپ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“ روپا اس وقت نوٹ مگن رہا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو سیٹھ کے کارخانے سے لوٹی گئی تھی۔

”لو یہ بھی گنو!“ میں نے تجوری سے نکالی جانے والی تھیلیاں بھی چادر کھول کر سامنے رکھ دیں۔ انہی کے ساتھ سونے چاندی کے زیورات بھی تھے۔

ڈاکے میں ہاتھ آنے والا مال دیکھ کر سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کسی ڈاکے میں ایسا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔

”تایا! مارواڑی سیٹھ تو ہمارے اندازے سے زیادہ مالدار نکلا۔“ روپا بولا۔

”اتنا بہت سارا مال سمیٹ کر لانے میں دیر تو ہونا ہی تھی روپا! تم خواہ مخواہ فکر کر رہے تھے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کو وہ بزدل مارواڑی بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔“ موتی نے کہا۔

”ایسی بات نہیں موتی!“ میں بول اٹھا۔ ”معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ میں بمشکل جا رہا تھا کہ وہاں سے نکلا ہوں۔ وہ مارواڑی سیٹھ پکا حرامی نکلا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ وہ مجھے دکان کے تر خانے میں بند کر کے پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا تھا؟“

”کیا؟“ کئی حیرت زدہ آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

جو کچھ مجھ پر گزری تھی، میں نے بیان کر دی اور آخر میں بتایا۔ ”وہ تو اچھا ہوا کہ تمہ خانے میں گندم کی بوریاں موجود تھیں۔ انہی بوریوں کی مدد سے میں چھت تک پہنچ سکا ورنہ مال تو مال تم لوگوں میری لاش تک نہ مل پاتی۔“ میرے ان الفاظ کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔

”اگر تایا کو کچھ ہو جاتا تو.....“ روپا کی بیزباہٹ نے اس سناٹے کو توڑ دیا۔ ”میں اس مارواڑی سیٹھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس کہنے کی یہ ہمت۔“

”اس سے میں نے بھی انتقام لے لیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں اس کے کارخانے کو آگ آیا ہوں۔“ میں نے کہا، پھر روپا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم سچ کہتے تھے روپا! مجھ پر دو بڑی آفتیں ہیں۔ ان میں سے ایک آفت آج آکر گزر گئی۔“

”سب ٹھیک ہے، مگر میں اب آپ کو ایسے کسی کام کے لئے اکیلے نہیں جانے دوں گا۔“ یہ کہہ کر روپا کی آواز بھرا گئی۔

”تم علم جیوتش پر یقین رکھنے کے باوجود ایسی باتیں کرتے ہو۔“ میں ہنس دیا۔ ”جو قسمت میں آ رہا ہے، وہ ضرور ہو گا، چاہے ہم ایک ساتھ ہوں یا الگ۔“ پھر میں بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب بھوانی دیوی کی نظر سیدھی ہونے کی وجہ سے ہوا ہے کہ میری جان بچ گئی۔ ہم صبح درشن کے لئے جا رہے تھے۔“

”اور کل رات تلسی رام کے بھتیجے جیٹھارام کو بھی ٹھکانے لگانا ہے تایا!“ روپا کے لہجے میں شدت تھی۔ ”وہ ہماری اطلاع حاصل کرنے تیواڑی کے گھر آئے گا۔“

اس گفتگو کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں، چنبل کے الجھا دینے والے غاروں کی گہرائی میں گیا۔

☆=====☆

روپا ضد کر کے اکیلا چلا تو گیا تھا، لیکن میں اس کی طرف سے فکر مند تھا۔ مجھے علم تھا کہ کوئی خبر دولت کی خاطر دہرا کھیل بھی سکتا ہے۔ تیواڑی ہمارا خبر تھا۔ جیٹھارام نے اسے دولت کا لالچ دیا تو

یہ بھی اطلاع مل گئی تھی کہ جیٹھارام نے انگریز کیپٹن شرمن سے کیا بات کی ہے۔ اب پولیس کے ٹکے میں بھی میرے خبر موجود تھے۔

جیٹھارام نے کیپٹن شرمن سے کہا تھا، آپ نے ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے چنبل کے غاروں میں تین پٹنیں اتاری ہیں، مگر میں ایسی اطلاع لاؤں گا کہ آپ اپنے ہمراہ صرف سو پچاس پولیس والے لے کر ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کر لیں گے، پھر دیکھیں گا، ٹھاکر بلونت سنگھ کے ساتھ ہی اس کا پورا گروہ ختم ہوتا ہے یا نہیں۔ صاحب، جو کام آپ کی دھمکی سے نہیں ہو سکتے، وہ میرے روپے کی طاقت سے ہو جاتے ہیں۔

”آپریشن ٹھاکر بلونت سنگھ“ کا انچارج انگریز کیپٹن شرمن ہی تھا۔ اطلاع کے مطابق آج رات جیٹھارام، تیواڑی سے ملنے کے لئے آنے والا تھا۔ روپا کو گئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا سردار، کہاں جا رہے ہیں؟“ موتی پوچھ بیٹھا۔

میں کسی پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ روپا کی طرف سے فکر و تشویش میں مبتلا ہوں اسی لئے موتی کو جواب دیا۔ ”میں ذرا پولیس کی خیر خبر لینے جا رہا ہوں کہ اس نے ہم سے کتنی دور پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ میں جلد ہی روپا کی واپسی سے پہلے لوٹ آؤں گا۔“

”اگر سردار کا حکم ہو تو میں اس کام کے لئے چلا جاؤں؟ ہمارے ہوتے آپ کو.....“

”نہیں!“ میں نے موتی کی بات کاٹ دی۔ ”میں خود جاؤں گا۔“

میرا لہجہ فیصلہ کن تھا اس لئے موتی پھر کچھ نہیں بولا۔

اس کے بعد میں، چنبل کے کٹاؤ دار خوفناک غاروں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اندھیرے میں وہ غار اور بھی خوفناک نظر آنے لگتے تھے، اتنے بھیانک اور ہیبت ناک کہ کمزور دل کا کوئی آدمی اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ غاروں کے ارد گرد رہنے والے بھی اندھیرا ہونے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ مجھے ان غاروں کے بھیانک پن کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں کوئی آدم زاد تو تھا نہیں کہ ڈر جاتا۔ میرے ساتھی بھی اب یہاں رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ غار اس قدر تنگ در تنگ تھے کہ ان میں دن کے وقت بھی پولیس پٹنیں راستہ بھول جاتی تھیں۔ ہم لوگ اندھیرے کے باوجود ان میں اپنا راستہ ڈھونڈ لیتے تھے۔

تیواڑی کی سکونت انہی غاروں کے قریب ایک بستی میں تھی۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تیواڑی کے گھر کے قریب ہی ایک جگہ چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں مجھے روپا چھپا ہوا نظر آ گیا۔ میری آنکھیں بڑی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ روپا کی وہاں موجودگی کی ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی جیٹھارام نہیں آیا۔ بڑے سے ایک پتھر کی آڑ لے کر میں بھی تیواڑی کے گھر کے قریب جا بیٹھا۔ روپا کی نسبت میں، تیواڑی کے گھر سے زیادہ قریب تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ضرورت ہوگی تو مداخلت کروں گا ورنہ نہیں۔ اس طرح میری غیر ضروری مداخلت سے روپا کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تیواڑی اکیلا ہی رہتا ہے۔ میں

جاتے دیکھا۔

توقع کے مطابق تین مرتبہ ہلکی دستک سنائی دی، پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

”اب تو اچھی طرح دیکھ بھال کر آئے ہو تیواڑی!“ جیٹھا رام کی آواز دور سے آئی۔

”جیٹھا رام! میں‘ تیواڑی نہیں تیری موت ہوں۔“ میں نے روپا کی غراہٹ سنی۔

تیواڑی کو میں نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے گھر کے دروازے کی طرف آتے دیکھا تو سٹ کر بیٹھ گیا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کندھی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے دروازہ کھلا ہی

رہنے دیا تھا۔ مجھے اسی لئے گھر کے اندر بیرونی کمرے کا منظر واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ جیٹھا رام کے

منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ روپا نے اس کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا تھا۔

”اس کے ہاتھ سے روپوں کی تھیلی لے لو تیواڑی!“ روپا نے تیواڑی کو مخاطب کیا۔

تیواڑی نے تھیلی حکم میں دیر نہیں کی۔ پھر روپا نے ایک ہاتھ سے جیٹھا رام کا گریبان پکڑا اور

دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن میں پڑی ہوئی سونے کی بھاری زنجیر کھینچ لی۔

”لے تیواڑی! یہ بھی رکھ لے۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے، وہ بھی اتار لے۔“

روپا کے اس حکم پر بھی عمل کرنے میں تیواڑی نے جلد بازی سے کام لیا۔ جیٹھا رام کے چہرے سے

خوف و دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ چکا تھا کہ داؤ الٹا ہو گیا ہے۔

”چلو! تمہیں ٹھاکر بلونت سنگھ کا پتا چاہئے، میں بتاتا ہوں۔“ روپا نے کہہ کر جیٹھا رام کو دروازے کی

طرف گھینے لگا۔ جیٹھا رام دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا معافی مانگنے لگا، مگر روپا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس

نے تیواڑی کو مخاطب کیا۔ ”تیواڑی! تمہاری وفاداری کا انعام تمہیں مل گیا ہے، اب میں اسے لے جا رہا

ہوں۔“

جیٹھا رام کو روپا گھینتا ہوا مکان سے باہر نکال لایا۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس اندھیرے میں

روپا کا رخ چنبل کے کٹاؤ دار غاروں کی طرف تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ ان دونوں کا تعاقب کرتا رہا۔

روپا اب جیٹھا رام کو ساتھ لے چنبل کے کٹاؤ میں داخل ہو چکا تھا۔ جیٹھا رام خوف کے سبب شاید بار بار

رک جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یقیناً موت ناچ رہی ہو گی۔ روپا اسے راکھ کی ٹال سے دھکا دے کر

آگے بڑھنے پر مجبور کرتا تھا اسی کے ساتھ روپا، تسلی رام کی سات پشتوں کو بھی گالیاں بکتا جاتا تھا۔

ایک بار چلتے چلتے اچانک جیٹھا رام کے پاؤں لڑکھرائے اور وہ روپا کے قدموں پر گر گیا۔ اس نے روپا

کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا، مگر روپا نہیں پگھلا۔ اس کے برعکس میں نے اس کا وحشیانہ قہقہہ سنا جس سے

غار گونج اٹھے۔

”سن جیٹھا رام! تیری موت کی گھڑیاں ہمارے غاروں میں قہقہے لگا رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر روپا نے

پہلے جیٹھا رام کے منہ پر براہ کپڑا کھولا، پھر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بھی نکال کر پھینک دیا۔ ظاہر ہے کہ اب

اسے جیٹھا رام کے چیخنے چلانے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

گھر کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ معاً میں نے ایک سائے کو اس طرف بڑھنے دیکھا، مگر یہ روپا ہرگز نہیں تھا۔

”وہ سایہ! ادھر ادھر چوکنا انداز میں دیکھتا ہوا گھر کے دروازے پر آکر رک گیا۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے زنجیر ہلائی۔

”کھول رہا ہوں۔“ گھر کے اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ میں پہچان گیا۔ یہ آواز میرے بچر تیواڑی ہی کی تھی۔

پھر چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا تیواڑی ہی تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں

لاٹین تھی۔ مجھے تیواڑی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ جیٹھا رام گھر میں داخل ہو گیا۔ تیواڑی نے

گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

”باہر تو بڑی سردی ہے۔“ یہ آواز تیواڑی کی نہیں، آنے والے کی تھی جو یقیناً جیٹھا رام تھا۔

”پورے سوا سو روپے ہیں اس تھیلی میں، مگن لو۔“ میں نے روپوں کی جھنکار سنی۔

”جیٹھا رام! تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ تیواڑی نے پوچھا۔

”ارے نہیں، اسی لئے تو میں نے کبل اوڑھ لیا تھا۔ بھلا میں کوئی ایسا کام کس طرح کر سکتا ہوں

کہ تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔“ جیٹھا رام نے جواب دیا، پھر جلدی سے بولا۔ ”اب جلدی سے کام کی

بات کرو۔ دیکھو یہ نقد روپے..... تمہیں بھی ایسی ہی کھری اطلاع دینی ہے جیسے کھرے یہ روپے ہیں۔

کام پورا ہونے کے بعد نیتا رام سے کہہ کر تمہیں اور بخشش دلوادوں گا..... ارے تم بار بار دروازے

کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟“

”جیٹھا رام! مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کسی نے تمہیں آتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو۔ میرے سوا اس

گاؤں میں ٹھاکر بلونت سنگھ کے دوسرے بچر بھی ہو سکتے ہیں۔ میں باہر چکر لگا کر دیکھ کر آتا ہوں کہ کہیں

کوئی آس پاس چھپا ہوا ہماری گفتگو تو نہیں سن رہا۔“ پھر قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ تیواڑی یقیناً

دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ تیواڑی گھر سے نکل کر کدھر جائے گا۔ منصوبے کے مطابق

اسے روپا کو اطلاع دینا تھی کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ چند لمحوں بعد تیواڑی کی آواز پھر آئی۔ وہ یقیناً

جیٹھا رام سے مخاطب تھا۔ ”دیکھنا، میں باہر سے دروازہ بند کر کے جاؤں گا اور واپسی میں عقبی دروازے

سے آؤں گا..... اور ہاں سنو۔ میں تین مرتبہ عقبی دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دوں گا۔ یہ دستک سن

کر ہی تم دروازہ کھولنا دہ نہ نہیں۔“

”اچھا اچھا جلدی کر۔“ جیٹھا رام کی آواز سے بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”خواہ مخواہ سردی میں

خوار ہونے باہر جا رہا ہے۔“

تیواڑی گھر سے باہر آ گیا اور اس نے زنجیر لگا دی۔ میں نے اسے گھر کے قریب ہی اس چھوٹے

سے نیلے کی طرف جاتے دیکھا جس کی آڑ میں روپا چھپا ہوا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر کے بعد مجھے روپا نیلے کی آڑ

سے نکل کر تیواڑی کے گھر کی طرف دبے قدموں جاتا دکھائی دیا۔ اسے میں نے گھر کی عقبی سمت میں

”روپ نرائن!.....! مم..... مجھے معاف کر دے۔ میں اور تو دونوں برہمن ہیں۔“ جیٹھارام گڑگڑانے لگا۔

اس کی بات کے جواب میں روپا نے اس کے کھلے ہوئے منہ میں راکفل کی نال ڈال دی۔
”بے وقوف! تجھے اب یاد آیا ہے کہ میں برہمن ہوں۔ میرے بے گناہ بچا کے قتل کے وقت تو یہ بات بھول گیا تھا۔“ روپا گرجا۔

راکفل کی نال سے بچنے کے لئے جیٹھارام زمین پر چت لیٹ گیا۔ وہ بے بسی سے زمین پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔

روپا نے اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر اسے انتہائی غضب ناک آواز میں مخاطب کیا۔ ”بزدل! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تجھے مارنے کے لئے راکفل استعمال نہیں کروں گا۔ تجھ پر میں اپنا ایک قیمتی کارتوس ضائع نہیں کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے روپا نے اپنے پہلو سے خنجر کھینچ لیا۔ راکفل کو اس نے شانے پر ڈال لیا تھا۔ جیٹھارام کے سینے پر اس کا پیر تھا اور ہاتھ میں خنجر۔ جیٹھارام ساکت ہو گیا۔ موت کے سامنے آدمی کتنا رحم طلب اور لاچار بن جاتا ہے۔ روپا ایک بار پھر جیٹھارام سے مخاطب ہوا۔ ”تو جتنا چیخے گا اتنا ہی عذاب برداشت کرنا پڑے گا۔“ جملہ ختم ہوتے ہی روپا نے ایک دم جھک کر جیٹھارام پر خنجر کا وار کیا۔

روپا کے جسم میں جیسے اس وقت کسی درندے کی روح حلول کر گئی تھی۔ اس نے خنجر کی نوک سے جیٹھارام کی دونوں آنکھیں نکال لیں، پھر زبان کاٹ دی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت روپا کی آنکھوں میں لازماً اپنے بچا ہمارے کی لاش گھوم رہی ہو گی۔ غالباً اسی جنون میں وہ جیٹھارام کی کرب ناک چیخیں سن کر بھی جیسے برا ہو گیا تھا۔

جب جیٹھارام کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا تو روپا بالکل پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ میں نے اب وہاں مزید رکنا مناسب نہیں سمجھا اور غاروں کی بھول بھلیوں میں اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گیا۔ روپا سے پہلے میں وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی اس کوشش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ میرے بچنے کے کچھ ہی دیر بعد روپا، جیٹھارام کی لاش اٹھائے ہوئے آگیا۔ اس کی حالت قابل دید تھی۔ بھیا نک چرے اور خون میں لتھڑے ہوئے لباس میں روپا انتہائی خوفناک نظر آ رہا تھا۔

”بیچے تپا، تپسی رام کے کہنے کا ایک آدمی کم ہو گیا۔“ روپا نے جیٹھارام کی لاش میرے سامنے ڈال دی۔ ”اس کی بگڑی ہوئی لاش دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کریں گے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ سے دشمنی رکھنے والوں کا انجام ایسا ہوتا ہے۔“

جیٹھارام کے قتل پر میں خوش تھا، لیکن یہ بھی سوچ رہا تھا کہ روپا کو اس قتل کے سلسلے میں اس قدر وحشت و بربریت کا ثبوت نہیں دینا چاہئے تھا۔

”اچھا ہوا۔“ میں نے روپا کی پشت پر تھکی دی۔ ”چلو اب ہمیں یہاں سے فرار ہونا ہے۔ پولیس ہمیں ہر طرف سے گھیر رہی ہے۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے، یعنی کھیزا راٹھور کا راستہ۔“

”تپا! اطلاع کس نے دی؟“ روپا نے سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

روپا اس سے قبل بھی کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہمیں خبروں پر مکمل اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی مخبر پولیس سے مل جائے یا اسے پولیس گرفتار کر لے اور اس طرح ہمارا ہی مخبر ہمیں ہنسوا دے۔ اسی خیال سے غالباً اس نے مجھ سے اطلاع فراہم کرنے والے بارے میں پوچھا تھا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ گیا روپا! میں نے جواب دیا۔ ”ہم نے چار جگہ سے اس خبر کی تصدیق کر لی ہے۔ ہمیں تین طرف سے گھیرا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ یہ گھیراؤ تنگ ہو رہا ہے۔ ہم اس وقت اس جگہ سے صرف دس پندرہ میل دور ہیں جہاں پولیس نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔“

”لیکن تپا! آپ اس بات پر بھی غور کریں کہ پولیس نے صرف کھیزا راٹھور کی طرف ہمارا راستہ کیوں خالی چھوڑ دیا ہے؟“ روپا نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

موتی کو روپا کا یہ سوال اہم معلوم ہوا، وہ بھی کہنے لگا۔ ”ہاں ٹھاکر، یہ بات سوچنے والی ہے۔“
”مجھے بھی پہلے اس بات پر شک ہوا تھا۔“ میں بولا۔ ”پھر مجھے خیال آیا، کیپٹن شرمن نے یہ سوچا ہو گا کہ ہم کھیزا راٹھور جانے کی ہمت ہی نہیں کریں گے۔ اس نے اسی لئے تین طرف سے ہم پر پڑاؤ ڈالنا کافی سمجھا ہو گا۔“ یہ کہہ کر میں سوالیہ نظروں سے روپا کی طرف دیکھنے لگا۔

”ممکن ہے تپا کہ جو آپ نے سوچا ہے، ٹھیک ہو۔“ روپا کی آواز سے اب بھی شک کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”پھر بھی ہمیں انتہائی ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔ کیپٹن شرمن برا فریبی انگریز ہے۔“

اس گفتگو کے بعد بقیہ تمام رات میں اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھتا رہا۔ پولیس کے پڑاؤ سے میں حتی الامکان دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ہم نے کہیں بھی زیادہ دیر ٹھہر کر آرام نہ کیا۔ کیونکہ یہ آرام کا وقت نہیں تھا۔ جب تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا، میں اس سے پورا فائدہ اٹھا کر ممکن حد تک راستے طے کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنے گروہ کو چار حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اپنے تعاقب میں آنے والی پولیس پارٹی سے دور رہنے کے لئے میں بیچ در بیچ راستوں کا انتخاب کر رہا تھا۔

صبح کی گرم دھوپ جب زمین کے سینے سے لپٹنے لگی تو میں، روپا، موتی اور دوسرے چار ساتھی ایک گاؤں میں کنویں کے قریب رکے۔ پنہاریوں نے ہماری طرف دیکھا، لیکن خوفزدہ نہ ہوئیں۔ شاید وہ ہمیں مسلح دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہو سکتا ہے۔ خواتین کو مجھ سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے جب سے یہ راہ اختیار کی تھی، یعنی ڈاکو بنا تھا، خواتین کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی تھی۔ عورتوں کی طرف میں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

پنہاریاں کنویں کے پاس سے ایک طرف ہٹ گئیں۔ میرے ساتھیوں نے کنویں سے پانی کھینچا۔ سب نے منہ ہاتھ دھوئے، پانی پیا اور آگے بڑھ گئے۔ ہمارا رویہ مسافروں جیسا بے ضرر تھا۔ ابھی ہم تقریباً چالیس پچاس قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ مجھے موتی کا خیال آیا۔ میں نے روپا کو مخاطب کیا۔ ”روپا! موتی کہاں ہے؟“

میرے اس سوال پر سب رک گئے۔ روپا نے گھوم کر دیکھا اور کنویں کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید

آہا ہو گا کہ راستے میں پولیس نے اسے دیکھ لیا ہو گا۔ پولیس کے مجھے میں وہ ایک معمولی چیز سی تھا، لیکن ایسے معمولی لوگ میرے لئے بہت اہم تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہی رگھویر کی آنکھوں کے پونٹوں میں حرکت ہوئی اور میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں اور نظر میرے چہرے پر پڑی تو ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے ہونٹ کھولے۔ ”بلونت سنگھ باپو! ہم..... میں آخر تم..... تم لوگوں تک پہنچ ہی گیا اور.....“ اس کا جملہ ادھورہ رہ گیا اور وہ کراہنے لگا۔ پھر اس نے ہمت کر کے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”کھیزا راٹھور میں کیپٹن شرمین تمہارے لئے جال بچھائے بیٹھا ہے۔ وہ آج رات تم لوگوں پر حملہ کرنے والا ہے۔“

”لیکن تمہیں گولی کس نے ماری؟“ میں بول اٹھا۔ مجھے اس شخص کی وفاداری نے بہت متاثر کیا تھا۔

”باپو! میں چھپ کر تمہیں خبر دینے آ رہا تھا کہ کیپٹن شرمین کے ایک سپاہی نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے رکنے کے لئے لاکارا۔ میں اس لئے نہیں رکا کہ جواب طلبی پر کیا کرتا۔ مجھے تو اس وقت ڈیوٹی پر ہونا چاہئے تھا۔ یہی سوچ کر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ پر فائر جھونک مارا۔ گولی میری پنڈلی میں گھس گئی، پھر بھی میں بھاگتا رہا کیونکہ رکنے کا مطلب یقینی موت تھا۔ پھر میں کب بے ہوش ہو کر گر پڑا، مجھے یاد نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید اذیت میں مبتلا ہے۔ ”رگھویر!“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”تم نے میری جان بچائی ہے۔ میری زندگی کی خاطر تم نے اپنے بال بچوں کا خیال بھی نہیں کیا۔“

کچھ کہنے کے لئے رگھویر کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکل سکی۔ اس کے چہرے پر مجھے کرب کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ہوش کے لئے آنکھیں موند لیں۔

رگھویر کی وفاداری کا احسان اتارنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس نے جان دے کر مجھے کیپٹن شرمین کے جال میں پھنسنے سے بچالیا تھا۔

میرے ساتھیوں نے کچھ ہی دیر میں رگھویر کی ارتھی تیار کر دی۔ پھر اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی۔ میں جلتی ہوئی چتا کے سامنے اداس بیٹھا تھا۔

”تایا! چلے میاں سے واپس چلیں۔“ روپا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”رگھویر کی قربانی کام آگئی اور ہم عیار کیپٹن شرمین کے جال میں نہیں پھنسے۔“

”نہیں روپا! اب واپس نہیں چلتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے کیپٹن شرمین کا غرور خاک میں ملانا ہے۔ وہ ہمیں پھانسا چاہتا تھا تو ہم بھی اسے سبق دینے بغیر نہیں رہیں گے۔ جب تک میں رگھویر کے بدلے اس کے سات آٹھ آدمی ٹھنڈے نہیں کروں گا میری روح کو سکون نہیں ملے گا۔“

روپا نے سر جھکا لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں آگے بڑھ کر خطرے کو لاکارنا چاہتا ہوں۔

اس کی پیاس ابھی بجھی نہیں۔ اسی لئے ابھی تک وہ کنویں پر موجود ہے۔ ”روپا کے لمبے میں طنز کی چہرہ تھی۔ روپا کے کہنے پر میں نے مڑ کر دیکھا۔

میری نگاہیں جیسے ہی موتی پر پڑیں، خون کھول اٹھا۔ موتی ایک نوجوان پنہاری پر دست درازی کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنہاری کا دہن تھا، دوسرے ہاتھ سے پنہاری کا بازو تھام رکھا تھا اور اسے ایک طرف کھینچ رہا تھا۔ پنہاری کا پورا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔

میں نے کچھ کہے بغیر اپنے شانے سے رائفل اٹاری اور اس کا رخ موتی کی طرف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے خوفناک دھماکہ ہوا اور موتی چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ پنہاری کے سر سے مٹکا گر گیا۔ رائفل کو دوبارہ اپنے شانے پر ڈال کر میں اس طرح آگے بڑھا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ میرے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر موتی کی لاش دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ میں نے نشانہ لے کر فائر کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ موتی کے دل میں گولی اتر جانے کے بعد اس کا زندہ بچنا ممکن نہیں تھا۔

”کھیا ٹھیک کتا تھا۔ موتی جب بھی باہر جاتا تھا، اس کی ہوس بے قابو ہو جاتی تھی۔“ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد میں بولا۔ ”مجھے تو موتی پر پہلے ہی شک تھا، مگر آج یقین ہو گیا۔ وہ یقیناً ہم میں سے نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے اسے گردہ سے الگ کر دیا۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

دوسرے وقت سارا گردہ کھیزا راٹھور گاؤں سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر رک گیا۔ ”اب کچھ دیر آرام کر لو۔“ میں نے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”وہ آدمی آگے جا کر دیکھ کر آئیں کہ کوئی خطرہ تو نہیں، پھر شام کو آگے بڑھیں گے۔“

گشت پر گئے ہوئے لوگ تقریباً ایک گھنٹے میں واپس آئے۔ ان دونوں کو دور ہی سے دیکھ کر میں ہوشیار ہو گیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کی خبر دے رہی تھی۔ وہ دونوں کسی تیسرے شخص کو اٹھ کر لا رہے تھے۔ فاصلے کے سبب میں تیسرے شخص کو نہ پہچان سکا۔

”ارے یہ تو اپنا رگھویر معلوم ہوتا ہے۔“ ان دونوں کے کچھ اور قریب آنے پر روپا بول اٹھا۔ جب وہ دونوں قریب آگئے تو روپا نے ان سے سوال کیا۔ ”اس کا پیر زخمی ہے، مگر یہ تمہیں کہاں ملا؟“

”میاں سے کوئی دو میل دور یہ بے ہوش پڑا تھا۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”ہم اسے پہچان گئے تو یہاں اٹھا لائے۔“

”جلدی کرو، اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارو۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔“ میں نے حکم دیا۔

پھر میں نے رگھویر کے زخمی پیر کا معائنہ کیا۔ اس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی۔ زخم دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ خون کافی بہہ چکا ہے۔

روپا نے اپنے خنجر کی نوک زخم میں ڈال کر گولی نکالی۔ میری نظرس رگھویر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے رگھویر کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ کیونکہ وہ میرا خنجر تھا۔ وہ یقیناً کوئی اہم اطلاع مجھ تک پہنچائے گا، مجھے یقین تھا۔ رگھویر، پولیس کے محلے میں ملازم تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کوئی خاص خبر لے کر

☆=====☆

”تایا! تمہارا خیال درست ثابت ہوا۔“ روپا کی آواز سنائی دی۔ ”وہ کشتیوں کے ذریعے دریا پار کر کے ادھر آ رہے ہیں۔“ روپا کی آواز میں جوش تھا اور خوشی بھی۔ ”وہ دو کشتیوں پر سوار ہیں۔ اندازے کے مطابق دونوں کشتیوں میں بیس پچیس پولیس والے ہوں گے۔“

”بس تو اب انہیں سبق دینے کا وقت آ گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”روپا! تم میرے بازو پر رہو، میں درمیان میں رہوں گا۔ سنو، گولی پہلے میں چلاؤں گا۔ جیسے ہی میری طرف سے فائر ہو تینوں جانب سے فائرنگ شروع ہو جانی چاہئے۔“

میں تین دن سے اس موقع کا منتظر تھا۔ ڈاکوؤں کا یہ اصول تھا کہ پولیس کے بارے میں خبر ہوتے ہی وہ فرار ہو جاتے تھے۔ ڈاکو کبھی خود اس کی کوشش نہیں کرتے کہ پولیس سے معرکہ آرائی ہو۔ یہی اصول میرا بھی تھا۔ میں بھی ہر ممکن طور پر پولیس سے نہ لڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معرکہ آرائی کی صورت میں کارٹوس بہت ضائع ہوتے ہیں جو ڈاکوؤں کے لئے بہت قیمتی ہوتے ہیں، لیکن اس رات مجھے جوش آ گیا تھا۔ کیپٹن شرمن کو میں ایسا سبق دینا چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے۔ رگھویر کی موت نے مجھے غیرت دلا دی تھی۔ اس کی خبر صحیح ثابت ہوئی تھی۔ پولیس مجھے پھانسنے کے لئے اندھیرے کا انتظار کر رہی تھی۔

اگر خبر نہ ملتی تو کیا ہوتا؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے کنارے کے کٹاؤں میں کھڑے ہو کر اپنی راکفل کا ٹریگر دبا دیا۔ قریب ہونے والی کشتیوں پر میری نظر جمی ہوئی تھی۔ مجھ سے تقریباً پانچ گز دور روپا چند ساتھیوں کے درمیان کشتیوں کا نشانہ لئے بیٹھا تھا۔ وہ تو پولیس کا نام سن کر ہی غضب ناک ہو جاتا تھا، مگر آج وہ پولیس والوں کو سامنے دیکھ کر بھی اب تک خاموش رہا تھا کیونکہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے فائر ہی کا منتظر تھا۔ میں نے اس وقت فائر کیا تھا جب دونوں کشتیاں دریا کے نیچوں بچ بچ چکی تھیں۔ میرے فائر کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ میرا فائر خالی گیا مگر مجھے محسوس ہو گیا کہ اچانک فائر سے پولیس والے گھبرا گئے ہیں۔

معاً میں نے ایک کشتی میں روشنی دیکھی۔ روشنی کی وہ لکیر اندھیرے کو چیرتی ہوئی کنارے پر پڑی۔ مجھے میرا ہدف مل گیا اور اس مرتبہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ کشتی ایک بار پھر اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میں نے کشتی کو ہتھکولے کھاتے دیکھا۔ اسی لمحے سامنے سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ کشتی سے ایک چیخ بلند ہوئی اور زوردار جھپکا ہوا۔ یقیناً کوئی سپاہی گولی کھا کر دریا میں گرا تھا۔ جھپکے ہی کے ساتھ چیخ بھی سنائی دی تھی۔ چند ہی لمحوں میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

تین اطراف سے کشتیوں پر فائرنگ ہونے لگی اور پھر دونوں کشتیوں سے بھی کنارے کی جانب گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ دوسرے کنارے پر موجود پولیس والے غالباً کچھ نہ کچھ کر خاموشی سے راکفلزیں تھامے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ یقیناً وہ الجھن کا شکار تھے۔ میں پہلے ہی ان کی نقل و حرکت دیکھ چکا تھا۔ وہ شاید کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

پولیس والوں کے مقابلے میں ہم محفوظ تھے۔ ہمیں اپنے جال میں پھنسانے کی بجائے خود پولیس والے ہمارے جال میں پھنس گئے تھے۔ رات کے اندھیرے کے باوجود کشتیوں کا نشانہ لینا آسان تھا، لیکن ہم پولیس والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ ہم کناروں کے کٹاؤں میں بالکل محفوظ تھے۔ پھر کنارے کی طرف سے یہ ایک وقت تین گولیاں چلیں۔ ان میں سے ایک گولی نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ یہ گولی میں نے چلائی تھی اور اس کا مقصد یہی تھا۔ دوسری گولی جو روپا نے چلائی تھی، ایک پولیس والے کی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی اور تیسری گولی نے بھی کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک پولیس والے کا سینہ چھید دیا۔ میں نے پے درپے دو چیخیں سنی تھیں۔

”پانی میں کود پڑو۔“ گھڑے ہوئے اردو لہجے میں ایک تیز آواز سنائی دی۔ یہ حکم دینے والا یقیناً انگریز کیپٹن شرمن تھا۔ لہجے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ کیپٹن شرمن کے حکم سے پہلے ہی تقریباً دس گیارہ پولیس والے پانی میں کود چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جابیں بچانے کے لئے کیپٹن شرمن کے حکم کا انتظار نہیں کیا تھا۔

پھر پانی میں دھماکے ہونے لگے۔ روپا یہ موقع کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک کشتی سے کودتے ہوئے پولیس والے کو فضا ہی میں بھون دیا۔ لگتا تھا کہ کیپٹن شرمن کے سوا تمام پولیس والے حواس کھو بیٹھے تھے۔ کمر تک پانی میں کھڑے ہو کر کیپٹن شرمن نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ روپا اس وقت تک کٹاؤں کی آڑ سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ اسے شاید یہ افسوس تھا کہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کیپٹن شرمن نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس کو پسپا ہوتے دیکھ کر اس کا حوصلہ یقیناً بہت بڑھ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے سرکنا ہوا پانی کے قریب پہنچ گیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک تھی۔

”روپا! واپس آ جاؤ۔“ میں چیخ اٹھا۔ روپا کو خطرے میں دیکھ کر میری آواز بھرا سی گئی۔ میری آواز جیسے روپا نے سنی ہی نہیں۔ اس نے ایک اور فائر جھونک مارا۔ غالباً کیپٹن شرمن بھی زوراً یہ سمجھ گیا کہ کوئی کنارے پر آ کر گولی چلا رہا ہے۔ تقریباً دس پولیس والے واپس دوسرے کنارے کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک کشتی الٹ گئی تھی۔

”بھتی جلدی ممکن ہو کنارے پر کھڑی ہوئی کسی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔“ گبڑی ہوئی اردو میں اپنے باقی ماندہ سپاہیوں کو یہ حکم دینے والا بھی کیپٹن شرمن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ اب کنارے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ معلوم نہیں عیار انگریز کیا چاہتا تھا۔

سپاہی اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ کچھ دیر کو فائرنگ رک گئی۔ اسی وقت میں نے ایک بار پھر روپا کو پکارا۔ اس کی وجہ سے سارا کھیل بگڑا جا رہا تھا۔ وہ درمیان میں آ گیا تھا اس لئے میں یا میرے ساتھی سپاہیوں پر گولی چلانے سے قاصر تھے۔ کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی روپا کو موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ میرے خیال میں روپا نے درمیان میں آ کر سخت حماقت کی تھی۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ روپا میرے کٹنے کے مطابق واپس نہیں ہو رہا تو مجبوراً مجھے بھی ایک خطرناک قدم اٹھانا پڑا۔ اس کے سوا اب میرے

لئے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

میں بھی کٹاؤ سے نکل کر سینے کے بل ریٹکتا ہوا روپا کے پاس پہنچ گیا۔ کیپٹن شرمن اور پولیس واسے اس وقت تک ایک کشتی میں سوار ہو چکے تھے۔ روپا ان کا نشانہ لے رہا تھا۔

”ٹھہر جاؤ۔“ میں نے روپا کو فاز کرنے سے روک دیا۔ ”پہلے یہ دیکھو وہ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“

”تایا! وہ اس طرح فرار ہونا چاہتے ہیں۔ وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔“ روپا نے جواب دیا۔

روپا کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کشتی ان دونوں کی جانب بڑھنے لگی۔ روپا یہ دیکھ کر پھر گیا اور اس نے فاز کر دیا۔ سنسناتی ہوئی گولی کشتی کے اوپر سے گزر گئی۔ کیپٹن شرمن نے فاز کا جواب فوراً دیا۔ اب پولیس والوں پر بھی جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل فاز کر رہے تھے۔ ایک گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ مجبوراً میرے ساتھیوں نے پیچھے سے فازنگ شروع کر دی۔ تقریباً پانچ منٹ تک دونوں جانب سے فازنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ زخموں کی چغیں ان دھماکوں میں دب گئیں۔

اس وقت تک دوسرے کنارے پر موجود پولیس والوں کو عقل آگئی تھی۔ انہوں نے بھی اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ گہرا اندھیرا اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی گولیاں ضائع ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود فازنگ جاری تھی۔

کیپٹن شرمن کی کشتی قریب آ رہی تھی۔ میں نے اس کشتی میں موجود کئی سپاہیوں کو زخمی کر دیا مگر پھر بھی کشتی آگے بڑھتی رہی۔ کشتی اور ہمارے درمیان میں پچیس گز کا فاصلہ تھا۔ اچانک کیپٹن شرمن کی تیز آواز سنائی دی۔ ”باہر کو پڑو۔“

میری سمجھ میں اب بھی نہ آیا کہ وہ عیار انگریز کیا چاہتا ہے۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ سرخ و سفید کتنا کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں فوراً کٹاؤ میں پناہ لے لینا چاہئے۔ یقیناً وہ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔“ میں نے روپا سے کہا۔

”تایا! آپ کٹاؤ میں چھپ جائیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ روپا نے اس طرح جواب دیا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

کچھ دیر کے لئے رائفلیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک جانب اکٹھا کیا۔ دوسری جانب کیپٹن شرمن نے پولیس والوں کے ہمراہ ایک کشتی کی آڑ لے رکھی تھی۔ تھیں وہاں پر گھنٹوں گھنٹوں پانی تھا۔ کیپٹن شرمن نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”آہستہ آہستہ کشتی کو دھکیلے ہوئے آگے بڑھو۔ مخالف سمت سے کتنے ہی فاز کیوں نہ ہوں، کشتی رکتی نہیں چاہئے۔ جو بھی پیچھے ہٹا، اسے میں گولی مار دوں گا۔“ کیپٹن شرمن کو میں نے اس کے لمبے سے پچھانا۔

کیپٹن شرمن شاید کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔ کٹاؤ میں میرا پورا گردہ موجود تھا اور ان کے سامنے وہ دس بارہ پولیس والوں کو لے کر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ معاً میں نے دیکھا کہ وہ نے سپاہیوں پر فازنگ شروع کر دی، مگر اس کی کوشش لاعاصل ہی رہی۔ گولیاں کشتی سے ٹکرا کر بیکار ہ جاتی تھیں۔ میں نے بھی سپاہیوں پر فازنگ شروع کرادی۔ اس کے باوجود کیپٹن شرمن کی پیش قدمی نہ

رکی۔

یہ دیکھ کر میں گرجا۔ ”روپا! واپس آ جاؤ روپا!“

میں اب چونکا ہو چکا تھا۔ کیپٹن شرمن اپنی جان کی بازی لگا کر میرے سامنے آنا چاہتا تھا۔ معاً میری نگاہ اپنی کارٹوس کی پٹی پر گئی۔ پٹی میں اب صرف تین چار کارٹوس باقی تھے۔ کیپٹن شرمن اب سپاہیوں کے ہمراہ کنارے سے صرف دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت میں نے روپا کو بھی چونک کر پیچھے کی طرف سرکتے دیکھا۔ کٹاؤ تک پہنچنے کے لئے اسے تیس چالیس قدم پیچھے ہٹنا تھا۔ پھر بھی شاید اسے خیال تھا کہ وہ دشمن کی نظر میں نہ آ جائے اور دشمن اس پر حملہ نہ کر دے۔ وہ اسی لئے گھنٹوں کے بل آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اسے ابھی کٹاؤ تک پہنچنے کے لئے مزید دس قدم پیچھے ہٹنا تھا، مگر اس وقت تک کیپٹن شرمن اپنے سپاہیوں کے ہمراہ کنارے تک پہنچ چکا تھا۔

”صاحب! وہ بھاگ رہا ہے۔“ ایک سپاہی نے انگلی سے روپا کی طرف اشارہ کیا۔

یہ سنتے ہی کیپٹن شرمن نے ٹریگر دبا دیا۔ روپا ابھی کھڑا ہو کر کٹاؤ کی آڑ لینے ہی والا تھا کہ اسی لمحے گولی اس کی پنڈلی میں گھس گئی اور وہ الٹ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے دشمنوں پر جنم کے دہانے کھول دیئے۔ روپا کی طرف اشارہ کرنے والا چیخ کر دریا میں جاگرا۔ میں نے اس کے سینے کو نشانہ بنایا تھا۔ میری دوسری گولی کیپٹن شرمن کے شانے کو چیر کر نکل گئی۔ اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ دوسرے پولیس والے تیزی سے کنارے پر کھڑی دو تین کشتیوں کی آڑ میں چھپ گئے۔ خود کیپٹن شرمن زمین سے چپک کر بمشکل ریٹکتا ہوا ایک کشتی کی آڑ میں پہنچ سکا۔ اس کے بازو سے میں نے خون بہتے دیکھا تھا۔ اس نے زخمی بازو پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”فازنگ نہیں رکھی چاہئے، اپنی رائفلیں سنبھالو!“ کیپٹن شرمن نے اپنے سپاہیوں کو کراہتے ہوئے حکم دیا۔

مجھے اس وقت کیپٹن شرمن سے زیادہ روپا کی فکر تھی ورنہ شاید میری پٹی کا آخری کارٹوس عیار انگریز کو جنم میں پہنچا دیتا۔

”گولی کہاں لگی؟“ میں نے روپا کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ سوال کرتے ہوئے میری آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”کوئی خاص زخم نہیں آیا۔ میری فکر نہ کریں، دشمنوں کی خبر لیں۔“ روپا یہ کہتے ہوئے بیٹھ کر اپنی رائفل لوڈ کرنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ روپا کی پنڈلی خون سے تر تھی۔ اپنے سر سے پگڑی کھول کر میں نے روپا کے زخم پر باندھ دی۔ کچھ ہی دیر میں پگڑی خون سے بھر گئی۔

”چلو بھاگ چلیں۔“ میں نے روپا کو سارا دے کر کھڑا کیا۔ دوسرے دو ساتھیوں نے بھی اسے سہارا دینا چاہتا۔

روپا نے ان دونوں کو دھکا دے کر الگ کیا اور کہنے لگا۔ ”نہیں تایا! وہ صرف پولیس کے دس آدمی

ہیں۔ انہیں ٹھکانے لگانا مشکل نہیں ہے۔“
”روپا!“ میری آواز میں سختی آگئی۔ ”میں کہہ رہا ہوں‘ فرار ہونا ہے اور تم ضد کر رہے ہو۔“ زیادہ خون بہ جانے کی صورت میں روپا کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی، یہ میں سمجھ چکا تھا۔

اس میں میرا حکم ٹالنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اسی لئے روپا کی آواز میں بولا۔ ”جو آپ کہیں گے وہی ہو گا۔ روپا آپ کا غلام ہے۔ ہم کیپٹن شرمن سے پھر کبھی نمٹ لیں گے۔“
اچانک کیپٹن شرمن نے فائزنگ رکوا دی۔ ”ڈاکوؤں کی طرف سے کوئی نقل و حرکت نہیں ہو رہی، رک جاؤ۔“ فرار ہوتے وقت میں نے کیپٹن شرمن کے آخری الفاظ سنے۔

اس خوفناک معرکے میں فرار ہوتے وقت میرے چار ساتھیوں کو پولیس والوں نے ایک قریبی گاؤں سے گرفتار کر لیا۔ یہ خبر سن کر مجھے تو بہت رنج ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کوئی بھی ساتھی اعتراف جرم نہیں کرے گا۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ پولیس گرفتار ہونے والوں کو پریشان ضرور کرے گی، جھوٹے گواہ عدالت میں پیش کئے جائیں گے۔ میں نے بھی سوچ کر اپنے مجبور کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ اگر کوئی بھی شخص گواہی دینے یا میرے ساتھیوں کو شناخت کرنے جائے گا تو میں اس کے سارے خاندان کو ختم کر دوں گا۔

میری اس دھمکی کے بعد کس میں اتنی ہمت تھی جو مجھ سے دشمنی مول لے کر پولیس کا ساتھ دیتا۔

جلد ہی مجھے یہ اطلاعات بھی مل گئیں کہ پولیس نے لوگوں کو لالچ بھی دیا اور دھمکیاں بھی دیں کہ کوئی گواہی دینے کو تیار ہو جائے، لیکن کوئی بھی شخص پولیس کی طرف سے عدالت میں قدم رکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ لوگ صاف کہہ دیتے کہ ہم سے کوئی بھی کام لے لیا جائے مگر ہم گواہی نہیں دے سکتے۔

کیپٹن شرمن اس صورت حال سے مایوس ہو گیا۔ مجبوراً اسے دو ماہ کے اندر میرے چاروں ساتھیوں کو رہا کر دینا پڑا۔ ہم نے پولیس کی بے بسی کا خوب مذاق اڑایا۔ لوگ اب کھلے عام کہتے پھرتے تھے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت سہی، مگر چنبل کا راجا تو ٹھاکر بلونت سنگھ ہے۔ اس پر مجھے عجب سا فخر محسوس ہوتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میرا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ پولیس سے میری معرکہ آرائیاں جاری رہیں۔

تیسری رام کے بیٹے نیتا رام کو قتل کرنے کے لئے میں ایک روز دن دیر ساڑھے کھیزا راتھور گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں کھیتوں پر کام کرنے والے چوکنا ہو گئے۔

”اگر کبھی نیتا رام نے کھیتوں کا سرخ کیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا؟“ میں نے کھلے عام گاؤں والوں کو دھمکی دی۔

نیتا رام پہلے ہی خوفزدہ ہو کر کہیں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تمام فصل میں آگ لگا دی۔ نیتا رام کی حویلی پر بھی میں نے حملہ کیا۔ وہ حویلی میں بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اطلاع ملی کہ نیتا رام

☆=====☆
وہ چاروں ایک نوجوان کو زد و کوب کرتے اور تقریباً کھینچتے ہوئے میرے سامنے لائے۔ نوجوان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”ٹھاکر! یہ نوجوان دو تین دن سے غاروں میں بھٹک رہا ہے۔ ہم نے اس سے سبب دریافت کیا تو یہ کہنے لگا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ کی تلاش میں ہے۔“ ان چاروں میں سے ایک شخص نے مجھے بتایا۔ ان چاروں کا تعلق میرے ہی گروہ سے تھا۔

”اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دو۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

اس نوجوان کے چہرے اور لباس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ روپا مشتہ اور تیز نظروں سے اس نوجوان کو گھور رہا تھا۔ آنکھوں سے پٹی کھولے جانے کے بعد بھی کچھ دیر نوجوان کی آنکھیں بند رہیں۔ غالباً اس کا سبب روشنی تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول ہی دیں۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو احسوس کی طرح دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں وہاں موجود تمام افراد پر سے گزر کر میرے چہرے پر جم گئیں۔ وہ خاموشی سے میری بڑی بڑی مونچھوں، تیز چمک دار آنکھوں اور بھرے بھرے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

روپا کو شاید اس نوجوان کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے اسی لئے تیز اور سخت لہجے میں نوجوان سے سوال کیا۔ ”اے لڑکے! تجھے کس نے بھیجا ہے؟“

کوئی کمزور دل شخص ہوتا تو روپا کے لہجے سے ڈر جاتا، مگر نوجوان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے خود کو لڑاکا کہے جانے پر ہنسی آگئی ہو۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے روپا کے سوال کا جواب دیا۔ ”مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔“ پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں تمہارے ساتھ کام کرنے آیا ہوں باپو بلونت سنگھ!“ پھر اس نے اپنی درو بھری کہانی سنائی۔ اس روداد کے مطابق اس کے باپ کو ایک قتل کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ تفصیل بتاتے لگا۔ ”ایک نوجوان گوبند نے میری جوان بہن کو چھیڑا اس پر میرے پتا جی کو غصہ آ گیا۔ بھلا کون باپ ایسا بوجو گا جو یہ برداشت کر سکے۔ میرے پتا جی نے گوبند پر کلہاڑی سے وار کیا۔ کلہاڑی کے وار سے گوبند کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل کر گرا۔ گوبند موقع ہی پر دم توڑ گیا اور میرے پتا جی کو پکڑ لیا گیا۔ انہیں بہت سے لوگوں نے گوبند پر کلہاڑی سے وار کرتے دیکھا تھا۔ میرا تعلق خود سی آئی ڈی کے محکمے سے تھا۔ اس کے باوجود میرے پتا جی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی بلکہ بطور سزا مجھے بھی محکمے سے الگ کر دیا گیا حالانکہ اس واقعے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔“

یہ سنتے ہی روپا پھر گیا اور تیز آواز میں بولا۔ ”مظلوم بن کر ہماری ہمدردی حاصل کرنے آیا ہے۔ ہمارے سامنے اداکاری کر رہا ہے۔ تجھے یقیناً پولیس نے بھیجا ہے۔“ روپا یہ کہتے ہی اس نوجوان پر جھپٹا اور

”نہیں تیا، پولیس کے آدمی پر کسی طرح اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ آپ کو اس کی مدد کرنی ہو تو کر دیں مگر اسے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ رونا نے میری بات سے اختلاف کیا۔ ”ہمیں ضرورت بھی کیا ہے کہ اسے اپنے گروہ میں شامل کریں۔“

”آپ کو پتا ہے کہ وہ سارا دن کچھ لکھتا رہتا ہے۔“ روپا کو کچھ اور نہ سوجھا تو بولا۔ ”یقیناً وہ ہماری سرگرمیاں نوٹ کر رہا ہے۔ جنہیں موقع ملے ہی پولیس کو بھیج دے گا۔“

روپا اس پر ہنس دیا، پھر کہنے لگا۔ ”تایا! ڈاڑھی آپ کے حوالے کرنے میں اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی انگریزی پڑھا ہوا نہیں ہے۔ وہ سب کچھ انگریزی میں لکھتا ہے۔ اس کی آخر ضرورت کیا ہے؟ کیوں لکھتا ہے، وہ یہ سب کچھ؟“ آخر میں روپا نے اعتراض کیا۔

روپا کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ مزید بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اسے معلوم تھا کہ جب میں ایک بار کسی پر اعتماد کر لوں تو جلد اس کی طرف سے بدن ظن نہیں ہوتا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ روپا بجھی ہوئی سی آواز میں بولا۔ میں سمجھ گیا کہ ذہنی طور پر وہ اب بھی

”میرا نام و کرم ہے! تم جس طرح چاہو مجھے آراؤ۔ مجھے تم جتنا چاہے اوروں میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ میں، پولیس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میرے پتا جی نے اپنی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے والے ایک نوجوان کو سزا دی جسے میں غلط نہیں سمجھتا۔ لیکن ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی اور میرے ساتھ بھی۔“ نوجوان نے کہا۔

میں نے روپا کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے یقیناً میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی، مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھلا میرے حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ روپا کیا سوچ رہا ہو گا۔ سی آئی ڈی کے محکمے کا کوئی نوجوان، ڈاکوؤں کے گردہ میں کس طرح شامل ہو سکتا تھا۔ اس کے باپ نے کسی کو قتل کیا تھا اور پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ اس نوجوان کو محکمے سے نکال دیا گیا تو اس نے چھبیل کے غاروں کا رخ کیا۔ روپا کا ذہن شاید اس کمائی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

میں نے یہ اندازہ بھی لگایا اور خود وکرم بھی سمجھ چکا ہے کہ روپا کا اعتماد حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ روپا اسے گردہ میں نہیں رہنے دے گا۔ پھر بھی وہ روپا کے سامنے مسکراتا رہتا۔

و کرم سے روپا عمر میں چھوٹا تھا، مگر اس سے زیادہ ظالم، خوفناک اور خونخوار تھا۔

ان اطلاعات کے بعد روپا سے میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے روپا کہ اب ہم وکرم کو باقاعدہ اپنے گروہ میں شامل کر لیں۔“

مجھ سے متفق نہیں۔

نشانے بازی میں وکرم کامیاب رہا۔ میں نے اس سے اڑتے ہوئے پرندے کا نشانہ لینے کو کہا۔ اس نے فائر کر کے پرندے کو نیچے گرا دیا۔

”لڑکے!“ میں نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”تم اچھا نشانہ لے سکتے ہو، لیکن اب تک تم ہمارے روپا کی طرح قابل نہیں ہوئے۔“

”ٹھاکر! میں آپ کی رفاقت میں سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔“ وکرم ادب سے بولا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ روپا، وکرم سے خار کھاتا ہے۔ کچھ ہی دونوں میں وکرم نے روپا کے سوا اپنے رویے کے سبب گروہ کے تمام ہی افراد کو دوست بنا لیا۔ گروہ کے افراد فرصت کے اوقات میں وکرم کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے۔ خصوصاً اس وقت جب روپا کسی کام سے باہر گیا ہوتا تو یہ محفل خوب جمتی۔ وکرم انہیں سی آئی ڈی کے محکمے کے بارے میں بتاتا کہ وہاں لوگوں کو کس طرح تربیت دی جاتی ہے۔ وہ انہیں مثالیں دے کر سمجھاتا۔ اسکاٹ لینڈ پولیس کتنی ہوشیار ہے؟ وہ کس طرح مجرموں کو پکڑتی ہے۔

جو لوگ میرے گروہ میں شامل تھے، وہ کبھی اپنے دیہات اور قصبوں سے باہر نہیں گئے تھے۔ غربت کے ماحول میں پروان چڑھنے والے ڈاکو۔ دیس بدیس کی باتیں بڑے شوق سے سنتے۔ اس طرح وکرم سارے گروہ میں ہر واعرز ہو گیا۔ وہ تہا ہوتا تو ڈائری لکھ کر اپنا دل بھلاتا۔ کبھی کبھی وہ خاموشی سے جانے کن سوچوں میں گم ہو جاتا۔

جب وکرم پہلی بار میرے ساتھ ڈاکا ڈالنے روانہ ہوا تو بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔

”کہاں ڈاکا ڈالنا ہے؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”تم نئے ہو اس لئے پہلی مرتبہ تمہیں معاف کرتا ہوں، پھر کبھی یہ سوال نہ کرنا۔“ میں آنکھیں نکال کر بولا۔

میرا یہ اصول تھا کہ جہاں ڈاکا ڈالنا ہوتا، گروہ کے افراد کو آخر وقت تک کچھ نہ بتاتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے پولیس کس طرح کوئی اندازہ لگا سکتی تھی۔

رات کو جانا ہے، یہ بات شام ہی کو بتا دی گئی تھی، اس کے بعد کسی کو بھی کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

نصف شب سے پہلے گروہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ میں نے مختلف مقامات پر اپنے آدمی مقرر کر دیے، پھر دو تین فائر کئے۔ وکرم ایک مکان کی چھت پر میرے دو ساتھیوں کے ہمراہ رانقل تھامے بیٹھا تھا۔ رانقل کے دھماکے سن کر گاؤں میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ لڑائی کے دوران انہیں خواہ مخواہ جھپٹ میں آ جانے کا بھی خوف تھا۔

جس کی چھت پر وکرم بیٹھا تھا اسی مکان میں روپا کو ساتھ لے کر داخل ہوا۔ میرے ساتھ بلونت سنگھ کا بیٹا صوبیدار اور گوبال بھی تھے۔ روپا اور صوبیدار میرے دائیں بائیں تھے اور گوبال پیچھے تھا۔ وہ ار

لئے بیٹھ میرے پیچھے رہتا تھا کہ عقب سے کہیں کوئی وار کر دے تو میں محفوظ رہ سکوں۔

جس کے گھر ڈاکا ڈالا گیا تھا، وہ مالدار آسامی تھا۔ اس کے پاس ہندوق بھی تھی، لیکن مجھ پر گولی چلانے کی ہمت بھلا کس میں تھی۔ دولت سے زیادہ لوگوں کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ جانتے تھے کہ جو مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر وار کرتا ہے، اس کا خاندان ختم کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکے میں مجھے نقد روپے اور سونا چاندی کے زیورات ملے۔ اسی کے ساتھ میں نے گاؤں میں یہ بھی معلوم کر لیا کہ کسی کے پاس رانقل تو نہیں۔ چلتے چلتے میں نے گاؤں سے سات آٹھ ہندوقیں بھی حاصل کر لیں۔ وکرم اس بات سے بے خبر تھا کہ آج ہی رات اس کا امتحان ہونے والا ہے۔ اسے میں بلا سبب ساتھ نہیں لایا تھا۔

”سب نکل چلو۔“ میں نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

میرے ساتھی لوٹ کا مال لے کر گاؤں سے نکل گئے۔ روپا اور صوبیدار کے ساتھ گوبال بھی میرے اشارے پر رک گیا تھا۔

”وکرم! صرف تم رک جاؤ۔“ میں بولا اور محسوس کیا کہ وکرم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی ہیں۔ ”کیوں، کیا گھبرا گئے؟“ میں نے وکرم سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں تو۔“ وکرم نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”وہ تو تہماری آواز سے پتا چل رہا ہے کہ تم بالکل نہیں گھبرائے۔“ روپا ہنس دیا۔

”تم چپ رہو روپا! مجھے وکرم سے اصل بات کرنے دو۔“ میں بول اٹھا، پھر وکرم کو مخاطب کیا۔ ”اس گاؤں میں پولیس کا ایک مخبر ہے۔ اسے تم قتل کرو گے۔“

وکرم کے جس ہاتھ میں رانقل تھی، وہ ہاتھ کاٹنے لگا۔ روپا کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”ٹھاکر! مجھے پولیس سے بدلہ لینا ہے۔“ وکرم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک ہی بات ہے۔ پولیس کا مخبر بھی کتا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔ ”تو اگر اتنے کمزور دل کا تھا تو میرے ساتھ کیوں آیا؟“

”نہیں! میں نہ کہتا تھا کہ یہ ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھنے آیا ہے۔“ روپا نے موقع پا کر فوراً کہا۔

وکرم چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک روپا نے اپنی رانقل اس کی طرف تان لی۔ درخت کے نیچے پانچ آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان پانچوں میں خود میں بھی شامل تھا۔ وکرم کو شاید یقین تھا کہ روپا میرے حکم کے بغیر اس پر گولی نہیں چلائے گا۔ وہ تنے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھاکر! روپا سے کہو کہ وہ اپنی رانقل کی ٹال نیچے کر لے۔“ چند لمحے بعد وکرم کی آواز سنائی دی۔ اب اس کی آواز سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”روپا کو اس طرح بات بات پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ میں قتل کرنے کو تیار ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ پیسے میں بیگا ہوا تھا۔ میں نے روپا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ

کر چکیں جھپکائیں۔ اسی کے ماتھے روپانے اپنی رائفل کی ٹال نیچے کر لی۔
 ”اڑتے پرندے گرانے والے کو پسینہ آگیا۔“ روپا وکرم کے قریب جا کر طنزیہ آواز میں بولا۔
 ”اس سے پہلے کبھی میں نے کسی جیتے جاگتے آدمی کو قتل نہیں کیا تھا اسی وجہ سے.....“
 وکرم اپنی صفائی پیش کر رہا تھا کہ میں بول اٹھا۔ ”روپا! تم چپ رہو..... چلو وکرم! آگے بڑھو۔“

خلاف توقع وکرم اس روز آزمائش سے بچ گیا۔ میں نے گوپال کو پولیس کے مخبر کی تلاش میں بھیجا۔
 گوپال نے واپس آ کر بتایا کہ پولیس کا مخبر فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی گاؤں سے فرار ہو گیا۔ شاید وہ پولیس کو اطلاع دینے گیا تھا کہ گاؤں میں ڈاکہ پڑ رہا ہے۔ یہ سن کر میں تھلا کے رہ گیا۔ یہی حال روپا کا تھا۔
 ”وہ بچ کر جائے گا کہاں۔ کچھ دن بعد سہی۔“ میں بڑبڑایا۔

صبح ہونے سے پہلے پورا گروہ چنبل کے غاروں میں واپس آ گیا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکے کے مال کو تقسیم کیا گیا۔ کل مال چار ہزار روپے کا تھا۔ اس میں سے نصف حصہ میں نے رکھ لیا۔ جن ساتھیوں کے پاس اپنی رائفلیں تھیں انہیں قاعدے کے مطابق زیادہ حصہ ملا۔ کچھ نئے بھرتی ہونے والوں کو صرف معمولی رقم بطور محنت ملی۔

”تمہیں اس بار کچھ نہیں ملے گا۔“ میں نے وکرم کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”تمہاری کمائی ایک قتل کرنے کے بعد شروع ہو گی۔“ سب اپنا اپنا حصہ لے کر چلے گئے تو میں نے وکرم کو پھر مخاطب کیا۔
 ”جوان! کیا سوچ رہا ہے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جس طرح تیرے بارے میں سوچتا ہوں، تو بھی میرے لئے سوچتا ہو گا۔“

”نہیں۔“ وکرم گھبرا کر بولا۔ پھر اس نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔ ”ٹھاکرا! تمہیں..... تمہیں میرے بارے میں کیا خیال آتے ہیں؟“

میں زور سے ہنس دیا، پھر کہا۔ ”تعلیم یافتہ لوگ واقعی چالاک ہوتے ہیں، یہ بات سچ ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے جواب دینے کے بجائے خود مجھ سے سوال کر دیا..... جانا چاہتے ہو کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟ تو سنو، مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم یہاں پھنس گئے ہو۔ کل رات تم نے پولیس کے ایک مخبر کو قتل کرنے کے لئے کہا گیا۔ تم اس وقت کس قدر گھبرا گئے تھے۔ میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔“ میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ اتر گیا ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں بولا۔ ”تعلیم یافتہ لوگ کسی کی جان لینے سے ڈرتے ہیں۔ اسے یہ لوگ ظلم کتے ہیں، مگر یہی لوگ اپنی شیطانی ذہانت سے اکثر غریبوں کو پامال کرتے رہتے ہیں۔ کبھی تم نے اس بارے میں بھی سوچا ہے؟“ میری آواز پرجوش ہو گئی۔ ”وکرم! پڑھے لکھے لوگ دوسروں کو آپس میں لڑانے کے لئے اپنا علم استعمال کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر کے ان سے بے ایمانی کرتے ہیں۔ خیر..... میں جوش میں بہت بول گیا اور اصل بات بھول ہی گیا۔ تمہیں ہم جیسا ہونے میں وقت لگے گا۔ رفتہ رفتہ تمہاری جھجک نکل جائے گی۔ پھر دشمنوں کی جان لیتے ہوئے تمہارا دل نہیں گھبرائے گا۔ اچھا یہ بات چھوڑو اور بتاؤ، تم ڈاکے کے مال کی

تقسیم کے بارے میں سوچ رہے تھے نا؟“
 ”ٹھاکرا! آپ کا اندازہ حیرت انگیز طور پر بالکل درست ہے۔“ وکرم نے اعتراف کیا۔ ”میں یہی سوچ رہا تھا۔ آپ نے جس طرح مجھے بانٹے وہ میری سمجھ میں نہیں آئے۔“

”سیدھی طرح کو کہ تمہارے خیال کے مطابق میں نے زیادہ حصہ لیا۔“ میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں تمہیں سمجھاتا ہوں، مگر یہ بات ڈائری میں نہ لکھتا۔ میں نے جو ادھا حصہ رکھا، وہ صرف میرے لئے نہیں ہے۔ اکثر ہمارے ساتھی یا مخبر گرفتار ہو جاتے ہیں تو انہیں رہا کرانے کے لئے پولیس کو ہماری رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اسلحہ بھی خریدنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اخراجات اسی آدمی سے لے لئے جاتے ہیں۔“

میں کیونکہ ٹھاکرا بلونت سنگھ کے جسم میں تھا۔ جو راجپوت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راجپوت خاص طور پر میرا خیال رکھتے تھے۔ جواب میں مجھے بھی گویا خود ان کو کاہنہ درو غاہر کرنا پڑتا تھا۔ میں ہر معاملے میں ان کی پوری مدد کرتا تھا۔ پوری ضلع کے ایک راجپوت کی زمین پٹواری نے رشوت لے کر دوسرے کے نام کر دی۔ اس راجپوت نے مجھ سے فریاد کی۔ ”تمہارے ہوتے میری زمین چھین لی گئی ٹھاکرا! پٹواری کہتا ہے، تمہیں جس عدالت میں جانا ہے جاؤ، لیکن ٹھاکر! میں جانتا ہوں کہ مجھے کسی عدالت میں انصاف نہیں ملے گا۔“

”تم جاؤ، میں پٹواری کو دیکھ لوں گا۔ مطمئن رہو، زمین چھین لینے والے سے میں اس کی زندگی چھین لوں گا۔“ میں نے اس راجپوت سے صرف اتنا کہا۔
 ”ٹھاکرا! پٹواری کی جان لینے سے انصاف کس طرح ہو گا؟“ وکرم نے مجھ سے اس وقت یہ سوال کیا جب وہ راجپوت چلا گیا۔

”وکرم! تم بتایا کہ انصاف پر شک کرتے ہو۔“ روپا کو وکرم کی مداخلت غالباً گراں گزری۔
 ”روپا! یہ مجھ پر شک نہیں کر رہا بلکہ بات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔“ میں نے روپا سے کہا، پھر وکرم سے مخاطب ہوا۔ ”تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں دیکھے بھالے بغیر پٹواری کو سزا دے دوں گا۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلے میں اپنا اطمینان کروں گا کہ یہ زمین فریاد کرنے والے ہی کی ہے، پھر پٹواری کو مملت دوں گا تاکہ جس کی زمین ہے، اس واپس دلا دے۔ اس پر بھی پٹواری نہیں مانا تو.....“ میں نے اپنا فقرہ ادھر ادھر کرنا نقل پر ہاتھ پھیرا جس کا مطلب سمجھنا یقیناً وکرم کے لئے مشکل نہیں تھا۔
 ”پھر ٹھاکر! عدالتیں کس کام کی؟“ وکرم نے بحث کی۔

میں حدات آمیز انداز میں ہنس کر بولا۔ ”لڑکے! تمہارے دماغ سے ابھی تعلیم کی بو نہیں گئی۔ عدالتیں کون چلاتا ہے.....؟ حکومت..... انگریز..... اگر عدالت کا انصاف سچا ہوتا تو آزادی کا نعرو لگانے والوں کو جیلوں میں کیوں ڈالا جاتا؟ انگریز کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے کی بات کیوں ہوتی؟ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“
 ”مگر وہ انصاف کے لئے کسی کی جان نہیں لیتے بلکہ جان دینے کا سبق دیتے ہیں۔“ وکرم نے کہا۔

انگریز حکومت کی حمایت لینے پر میں نے وکرم کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولا۔
میں ایک صبح اپنے گروہ کے ساتھ کھاگاری نگر پہنچا تو یاد آیا کہ زمین کا حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ پٹواری نے واقعی بے ایمانی کی تھی اور اسے دی ہوئی مملت بھی ختم ہو چکی تھی۔
”تایا! ہم پٹواری کے گھر جا کر حساب صاف کر لیں گے۔“ روپا نے مجھ سے درخواست کی۔
”نہیں۔“ میں نے گھر سے دو فرلانگ دور انتظار کرنے کو کہا۔ ”اسے بال بچوں کے سامنے نہیں مارنا۔ ہم اسے باہر بلائیں گے۔“

اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پٹواری خود ہی گھر سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوٹا تھا اور رخ جنگل کی طرف تھا۔

”وکرم! تم اسے آواز دے کر ادھر بلاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔

میرے حکم کی تعمیل میں وکرم نے پٹواری کو آواز دی۔ پٹواری چونک اٹھا اور ہم لوگوں کی جانب دیکھنے لگا۔ ہم سبھی کے پاس رائفلیں تھیں اور ہم بیڑ کے نیچے کھڑے تھے۔ پٹواری شاید یہ سمجھ گیا کہ میں نے اسے جو دھکی دی تھی اس پر عمل کرنے آ پہنچا ہوں۔ میں نے اسے کانپتے ہوئے دیکھا۔
”ممکن ہے اسے ختم کرنے کے لئے گولی چلانا پڑے، یہ کام تمہیں کرنا ہے۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

وکرم کے چہرے پر میرا حکم سن کر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پٹواری آگے بڑھنے کے بجائے مڑ کر گھر کی طرف بھاگا۔ دوڑتے ہوئے اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور میں نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ سنسنائی ہوئی گولی چلی۔ پٹواری کے اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ سے گزر کر گولی اس کے سینے میں گھس گئی۔ پٹواری اس طرح الٹ گیا جیسے اسے سخت دھکا لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا۔ اپنے سینے کو اس نے ہاتھ سے دبا لیا۔ وکرم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اسی لمحے پٹواری کے گھر سے سنسنائی ہوئی ایک گولی میری طرف لپکی اور میرے پیچھے میں گھس گئی۔

”تایا پر گولی کس نے چلائی؟“ روپا چیخ اٹھا۔

اسی لمحے دوسری گولی چلی جسے روپا نے جھک کر ضائع کر دیا ورنہ اس گولی کا شکار ہو جاتا۔

اچانک میرے ساتھیوں نے پٹواری کے مکان پر گولیوں کی بارش کر دی۔ فائرنگ کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ نہ جانے کتنے کارٹوس ضائع ہو گئے۔ سب سے پہلے روپا پٹواری کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی دیکھا کہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پٹواری کا جوان بیٹا چت پڑا تھا۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ اس کی رائفل کچھ ہی دور پڑی ہوئی تھی۔ باہر باپ کی لاش پڑی تھی اور گھر میں جوان بیٹے کی لاش۔

”کتا!“ روپا نے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری۔ میں دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ”میرے تایا پر تو نے

گولی چلائی..... تیری یہ مجال۔“

فائرنگ کے باوجود اس گاؤں کے باشندوں میں سے کوئی بھی باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ روپا کا غصہ شاید

لٹھا نہیں ہوا۔ اس نے پٹواری کے جوان بیٹے کی لاش کو چار آدمیوں سے اٹھوا لیا۔ پھر ہم سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ چنبل کے کنارے پہنچ کر روپا نے پٹواری کے جوان بیٹے کی لاش کو جس طرح چیرا پارا، وہ مجھ سے اس کی محبت کا ثبوت تھا۔
مجھے ہتھار کون سلائی کرتا تھا اس سے میرے بیٹے تک لاعلم تھے۔ کچھ لوگ مجھے خوش کرنے کے لئے بھی بطور تحفہ ہتھار دیتے تھے۔

کھیزا راغور گاؤں کا ایک راجپوت مجھ سے ملنے آئے والا تھا۔ جنگل میں اس سے ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے اپنے کچھ خاص آدمیوں کو ساتھ رکھا۔ انہی میں وکرم بھی تھا۔ مہمان کے ساتھ ایک آدمی اور بھی آیا تھا۔ وکرم منہ پھیرے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہونیں پھر میں نے اپنے مہمان کو مخاطب کیا۔ ”آپ کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کیا خبریں ہیں؟“

اس موقع پر وکرم نے گردن گھما کر دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے جیسے مہمان کو دیکھ کر اس کے ذہن کو جھکا لگا ہو۔ میرا وہ مہمان ایک پولیس افسر تھا۔ وکرم کی حیرت میرے لئے بے معنی نہیں تھی۔ اسے یقیناً یہ توقع نہیں ہو گی کہ کوئی پولیس افسر بھی مجھ سے ملنے آ سکتا ہے۔

”ٹھاکر! ابھی پولیس کی طرف سے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میرے مہمان نے کہا۔
”کیپٹن شرمن اپنا بوریا مسز باندھ کر اپنے وطن واپس جا رہا ہے۔ اس کے بعد حالات کو ذرا سنبھالنا پڑے گا۔“ پھر میرے مہمان نے ایک صندوق کھولا اور اس میں سے ایک ٹی سی ایم گن نکالی۔ وہ گن اس نے مجھے پیش کی۔ ”یہ گن میں نے خاص طور پر آپ کے لئے حاصل کی ہے ٹھاکر! اس کے علاوہ صندوق میں ایک ہزار کارٹوس بھی ہیں۔“ صندوق وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

میں نے اس نذرانے کے بدلے میں بخشش دی۔ بخشش کے طور پر میں نے سونے کی گیارہ مہرس دی تھیں۔ نذرانہ اور بخشش کا تو محض نام تھے ورنہ یہ ایک سودا تھا۔ اسلحہ بچا اور خرید گیا تھا۔ پھر پولیس افسر کی نگاہ وکرم کی طرف اٹھی گئی۔

”غالباً یہ کوئی نیا آدمی ہے؟“ مہمان پولیس افسر نے وکرم کے بارے میں مجھ سے سوال کیا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی شناخت بھی کرنی ہے۔ یہ آپ ہی کے ٹھکے کا آدمی ہے۔“ وکرم اور پولیس افسر کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو میں نے کہا۔ ”یہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا، لیکن اب ہمارا ساتھی ہے۔“ میں نے پولیس افسر کو وکرم کے بارے میں بتایا۔

مہمان پولیس افسر کے چہرے پر مسرت کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بولا۔ ”اس نے اچھا کیا کہ آپ کے پاس آ گیا۔ یہاں یہ سکھ رہے گا۔“

پھر مہمان رخصت ہو گئے۔ دو روز کے بعد میرا ایک مخبر مجھ سے ملنے آیا۔

”ٹھاکر! وہ بوہری پولیس سے مل گیا ہے۔ آج کل وہ پولیس والوں کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔“ مخبر نے مجھے اطلاع دی۔

”اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”اس نے میرے بارے میں بھی پولیس کو مطلع کر دیا ہے۔ فوجدار نے مجھ سے بلا کر کہا ہے کہ بوہری پولیس سے مل گیا ہے اور میں بھی پولیس سے مل جاؤں ورنہ مجھے نقصان اٹھانا پڑے گا۔“ مجھ نے جواب دیا۔ میرے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ پولیس سے مل جانے والے کو میں کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔

”جاؤ! جا کر بوہری کو خبردار کر دو۔ اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ دو دن کے بعد وہ کیراگڑھ کے کٹاؤ میں مجھ سے ملے۔“ میں نے مجھ سے کہا۔

دو دن کے بعد میں نے کیراگڑھ کے کٹاؤ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پڑاؤ ڈالا۔

اب تک میں نے وکرم کو راکٹل نہیں دی تھی جسے وہ مستقل طور پر اپنے پاس رکھ سکتا۔ اس روز میں نے وکرم کی طرف ایک راکٹل بڑھائی اور بولا۔ ”لو یہ راکٹل! بہت دن بعد تمہاری مراد پوری ہو رہی ہے۔ آج وقت آئی گیا کہ تم آزمائش پر پورے اتر سکو۔“

وکرم نے انہی دو دنوں کے درمیان مجھ سے راکٹل رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے مجھ سے راکٹل لے لی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس کے ہاتھ کاپ رہے تھے۔

”ٹھاکر! مجھے کون سی مراد پوری کرنا ہے؟“ وکرم نے سوال کیا۔

اسی وقت بوہری دور سے آتا دکھائی دیا۔ روپا نے بھی اپنی راکٹل منہائی، مگر میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں روپا! یہ کام وکرم کو کرنا ہے۔“ پھر میں وکرم سے مخاطب ہوا۔ ”یہ جو آ رہا ہے، ہمارا تجربہ تھا، لیکن اب پولیس سے مل گیا ہے۔ تمہیں اس کو گولی مارنا ہے۔“

وکرم نے دور سے آتے ہوئے شخص کی طرف نظر اٹھائی، پھر چند لمحے بعد مجھ سے کہنے لگا۔ ”ٹھاکر! اسے صفائی کا ایک موقع تو دے دیں۔“

”تم اپنی مت چلاؤ! میں جو کہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ مجھے وکرم کے مشورے پر غصہ آ گیا۔

”ہر بار کوئی بہانہ بنا کر چھوٹ جاتا ہے۔ چل، راکٹل اٹھا۔“ روپا نے بھی ٹکڑا لگایا۔

وکرم نے جواب میں کچھ کہے بغیر راکٹل کی ٹال بلند کی۔

”نہیں وکرم!“ میں بول اٹھا۔ ”اس درخت کے عقب میں کھڑے ہو کر نشانہ لو۔ بوہری کو پہلے سے پتا نہیں لگتا چاہئے کہ اسے گولی ماری جا رہی ہے۔“

وکرم مشینی انداز میں اٹھ کھڑا اور درخت کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

بوہری جب تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ یہ وکرم کے لئے اشارہ تھا۔ بوہری یہی سمجھا ہو گا کہ اس طرح گویا میں اس کا استقبال کر رہا ہوں۔ معاً ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وکرم نے گولی چلا دی تھی۔ گولی بوہری کی گردن میں گھس گئی۔

”شاباش!“ میں نے وکرم کے نشانے کی تعریف کی۔ ”تم نے صحیح نشانہ لیا۔“

میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ پسینے سے بھگیا ہوا تھا۔ میری تعریف سن کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”پہلی بار ذرا دل پر اثر ہو گا۔ عادت ہو جانے کے بعد تمہارے ہاتھ راکٹل چلانے کے لئے بے

چین ہو جایا کریں گے۔“ میں نے مزید کہا۔

چند ہی روز بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بوہری بے گناہ تھا تو میں کھول کر رہ گیا۔ وہ دراصل پولیس سے مل جانے کا دکھاوا کرتا تھا تاکہ مجھے معلومات فراہم کر سکے۔ جس خبر نے اس کے خلاف چٹلی کھائی تھی، اسے بوہری سے عداوت تھی۔ اس نے اسی لئے بوہری کو میرے ہاتھوں ٹھکانے لگوا دیا تھا۔

”وکرم! اگر میں نے اس وقت تمہارا کمان لیا ہوتا تو اس بے گناہ کی جان بچ جاتی۔ اسے صفائی کا موقع ضرور دینا چاہئے تھا۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

بوہری کے ناحق مارے جانے کا مجھے بہت رنج تھا۔ میں نے اسی رنج میں سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ بے گناہ بوہری کے خلاف چٹلی کھانے والے تجربے میں نے کچھ ہی دن میں بدلہ لے لیا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ یوں گویا میرے دو تجربہ دارے گئے۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ اب میں نیتا رام کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا۔ دو مرتبہ میں کھیزا راتھور گاؤں میں چھاپہ مار آیا تھا مگر نیتا رام میرے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ ہاں میں نیتا رام کے کھیتوں اور حویلی کو خاصا نقصان پہنچا آیا تھا۔ نیتا رام دراصل پولیس کی نگرانی اور حفاظت میں تھا۔ میں نے تیسری مرتبہ چھاپا مارنے سے پہلے ایک خط بھیجا۔ میں نے اسے لکھا۔ ”نیتا رام! اگر تم نے آٹھ دن کے اندر اندر کھیزا راتھور نہیں چھوڑا تو پامال کر دیئے جاؤ گے۔“

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مجھے اپنے مخبروں سے تفصیل معلوم ہو گئی۔ پولیس نے نیتا رام کو بہت سمجھایا کہ وہ دھمکی سے خوفزدہ نہ ہو، میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکوں گا، مگر نیتا رام جو بیس گھنٹے کے اندر اندر ہی جی چھوڑ بیٹھا۔ اس نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ گویا میری آدمی جیت تھی۔ میں دراصل نیتا رام کو گاؤں سے نکال کر دوسری جگہ اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا، لیکن نیتا رام میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ وہ کچھ ہی دنوں میں صوبہ یوپی چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا جہاں میرے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔

☆=====☆

میرے گردہ میں شامل افراد کی تعداد اب خاصی ہو گئی تھی۔ گردہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تہما مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور میرے ساتھ آٹے تھے۔ پولیس بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ داری تھی۔

میرے گردہ میں شامل ہونے والے ایک نئے نوجوان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ میں نے ایک روز وکرم کو اس سے گفتگو کرتے دیکھا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں آڑ میں ہو کر سننے لگا۔ وکرم نے اس نوجوان سے پوچھا۔ ”تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ راہ کیسے اپنائی؟“

”پولیس کے مخبر اس طرح حکومت کرتے ہیں جیسے ان کے باپ کی حکومت ہو۔“ نوجوان نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک مرتبہ انہوں نے کسی وجہ کے بغیر مجھے سر بازار پیلا۔ میں پولیس چوکی میں فریاد کرنے گیا۔ جب میں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کا نام لیا تو میری رپورٹ لکھنے کی بجائے

پولیس والے مجھ پر ہنسنے لگے اور بولے کہ تم اس کی رپورٹ لکھانے آئے ہو۔ بات یہ ہو گی کہ اس کے ہاتھوں میں کھلی ہوئے لگی ہو گی۔ اسی کھلی کو دور کرنے کے لئے اس نے تمہیں مارا ہو گا۔ پھر ایک سپاہی گھنٹیا اور بازاری لہجے میں مجھ سے کہنے لگا کہ اس وقت تو دن کا اجالا تھا اس لئے تم صرف پٹ کر بیچ گئے۔ اگر تم رات کے وقت اسے کہیں تماثل جاتے تو نہ جانے اور کیا کرتی۔ بھگوان رکھے، تمہاری صورت شکل ایسی بری بھی نہیں کہ کسی کا دل نہ موہ سکے۔ یہ گھنٹیا مذاق میں برداشت نہ کر سکا۔ پھر ایک بار موقع دیکھ کر میں نے اس مخبر کے سر پر کھانسی کا بھرپور وار کیا اور فرار ہو گیا۔ پھر میں نے میاں کی راہ لی۔“

اس نوجوان کی چٹان کر و کر کم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اسے اب شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکوؤں کو ختم کرنے کے لئے دن رات سرگرداں رہنے والے خود لوگوں کو ڈاکو بنا رہے تھے۔ اگر اس نوجوان کے ساتھ انصاف کیا گیا ہوتا تو وہ ڈاکو نہ بنتا۔ وکر کم نے یقیناً آئی ڈی کے جھکے میں رہ کر تصویر کا صرف ایک رخ ہی دیکھا تھا، لیکن اب وہ میرے گروہ میں شامل ہو کر تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے گروہ میں شامل ایک نوجوان تو اس نوجوان سے بھی چھوٹا تھا۔ اس کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ ابھی اس کی ریشیں ہی نکلی تھیں۔

جن ڈاکوؤں تک پہنچنے کے لئے پولیس اپنے مخبر بناتی ہے، انہی مخبروں کے ظلم سے ڈاکو بننے کا دوسرا ثبوت یہ سولہ سال کا نوجوان تھا۔ اس نوجوان کا نام گھا تھا۔ گھا کی چچی کو پولیس کے ایک مخبر نے اغوا کر لیا تھا۔ اس دوران اس نے جوان عورت کی عزت و آبرو پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ گھا کے خاندان پر ٹکک کا ٹیکا لگ گیا۔ وہ بے آبرو ہو گیا۔ گھانے اپنے چار چھ دوستوں سے مدد مانگی۔ مخبر پر کاش کی پشت پر پولیس کا ہاتھ تھا۔ گھا غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ پھر اس سے ایک ایسا زہریلا فقرہ کہا گیا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ ”اب تو اس چاچی کو چھڑا کے کیا کرے گا۔ خراب کی جا چکی ہے۔ اچھا ہے، اسے مزے کرنے دے۔“

گھا یہ سن کر اپنے گھر گیا اور بھائی کو مخاطب کیا۔ ”تم میرے ساتھ آتے ہو؟ مجھے پرکاش کا حساب صاف کرنا ہے۔“

عمر میں گھا سے ڈیڑھ دو سال بڑا بھائی انکار نہ کر سکا۔ دونوں بھائی پرکاش کی تلاش میں روانہ ہوئے، مگر پرکاش کی بجائے ان سے پرکاش کا بھائی نکلا گیا۔ انہیں تو انتقام لینا ہی تھا۔ جوش ٹھنڈا پڑ جانے سے پہلے انہیں کچھ کر گزرنہ تھا۔ سو ان دونوں نے پرکاش کے بھائی کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ فرار ہونے سے پہلے وہاں موجود لوگوں سے کہہ آئے کہ فی الحال تو پینبل کے عماروں میں جا رہے ہیں، لیکن انہوں نے پرکاش کے خاندان کو ختم کرنے کی قسم کھائی ہے۔

گھا سے یہ کہانی وکر کم نے بھی سنی۔ اس کی آنکھوں سے بھی غصے کے سبب شعلے سے نکلنے لگے۔ ایک مرتبہ وکر کم ڈائری لکھ رہا تھا کہ میں پہنچ گیا اور وہ چونک اٹھا۔

”تمہاری ڈائری کے صفحے ختم ہونے لگے ہیں، دوسری منگوا دوں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں ٹھاکر! بہت لکھ لیا، دوسری ڈائری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وکر کم نے جواب دیا۔

”کبھی تمہیں اپنی ڈائری کی تحریر پڑھ کر مجھے شانا ہو گی۔“ میں نے وکر کم سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آپ جب کہیں ٹھاکر!.....! لہجے ابھی سناتا ہوں۔“ وکر کم بول اٹھا۔

”نہیں، آج نہیں پھر کبھی۔ ہم دونوں کو کل باہر جانا ہے، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“ میں نے لفظ ”دونوں“ پر زور دے کر کہا۔

اب تک میں کبھی وکر کم کو تمنا اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ وکر کم کے چہرے پر شاید اسی لئے حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

دوسرے دن صبح میں نے وکر کم کو راتفل اور کار تو سوں کی پٹی تھادی۔ وہ اس بات سے ظاہر ہے لاعلم ہی تھا کہ آج اسے ایک بڑے امتحان سے گزرنا تھا۔

”چلو، اب چلیں۔“ میں نے وکر کم سے کہا۔

وکر کم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں چلنا ہے۔ ہاں اس نے یہ سوال ضرور کیا۔ ”ٹھاکر! ڈائری لے لی؟“

میں ایک جھٹکے سے رک کر کھڑا ہو گیا اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”ٹھاکر! آپ..... آپ نے کہا تھا نا کہ جب ہم دونوں اکیلے ہوں تو ڈائری سناتا۔“ وکر کم گھبرا کر کہنے لگا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تمہاری طرح میں بھی اسی کی فکر میں رہتا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے بغلی تھیلی سے ڈائری نکال کر دکھائی۔

وکر کم شرمندہ سا ہو کر میرے ساتھ چلنے لگا۔

”راتفل میں کار تو س موجود ہے؟“ اچانک میں نے وکر کم سے سوال کیا۔

”ٹھاکر! آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“ وکر کم نے مجھ سے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں نے تمہیں راتفل لوڈ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

”راتفل کبھی خالی نہیں رکھنا چاہئے تاکہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر گولی چلائی جاسکے۔“

”فکر نہ کریں ٹھاکر! راتفل لوڈ ہے۔“ وکر کم نے جواب دیا۔

میں اور وکر کم پہلو پہلو چل رہے تھے۔ وکر کم میرے ساتھ چلتے ہوئے بونا دکھائی دے رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک مرتبہ وکر کم تھوڑا پیچھے رہ گیا تو میں نے رک کر فوراً پیچھے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے وکر کم سے پوچھا۔

”ٹک..... کچھ نہیں۔“ وکر کم نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

راتے میں ہم دونوں کو آرام کے لئے ایک جھونپڑے میں قیام کرنا پڑا۔ میرا شاندار استقبال کیا گیا جیسے ان لوگوں کے گھر کوئی راجہ آیا ہو۔ یوں بھی لوگ مجھے چہل کا راجا ہی کہتے تھے۔ میں نے اپنے میزبان سے سوال کیا۔ ”ارے تیری بیٹی تو سرال میں سکھی ہے؟“

”ٹھاکرا کنیا دان میں تمہاری دی ہوئی چیز ہو تو وہ کبھی ہی رہے گی۔“ غریب میزبان نے جواب دیا۔ میں نے اس غریب شخص کی بیٹی کے جیز میں زیورات چڑھائے تھے۔

سورج نصف النہار پر آیا تو ہم پچاس ساٹھ جھونپڑیوں پر مشتمل ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں بھی میرے پیچھے ہی ”ٹھاکرا آئے“ ٹھاکر آئے“ کا شور ہونے لگا۔ اس پر میں نے وکرم کو حیران سا دیکھا۔ وکرم کو اپنے ساتھ لئے میں ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ گاؤں کے کھیا نے ہمارا استقبال کیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ہم دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”خاموش کیوں ہو وکرم؟“ میں نے وکرم کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھاکرا! آپ کو گاؤں میں آتے سب نے دیکھا، مگر پھر بھی.....“

”پھر بھی مجھے ڈر کیوں نہیں لگتا؟ تمہیں اسی پر حیرت ہے نا؟“ میں نے وکرم کی بات کاٹ دی۔

”ہم اس گاؤں کے مہمان ہیں۔ اب ہماری سلامتی کی ذمہ داری گاؤں والوں کی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے کھیا کی طرف دیکھا۔ ”کیوں کھیا جی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی ہاں ٹھاکرا! بالکل بالکل۔“ کھیا نے جواب دیا۔

”جب تک ہم یہاں ہیں اس گاؤں کی طرف آنے والے دونوں راستوں پر دو دو میل کے بعد چار چار آدمی پہرہ دیتے رہیں گے کیونکہ کتے اچانک کہیں بھی آ سکتے ہیں۔“ میں بولا۔ پولیس والوں کو میں ایسے ہی القابات سے نوازتا تھا۔ ”کھیا جی! اسے خبر بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں ٹھاکرا! وہ دوپہر ڈھلنے تک آجائے گا۔“ کھیا نے نام لئے بغیر جواب دیا۔

کھانا کھا کر میں اور وکرم آرام کرنے چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ وکرم مجھے کچھ فکرمند سا نظر آ رہا تھا، شاید اس کی وجہ اجنبی ماحول تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وکرم بار بار میری طرف چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رانگل میرے پاس تھی جسے چپک کرنے کے لئے میں ایک بار اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر کچھ دیر بعد لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

معاذ مجھے محسوس ہوا کہ وکرم اٹھ رہا ہے تو میں نے آنکھیں کھول کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پیشاب کرنا ہے۔“ وکرم نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں بتایا۔

”جھونپڑے کے پیچھے چلے جاؤ۔“ میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

دوپہر ڈھلنے ہی کھیا نے مجھے بیدار کیا اور کہا۔ ”ٹھاکرا! وہ آ گیا ہے۔“

وکرم بھی یہ سن کر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حلقوں میں گردش کرنے لگیں اور جبرؤں کی رگیں کھینچ گئیں۔

”اسے اندر بھیج دو۔“ میری آواز میں نہ جلد بازی تھی نہ جوش تھا۔

ذرا ہی دیر کے بعد دہلا پٹلا ایک آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔ وہ دھوئی باندھے ہوئے تھا۔ دھوئی پر کرتہ اور کرتے پر اس نے واسٹ پین رکھی تھی۔ سر پر وہ کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی لگائے ہوئے تھا۔

اپنے حلقے سے وہ کپڑی کے کسی پیش کار کی طرح لگ رہا تھا۔

”نمتے!“ آنے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”آئیے ماسٹر جی! کہیں اسکول ادھورا چھوڑ کر تو نہیں چلے آئے؟“ میں نے آنے والے کو مخاطب کیا۔

”نہیں تایا جی! آج کل اسکول صبح کا ہے۔ لڑکوں کا امتحان لے کر آ رہا ہوں۔“ آنے والے نے جواب دیا۔

آنے والا ایک اسکول ماسٹر تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلیا تھا۔

تھیلے سے تین چار سردے نکال کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”بہت میٹھے ہیں یہ ٹھاکرا!“ اس نے سردے مجھے پیش کئے۔

”ماسٹر جی! تم تو سب کا امتحان لیتے ہو، آج ہمیں تمہارا امتحان لینا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈائری نکالی۔

”بیٹھ جاؤ! ہمارے تعلیم یافتہ ساتھی نے اس میں کیا لکھا ہے، پڑھ کر سناؤ۔“

ماسٹر ڈائری لے کر اس کے صفحات اٹھنے لگا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کیوں کیا الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے؟“ میں نے ہزار ہو کر کچھ دیر بعد پوچھا۔

”تایا جی! الفاظ تو موتی کے دانوں کی طرح صاف لکھے ہیں، مگر.....“ ماسٹر جملہ ادھورا چھوڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

”مگر کیا؟“ میں نے وکرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”زبان سمجھ میں نہیں آتی۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

اسی وقت وکرم ہنسنے لگا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار ہونے لگا۔

”ٹھاکرا! یہ ماسٹر صاحب کے بس کی بات نہیں۔ الفاظ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھے ہیں۔“ وکرم نے بتایا۔

”مختصر الفاظ میں لکھنے کو شارٹ ہینڈ کہتے ہیں۔ اس طرح صرف دو لفظوں میں پوری سطر آ جاتی ہے۔ یہ علم سب کو نہیں آتا۔“

”مجھے بھی معلوم ہے۔“ میں بولا۔ ”میں سمجھ رہا تھا کہ شاید ماسٹر کو شارٹ ہینڈ آتی ہوگی، لیکن تم نے شارٹ ہینڈ میں ڈائری کیوں لکھی؟“

”ٹھاکرا! میں نے ایسا اس لئے کیا کہ اگر ڈائری غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کوئی اسے پڑھ نہ سکے۔

اس طرح اپنا راز باہر نہیں جاسکتا۔ آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیا ہے تو مجھے بھی ہر طرح چوکنا رہنا چاہئے۔“

وکرم نے جواب دیا۔

میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ ماسٹر چلا گیا تو کھیا کہنے لگا۔ ”ٹھاکرا! پونم کا مہینہ آ رہا ہے۔

مہادیو کی آرتی سوموار کو آپ کے ہاتھوں اتاری جائے تو اچھا ہے۔“

”ٹھیک ہے، مگر یہ بات ابھی تو چھپائے ہی رکھنا۔“ میں نے جواب دیا، پھر وکرم کی طرف دیکھا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو وکرم؟“

”پونم آرہا ہے اس لئے مجھے رادھا یاد آ رہی ہے۔“ وکرم نے بتایا۔

”رادھا کون؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ میری منگیت ہے ٹھاکر!“ وکرم بولا۔ ”میری طرف سے کوئی خبر نہیں گئی اس لئے وہ بے چاری فکر مند ہو گئی۔“

”تمہیں اس کے پاس اپنی خیریت کی خبر بھیجنا ہے؟“ میں نے معلوم کیا، پھر خود ہی کہا۔ ”اسے خط لکھ دو۔“ اس کے بعد کھیا سے میں بولا۔ ”اسے ایک پوسٹ کارڈ دو۔“

”ٹھاکر! اگر میں نے پوسٹ کارڈ لکھا تو شارٹ ہینڈ میں لکھنا پڑے گا کیونکہ کسی نے پڑھ لیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“ وکرم کہنے لگا۔

”تمہاری منگیت شارٹ ہینڈ جانتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، اس نے مجھی سے سیکھی تھی۔“ وکرم نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد کھیا نے پوسٹ کارڈ منگوا دیا اور وکرم نے اس پر شارٹ ہینڈ میں کچھ لکھ دیا۔

”کیا لکھا تم نے؟“ میں نے پوسٹ کارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم کیا۔

”میری فکر نہ کرنا۔“ وکرم پوسٹ کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔ ”شکر بھگوان کی کپا (سہیانی) ہوئی تو جلد ملاقات ہوگی۔“ پھر وکرم نے پوسٹ کارڈ پر ہندی میں رادھا کا پتا لکھا۔ وکرم سے پوسٹ کارڈ لے کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”چلو، ذرا باہر گھومتے ہیں۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

اس جھوپڑی کے پیچھے پہنچ کر میں نے ایک سردا اپنے ہاتھ سے اٹھایا، پھر دائیں ہتھیلی اونچی کی جس پر سردا رکھا تھا اور کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تیری نشانے بازی کا امتحان لینا ہے۔“ میں نے وکرم کو مخاطب کیا اور اس سے تقریباً پندرہ گز دور کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھنا، سردے کا نشانہ لینا، میرا ہاتھ نہ چھید دینا!“

وکرم پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا وہ ہاتھ کانپنے لگا جس میں رانفل تھی۔ ”چلو نشانہ لو۔“ میں زور سے بولا۔

معا میں نے وکرم کو ہاتھ سے رانفل پھینکتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”نہیں ٹھاکر، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔“

یہ سن کر میں مسکراتا ہوا وکرم کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر رانفل زمین سے اٹھالی۔ پھر میں نے اچانک رانفل کی نال وکرم کے سینے پر رکھ دی۔ ”تیرا امتحان پورا ہوا، نیسے یاد کرتا ہے یاد کر لے۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا۔“ اس کے بعد وکرم کے سینے کا نشانہ لئے ہوئے میں چند قدم پیچھے ہٹا۔

میں نے دیکھا کہ وکرم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت میں نے رانفل کا ٹریگر دبا دیا اور

زبردست دھماکہ ہوا۔ اسی کے ساتھ میں زور سے ہٹا۔

وکرم اب بھی اپنی جگہ زندہ سلامت کھڑا تھا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ رانفل خطا ہو گیا ہے، مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

”کیا ڈر گیا؟“ میں نے قریب پہنچ کر اس کی پشت تھپکی۔ ”اس بیلٹ میں نقلی کارٹوس ہیں کیونکہ وہ تیرا امتحان لینا تھا کہ تو تنہائی میں بھی میرا وفادار رہتا ہے یا نہیں۔“

☆=====☆

پونم کے سینے کے پہلے پیر کو دوسرے کے بعد اپنے ساتھیوں کو لے کر میں اس گاؤں کی طرف روانہ ہوا جس کے کھیا نے آرتی کے وقت آنے کا مجھ سے وعدہ لیا تھا۔

”روپا! ہمیں جلدی کرنا چاہئے کیونکہ شام ہو رہی ہے۔ مادیو کی آرتی میں دیر نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے روپا سے کہا۔ ہندوؤں کے درمیان اتنے دن رہنے کی وجہ سے میں ان کے مذہبی عقائد اور رسوم سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے میں نے تیز چلنے کو کہا۔

مندر ابھی تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا کہ اچانک رانفل کا دھماکہ سنائی دیا۔ میرا پورا گردہ چونک کر یک دم ساکت ہو گیا۔ میں نے روپا کی طرف دیکھا۔ جسے جو آڑ ملی اس کے پیچھے پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ روپا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”نایا! کتے ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ اس کے لمبے میں غصہ تھا۔

”کس نے مخبری کی؟“ میری آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے خون اتر آیا۔ ”ہماری بیباں آمد کے متعلق کھیا کے سوا سب لاعلم تھے اور وہ مخبری نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا بیٹا ہمارے ساتھ ہے۔“ میں نے سوچا، بس وقت آرتی کا پروگرام بنا تھا، وکرم بھی موجود تھا۔ میں بنے وکرم کو گھور کر دیکھا۔ اسی وقت مخالف سمت سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ کئی گولیاں میرے سر پر سے گزر گئیں۔ ”سب بکھر جاؤ۔“ یہ کہتے میں گر جا۔ پھر میں نے روپا سے کہا۔ ”وکرم پر نظر رکھنا۔ مجھے اس پر شک ہے۔“

روپا، وکرم کی تلاش میں کچھ دور ہٹ گیا۔

پھر میں نے پولیس کی فائزنگ کا جواب دیا اور باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ میرے تمام ساتھی، پولیس کی فائزنگ کا جواب دینے کے لئے محفوظ مقامات پر چھپ گئے۔ اچانک پولیس سے مقابلہ ہونے کی صورت میں عموماً میں فرار ہوتا، پسند نہیں کرتا تھا۔ اس طرح پھنس جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ روپا اور وکرم کے درمیان چوہے اور ملی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ دونوں زمین سے سینہ لگائے آگے بڑھ رہے تھے۔ سر اٹھانے کی صورت میں وہ پولیس کی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ اس دوران ایک سپاہی، روپا کی نظر میں آ گیا۔ اس نے فائزنگ کے سپاہی کو ختم کر دیا۔ اتنی دیر میں وکرم دور نکل گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور میں بھرا ہوا تھا۔ صوبیدار مجھ سے فرار ہونے کے بارے میں بولا تو میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ بلونت سنگھ کے جسم کے ناتے وہ میرا بیٹا تھا۔ روپا، وکرم پر ہاتھ ڈالنے کے پکر میں تھا۔ درمیان میں زخمیوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق مقابلے پر کیپٹن شرمن ہی تھا۔ اس بہادری کے ساتھ وہی عیار انگریز لڑاتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کیپٹن شرمن چھوٹی سی پھاڑی کے

جوان بیٹوں کا انتقام لینے کے لئے ہمیں ہر حال میں نیتا رام کو تلاش کرنا پڑے گا۔" میرا یہی خیال تھا کہ نواب سنگھ کے سینے میں انتقام کی آگ بجھی نہیں۔ میرا خیال درست نکلا۔

"آپ کچھ دن آرام کریں۔ نیتا رام کو ختم کرنے کا کام مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے اسے تسلی دی، پھر پڑا طمیتان لہجے میں بولا۔ "پہلے تو ہمیں بھرت کی شادی کرنا ہے۔ ہم جونت کے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کریں گے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" نواب سنگھ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ گھر میں پوتے جوان ہو چکے ہیں۔" پھر وہ مسکرایا۔ "دشمن سے انتقام لینے کے ساتھ ساتھ اب ہمیں بچوں کی شادی بیاہ کا حساب بھی رکھنا پڑے گا۔"

ڈاکوؤں سے میں نے بڑی دولت کمائی تھی۔ اس سے میں نے گڑھی کی صورت بدل دی۔ رکنی اس طرح خوش تھی جیسے اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میرے گھر واپس آ جانے سے روٹھی ہوئی ہمارے جیسے پھر لوٹ آئی تھی۔ جونت کے بیٹے بھرت کی شادی کے لئے زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔

نئی حکومت ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ اسے ابھی انتظامی امور کو چھوڑ کر اتنی فرصت نہیں تھی کہ ڈاکوؤں سے نبرد آزما ہو کر اپنے لئے درد سر مول لیتی۔ میں بڑے رعب سے گڑھی میں رہتا تھا۔ اس کے باوجود مصلحت میں نے ابھی اپنا گروہ ختم نہیں کیا تھا۔ میں پہلے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پولیس میرے سلسلے میں کیا قدم اٹھاتی ہے۔

اسی عرصے میں میں نے بھرت سنگھ کی شادی کر دی۔ گڑھی میں جو مسمان آئے، ان میں وہ پولیس افسران بھی تھے جن سے میرے تعلقات تھے۔ میں نے ان سے مختلف سوالات کئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ شادی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی اور پھر یہی ہوا۔

میں نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ پانچ شاندار کادیں اور تین ہاتھی برات میں آگے آگے تھے۔ اس شادی میں سبھی جاننے والوں نے شرکت کی۔

شادی کے بعد ناچ گانے اور کھانے کی دعوت میں تحصیل دار، زمیندار، ڈاکٹر اور پولیس کے افسران تک موجود تھے۔ اسی عرصے میں مجھے خدار و کرم کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے ڈاکو سمجھ کر مار دیا تھا۔

کچھ بڑے لوگوں نے مجھ سے اپنے تعلقات استوار رکھنے کی غرض سے اپنے نمائندے شادی میں بھیجے تھے۔ وہ جیسے یہ بات بھول ہی گئے تھے کہ میں ڈاکو ہوں اور میری گرفتاری پر حکومت کی طرف سے انعام مقرر ہے۔ میں کہ جسے گرفتار کر کے پھانسی کا حکم سنایا جاسکتا تھا، بڑی دھوم دھام سے گویا اپنے پوتے کی شادی کر رہا تھا۔

ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد میں کھلے عام کھڑا راٹھور واپس آ گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نئی حکومت میرے جرائم معاف کر دے گی، مگر میرا اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔

نئی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی راجاؤں اور نوابوں پر ہاتھ ڈالا تھا تو پھر وہ مستحکم ہونے کے بعد

نیچے کھنڈر میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔

معا کی نے میرا نشانہ لے کر فائر کیا، مگر میں بال بال بچ گیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے سنٹائی ہوئی گزر گئی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ میرے اوپر پولیس کی طرف سے فائر نہیں ہوا تھا۔ مجھ پر گولی چلانے والا خدار و کرم ہی ہو سکتا تھا۔ گولی کی سمت سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ میں نے وکرم پر تین چھار فائر جھونک دیئے۔ روپا بھی غضب ناک ہو گیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اس نے وکرم کی طرف فائرنگ شروع کر دی۔

پولیس کی جانب سے اچانک فائرنگ بند کر دی گئی۔ اس موقع کو میں نے گنوا یا نہیں اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو گیا۔

☆=====☆

آزادی ملنے کی خوشی میں بھارت سرکار نے ملک بھر کی جیلوں سے بہت سے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس سے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ کو بھی فائدہ پہنچا جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہا تھا۔ میں جب گڑھی پہنچا تو رکنی نے خوش خبری سنائی۔ "جیٹھ جی رہا ہو گئے۔"

"سارے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرو۔" میں نے اظہار مسرت کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ نواب سنگھ مجھ سے پوچھے گا کہ اپنے اور اس کے بیٹے کا پورا انتقام کیوں نہیں لیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا کہ ابھی تک دشمن کیوں زندہ ہے؟

راچپوت کیسے ہی حالات میں کیوں نہ ہوں مگر ان کے لو میں جو ایک کاٹ ہوتی ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے تسلی رام، اس کے بھانجوں اور بھتیجیوں کو ختم کر دیا تھا لیکن تسلی رام کا بیٹا نیتا رام اب بھی زندہ تھا۔ دشمنی کا حساب اس وقت تک بے باقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ نیتا رام کو بھی ٹھکانے نہ لگا دیا جاتا۔

نواب سنگھ کی طرح ممکن ہے حکومت میرے جرائم کو بھی معاف کر دیتی مگر ابھی تو میرے ہاتھوں متعدد آدم زادوں کو سفر آخرت پر روانہ ہونا تھا۔ پھر یہ کس طرح ہو جاتا۔

درازا کے بعد نواب سنگھ نے مجھے، یعنی اپنے بھائی بلونت سنگھ کو دیکھا تو سینے سے لگالیا۔ "چھوٹے! تم نے بڑا نام پیدا کیا۔ ہر علاقے میں تمہاری شہرت ہے۔ میں نے تو قید ہی میں اپنی زندگی رائیگاں کر دی۔" نواب سنگھ نے محبت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کے سفید بال بڑھاپے کی چٹلی کھا رہے تھے۔ میں اس کے کیم خیم جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"بڑے بھائی! میں نے آپ کو جیل سے رہا کرانے کے بارے میں کئی بار سوچا، مگر وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا اس لئے مجبور ہو گیا۔" میں بولا۔

"اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔ جہاں انسان کے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے، بھگوان کے ہاتھ پہنچ جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" پھر چند ہی لمحے بعد نواب سنگھ کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر کھچاؤ آ گیا۔ معاذ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے

لکھنؤ میں اعلیٰ سرکاری افسران جمع ہوئے۔ چنبل کے غاروں کا ظلم ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا جوش بڑھ گیا۔ طے کیا گیا کہ اگر اس سلسلے میں پولیس ناکام رہے تو یہ کام فوج کے سپرد کیا جائے گا، لیکن ٹھاکر بلونت سنگھ کو حکومت کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گی۔ حکومت عوام کے سامنے جواب دہ تھی۔ ارکان حکومت عوام سے ووٹ لینے جائیں گے تو عوام کو کیا منہ دکھائیں گے؟ حکومت کے کرتا دھرتا سوچنے لگے۔ پولیس کو اس سلسلے میں ہر طرح مستعد اور تیار کیا گیا تاکہ کسی بھی قیمت پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو ختم کر دیا جائے۔ میرے گروہ کی تلاش میں آخر کار پولیس متحرک ہو گئی۔

چنبل کے کنارے پوری ایک گارو لگا دی گئی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں کھیزا رانھور میں داخل ہو کر بتا رام کا بال بیکانہ کر سکوں۔ اب یہ معاملہ پولیس کی عزت کا مسئلہ بن چکا تھا کہ ایک ڈاکو ان کے علم و اطلاع کے باوجود کسی شخص کو قتل کر دے۔

تمام خبریں مجھ تک پہنچ گئیں تو میں نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا اور روپا سے کہا۔ ”اب صحیح معنوں میں کھیل شروع ہوا ہے۔ حکومت اپنی قوت آزمانا چاہتی ہے۔“

”تایا! ہمیں تو اسی میں مزہ آتا ہے۔“ روپا جواب میں کہنے لگا۔ ”مرنا تو ایک دن ہے۔ سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم لڑتے ہوئے مریں اور یہی غار ہماری آخری آرام گاہ بن جائیں جہاں ہم نے بہت سی یادگار راتیں گزاری ہیں۔“ روپا کا جواب اس کے مزاج کے مطابق تھا۔

میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ بہت جلد میرے گرد گھیرا تنگ کیا جائے والا ہے۔ میں نے سوچا! آئندہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی محبوبہ رکنی کی تھی۔ اپنے گروہ کو از سر نو بنانے اور اسلحہ جمع کرنے کی غرض سے میں تقریباً تین مہینے سے کھیزا رانھور میں جاسکا تھا۔ رکنی مجھے بہت یاد آ رہی تھی۔

میں نے اپنے اس خیال کا اظہار روپا سے کیا کہ گاؤں جانا چاہتا ہوں تو وہ بولا۔ ”تایا! ایسا نہ کریں۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ گاؤں تک پہنچنے کے تمام راستوں کو پولیس والوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

اگر میں اپنی محبوبہ ہی سے نہ مل سکوں تو پھر میرے یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ میں نے سوچا۔ پھر بلونت سنگھ کے جسم ہی میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر میں یہ باتیں روپا سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔ اس طرح میں بلا خوف و خطر رکنی سے مل کر غاروں میں بحفاظت واپس آ سکتا تھا۔

اس وقت ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔

”چل روپا! میرے ساتھ چل۔“ سوچتے سوچتے اچانک میں نے روپا کو مخاطب کیا۔

”کہاں تائیا؟“ روپا نے حیرت سے پوچھا۔

”جہاں بھی میں تجھے لے جاؤں۔“

”ٹھیک ہے تائیا!“ روپا نے اقرار میں سر ہلایا۔

مجھ جیسے شخص کو کیسے نظر انداز کر دیتی جو راجاؤں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کیا قانون میرے سامنے مجبور تھا کہ میرے خوف سے بتا رام اپنے آبائی گاؤں میں بھی نہ آ پاتا؟ ایک بار پھر کھٹ پٹ شروع ہو گئی اور مجھ تک نئی نئی اطلاعات پہنچنے لگیں۔ مجھے جیل بھیجنے کا جوش پیدا ہونے لگا، لیکن اب میں جیل جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے نئی حکومت کی زیادہ پردہ نہیں تھی۔ چنبل کے کٹاؤ دار غار اب بھی سلامت تھے۔ اعلیٰ افسران کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر ڈرنا کیسا؟ میں نے ایک دن بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ سے کہہ ہی دیا۔ ”بڑے بھائی! گھر کا سکھ اب کاٹنے لگا ہے۔ آپ اور باپو سب گھروالوں کی دیکھ بھال کیجئے گا، مجھے تو چنبل کے غاروں میں رہنا پسند ہے۔“

”مگر کیوں چھوئے؟“ نواب سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے بڑے بھائی، مجھے پتا چل چکا ہے کہ بہت جلد پولیس میرے خلاف حرکت میں آنے والی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”تمہیں کسی نے غلط خبر تو نہیں دے دی؟“

”نہیں، خبر بالکل درست ہے۔ جو پولیس افسران میرے ہی خواہ اور دوست ہیں، انہی کی طرف سے مجھے یہ خبر ملی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن یہ یہ تو بہت برا ہوا۔“ نواب سنگھ نے اظہار افسوس کیا۔

”اب جو بھی ہو، قسمت کے فیصلے کو تو ہر حال میں قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا چھوئے کہ تم غاروں میں بھٹکتے پھرو اور میں گڑھی میں عیش کروں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ بہت دن سے میرے ہاتھوں میں بھی رانفل چلانے کے لئے کھجلی ہو رہی ہے۔“ نواب سنگھ پر جوش آواز میں بولا۔

”مجھ سے ہرگز یہ گوارا نہیں ہو گا کہ میرے بڑے بھائی کی آخری عمر بھٹکتے میں گزرے۔“ میں نے نواب سنگھ کو سمجھایا۔

نواب سنگھ کو میں اپنے ساتھ اس لئے بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ عیاش تھا۔ گروہ کے دوسرے افراد بھی اس کی عیاشی سے متاثر ہو سکتے تھے۔ بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے میں نواب سنگھ پر اس معاملے میں سختی بھی نہ کر پاتا۔ اس طرح گروہ کے دوسرے افراد کو بھی چھوٹ مل جاتی جو میں نہیں چاہتا تھا۔

”آپ کچھ دن یہاں ٹھہریں۔“ میں نے نواب سنگھ سے مزید کہا۔ ”بتا رام کے گاؤں آنے کی افواہ گرم ہے۔ اس وقت آپ گاؤں میں ہوں گے تو ہماری طاقت دگنی ہو گی۔“

یہ بات نواب سنگھ کی سمجھ میں آگئی اور وہ گاؤں میں رہنے پر راضی ہو گیا۔

اس طرح میری زندگی دوبارہ اسی ڈگر پر چل پڑی جسے میں فراموش کر آیا تھا۔

چند ہی روز میں میرے نام کا ڈنکا پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ بجنے لگا۔ پولیس کے محکمے کو اسی لئے فوری طور پر میرے خلاف عملی اقدام کی فکر ہوئی۔ مجھے اطلاعات ملتی رہیں۔

میں آج ہی رات کھڑا راتھور پہنچنا چاہتا تھا، مگر پہلے اس کے لئے بندوبست کرنا تھا۔ میں اس وقت وہی بندوبست کرنے غاروں سے نکلا تھا۔ جلد ہی کوئی نصف گھنٹے کے بعد ہم اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں پولیس نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ راستے میں روپا کو میں نے اپنے خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اندھیرے میں خیموں کے بیولے دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ مٹا میں نے دور سے بھاری قدموں کی چاپ قریب آتے سنی تو چونک اٹھا۔ آنے والا تھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے روپا کا ہاتھ پکڑا اور تیزی کے ساتھ ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد آٹھ دس پولیس والے کچھ فاصلے سے گزرے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پولیس کی ایک گشتی پارٹی تھی۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ ایسی ہی کچھ اور پارٹیاں بھی گشت پر ہوں۔ ظاہر ہے ان پارٹیوں کے گشت کا مقصد خطرے کے وقت اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دینا ہو گا جو آرام سے سو رہے تھے۔ ان کی وجہ سے میرے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا، پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔

پولیس پارٹی دور نکل گئی تو میں نے جینی میں لگا ہوا خنجر باہر کھینچا، پھر روپا سے سرگوشی کی۔ ”پہلے اسی خیمے کو دیکھتے ہیں، ممکن ہے اس میں زیادہ پولیس والے نہ ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے خنجر کی نوک خیمے کے کپڑے میں اتار دی۔ پھر جب پھٹے ہوئے حصے کے شکاف سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو مایوسی کے ساتھ سر ہلا کر رہ گیا۔

”کیا ہوا تانا؟“ روپا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”میں دس چندرہ پولیس والے ایک قطار میں سو رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کوئی ایسا

خیمہ تلاش کرنا ہے جہاں دو تین پولیس والوں سے زیادہ نہ ہوں۔“

”یہ تو مشکل لگتا ہے تانا۔“ روپا بولا، پھر ایک تجویز پیش کی۔

روپا کی تجویز خطرناک تو ضرور تھی، مگر اس پر عمل کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس تجویز سے زیادہ خطرہ کسی ایسے خیمے کی تلاش ہوتا میں جس میں دو تین پولیس والوں سے زیادہ نہ ہوتے۔ اس تلاش میں ہم خیموں کے درمیان اور اطراف گشت کرنے والی کسی پولیس پارٹی کی نظر میں آ جاتے تو پھر ہمارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ ہمارے چاروں طرف پولیس والے ہوتے اور ہمیں با آسانی شکار کر لیا جاتا۔

”ٹھیک ہے روپا۔“ میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

خیمے کے شکاف کو وسیع کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ روپا اور میں اب اس شکاف سے اندر داخل ہو سکتے تھے۔

اس شکاف کے قریب ہی جو دو پولیس والے سو رہے تھے، ہم دونوں ان پر اس طرح جھپٹے جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ہماری کامیابی کا دارومدار اس پر تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی آواز نہ نکال سکے۔ میں نے اپنے شکار کے سینے پر چڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبا لی اور اس وقت تک دباؤ برقرار رکھا جب تک میرے شکار کا جسم ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔ ایسا ہی یقیناً روپا نے بھی کیا تھا۔ دونوں

پولیس والے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ ہم کوئی دھیمی سی آواز پیدا کئے بغیر ان کی لاشیں خیمے کے شکاف سے باہر نکال کر لے آئے۔ روپا کو معلوم تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔

جلدی جلدی ہم نے ان دونوں کی وردیاں اتار لیں۔ مرنے والوں میں سے ایک قدرے بھاری جسم کا تھا۔ اس کی وردی میں نے پین لی۔ دوسرے مقتول کی وردی روپا کے کام آئی۔ اس طرح وہ بلا خوف و خطر غاروں کی طرف واپس جاسکتا تھا۔ روپا کو وہیں سے واپس جانا تھا اور مجھے کھڑا راتھور پہنچنا تھا۔ عورت بھی قدرت کی عجیب مخلوق ہے کہ جس کے حصول کی خاطر مرد اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ مجھ سے بھی ایک جن زاد ہو کر ایسی ہی حماقت سرزد ہوئی تھی۔

لاشوں کو وہیں خیمے کے اندر ڈال کر ہم دونوں اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پولیس کی وردی جسم پر ہونے کے سبب اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک جانب سے کسی کی بھاری آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

میں نے تیزی سے ادھر پلٹ کر دیکھا۔ مجھے ایک پولیس پارٹی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں رک گیا کہ ان کی نظر میں آچکا تھا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اس وقت کسی پولیس والے کا تنہا کسی طرف جانا اسے بہر حال مشتبہ بنا سکتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

”کدھر جا رہے ہو تم اس وقت؟“ ایک پولیس والے نے مجھ سے سوال کیا جو اس پولیس کا نگراں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر موجود وردی سے میں سمجھ گیا کہ وہ اے ایس آئی ہے۔ میں بہر حال ایک کانٹیل کی وردی پہنے ہوئے تھا اور اس سے رتبے میں کم تھا۔

”سر! آپ کی بہت مہربانی ہوگی، اگر مجھے جانے دیں۔“ میں عاجزی سے بولا۔

”لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟“ اے ایس آئی نے حیرت سے پوچھا۔

”کھڑا راتھور گاؤں، اپنے بیوی بچوں سے ملنے۔ تین مہینے سے میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ سر! آپ یقین کریں کہ میں صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔“

”ہوں۔ تو یہ پکڑ ہے۔“ اے ایس آئی نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا، پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ایک شرط پر تمہیں جانے دوں گا کہ تم سچ بول دو۔ بچوں کی زیادہ یاد آ رہی تھی تمہیں یہ بیوی سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا؟“

”ویسے تو سر، بچوں کی یاد بھی آ رہی تھی، لیکن.....“ میں نے شرمندہ ہونے کی بھرپور ادارکاری کی اور دانست اپنا جملہ ادھر ادھر اچھوڑ دیا۔

اے ایس آئی ہنس پڑا اور بولا۔ ”اچھا جا، کیا یاد کرے گا، عیش کر، مگر صبح سے پہلے ضرور واپس آ جانا۔“

”بالکل سر، بالکل۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

یوں اس پولیس پارٹی سے میری جان چھوٹی۔ ان پولیس والوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا

ہو گا کہ جس ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے انہوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے، وہ انہیں بڑی صفائی سے بے وقوف بنا کر چلا گیا ہے۔

میں جب اپنی گڑھی میں داخل ہو کر گھر کا صدر دروازہ کھلو کر اندر پہنچا تو سبھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ میری آمد کی وجہ سے سبھی جاگ اٹھے تھے۔ بھرت کی نو بیاہتا بیوی نے آکر میرے پیچھے چھوئے۔ رکتی ایک طرف کھڑی تھی اور میری نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”کچھ دیر آرام کر کے میں چلا جاؤں گا، رکتی دروازہ بند کر لے گی۔“ میں نے پہلے ہی سے کہہ دیا۔

”ہاں چھوٹے، صبح سے پہلے تمہاری واپسی ضروری ہے، بھول نہ جانا۔“ نواب سنگھ کہنے لگا۔

”یہ بات بھی بھلا بھولنے والی ہے۔“ میں یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رکتی میرے پیچھے پیچھے تھی۔

”کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی رکتی میری بانہوں میں سٹ آئی۔

”پہلے میرے پیٹوں کی خیریت تو دے دو۔“ وہ بولی۔

”سب خیریت سے ہیں، ایک میں ہی خیریت سے نہیں تھا۔“

”کیوں، کیا ہوا؟ بھگوان نہ کرے طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی تھی؟“ اس کے لہجے میں بلا کا بچا تھا۔

”طبیعت تو تمہیں دیکھ کر خراب ہو رہی ہے۔“

واپسی میں پھر دو پولیس پارٹیاں ملیں، مگر کسی نے مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ ان میں سے ایک ونی پارٹی تھی جو پہلے جاتے وقت ملی تھی۔

اس وقت تک سورج نکلنا نہیں تھا جب میں غاروں میں پہنچ گیا تھا۔

رکتی سے ملاقات کے بعد میرے دل کو بڑی حد تک قرار آ گیا تھا۔ سو میں، پولیس کی نقل حرکت کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ میرے تجربوں کی دوڑ دھوپ بڑھ گئی۔ مجھے تمام اطلاعات مل گئیں کہ پولیس کس طرف سے آگے بڑھ رہی ہے اور اس نے کہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔ کٹاؤ کے اندر میں بار ٹھکانے بدلنے لگا۔ پھر یو پی میں مجھ پر زیادہ دباؤ بڑھا تو میں مدھیہ پردیش میں جا گھسا۔ میں نے گواہ میں اپنا ٹھکانا بنایا اور پھر وہاں کے دیہات پر حملے کرنے لگا۔

میں کچھ ہی دن میں گوالیار پولیس کے لئے دردسہ بن گیا۔ اخبارات کے صفحات میری لوٹ مار پر قتل و غارت گری کی خبروں کے لئے زیادہ جگہ دینے لگے۔ حکومت پر تنقید ہونے لگی۔ لوگ پوچھ رہے تھے کہ کیا ہماری حکومت، پولیس اور فوج سب کے سب سو رہے تھے؟

اگرے کا ایڈیشنل ایس پی گوریلا پولیس کی ایک گارڈ لے کر میری تلاش میں روانہ ہوا۔ اس اپنے خیال کا اظہار کیا تھا کہ ڈاکوؤں کا مقابلہ خود انہی کے انداز میں کیا جائے۔ بھیڑ کا ایک پولیس اہل چیل بھی میدان میں اترا کہ میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔

میرا پہلا ٹکراؤ مہادیر گاؤں کے قریب پٹیل ہی سے ہوا۔ اطلاعات کے مطابق حکومت بڑی بے چینی سے میری گرفتاری یا موت کی خبر سننے کا انتظار کر رہی تھی، مگر مہادیر گاؤں کے ٹکراؤ میں بڑی صفائی سے میں چکر دے کر نکل گیا۔ اگرے کا ایس بی مہادیر اور پٹیل دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ان دونوں نے مشترکہ طور پر مجھے گھیر کر ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر وہ کامیاب تو اس وقت ہوتے جب میں بے خبر ہوتا۔ میرے خبر پوری تن دی سے مجھے درست اطلاعات فراہم کر رہے تھے۔ مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ مہادیر اور پٹیل باری باری مجھے دونوں طرف سے گھیریں گے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پٹیل مجھ پر ایک طرف سے دباؤ ڈالے گا تو میں لازماً مخالف سمت جاؤں گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں تیسری سمت بچ کر فرار ہو گیا۔ پٹیل سے میرے ٹکراؤ کی اطلاع ملتے ہی مہادیر نے حفظ ماتقدم کے طور پر عقب سے پیش قدمی شروع کر دی، لیکن اس وقت تک میں بہت دور جا چکا تھا۔ یو پی کے علاوہ صوبہ مدھیہ پردیش نے بھی میرے خلاف طاقت آزمائی شروع کر دی۔ گوالیار کے کرٹل مکمل سنگھ کی کمان میں فوج کی ایک تربیت یافتہ کمپنی نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ دن رات یہ تعاقب جاری رہتا تھا کہ کہیں تو مجھ سے ٹکراؤ ہو گا ہی۔

میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ میں ایک رات بھی کہیں چین سے نہیں گزار سکتا تھا۔ اس دوران مجھے کہیں ڈاکا ڈالنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں ہر وقت پولیس کی دسترس سے دور رہنے کے لئے فوسر رہتا تھا۔

بار بار پولیس سے میرا مقابلہ ہوتا، سخت لڑائی ہوتی۔ پھر جب کار توں کم پڑنے لگتے میں فرار ہو جاتا۔ یہ حقیقت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ ان مقابلوں کی صورت میں، میں کچھ دب گیا۔ میں بہر حال ایک جن زاد تھا اسی لئے بار بار خیال آتا کہ اگر کسی طرح میری جناتی صفات مجھے واپس مل جائیں تو ان پولیس والوں سے بھگت لوں۔ کچھ لمحے دعا کی قبولیت کے ہوتے ہیں، سو میرے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی دعا کم از کم ایک حد تک قبول ہو گئی، مگر فوری طور پر نہیں۔ دعا کی قبولیت کو عملی شکل اختیار کرنے میں ایک عرصہ لگا۔ یہ الگ بات کہ اپنے اندر خود بخود پیدا ہو جانے والی اس پراسرار قوت سے مجھے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کا تفصیلی ذکر میں اپنے آئندہ پیش آنے والے واقعات میں کروں گا۔

میرے پاس خاصی دولت تھی۔ میں طویل عرصے تک ڈاکا ڈالے بغیر خوش حال زندگی گزار سکتا تھا۔ اپنے کردہ کے اخراجات برداشت کرنا بھی میرے بس میں تھا۔ میں نے اسی لئے ایک فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ بڑے نزدیک حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت مناسب تھا۔ اس فیصلے کا محرک روپا تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ”تایا! ہم کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے؟“

”روپا۔ اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں اس کھیل کو ختم کرنے کے متعلق پلے ہی بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

روپا جانے کیا سمجھا اور پوچھنے لگا۔ ”کون سا کھیل تایا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”میں چوہے اور بلی کا کھیل۔ اس کے لئے ہمیں کچھ قربانی دینا پڑے گی۔“

”قربانی؟“

”ہاں روپا۔ مال کی قربانی۔ اب اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔“
”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھتا۔“

”پڑھا لکھا ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”بول پولیس کے اور ہمارے درمیان کس بات پر جھگڑا ہے.....؟ یہی ناکہ وہ خود کو قانون کا محافظ کہتی ہے اور ہم قانون شکن ہیں۔ ہم ڈاکے ڈالنا چاہتے ہیں اور پولیس ہمیں ایسا نہیں کرنے دے رہی۔ فرض کر کہ ہم وقتی طور پر کچھ عرصے کے لئے پولیس کو دھوکا دینے کی خاطر قانون شکنی چھوڑ دیں، کہیں ڈاکا ڈالنے کی کوشش نہ کریں، بالکل خاموش بیٹھ جائیں تو ہمارے اور پولیس کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں رہے گا نا..... ظاہر ہے کہ اس طرح ہمیں مالی نقصان ہوگا۔ میں نے اسی کو مال کی قربانی کا نام دیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم با آسانی چار پانچ مہینے گزار سکتے ہیں۔ ان چار پانچ مہینوں میں ہم.....“ میں نے روپا کو آئندہ اقدامات سے آگاہ کیا۔

میری بات میں بہر حال اتنا وزن تھا کہ روپا قائل ہو گیا۔
پھر چار پانچ مہینے اسی طرح خاموشی سے گزر گئے جیسے ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی میرا کہیں اور کبھی وجہ ہی نہیں تھا، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں اس دوران ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ میں اس عرصے میں اپنے گھر کو اور مضبوط کر لیا تھا۔ ہتھیاروں کی کمی میں نے پوری کر لی تھی۔ میرے پار اب کار توں بھی کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان تمام تیاریوں کے باوجود میں اپنی مجاہدہ رکنی کو نہیں بھولا تھا۔ مہینے میں ایک بار میں اس سے ضرور ملتا تھا۔

ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر میں میدان میں آ گیا۔ مجھے اب سے بڑی فکر اپنے دشمن نیتارام کو ختم کرنے کی تھی۔ کچھ بھروسا نہیں تھا کہ مجھے کب بلونت سنگھ کا ج چھوڑنا پڑتا۔ پولیس سے معرکہ آرائی کے نتیجے میں کسی وقت بھی یہ مرحلہ آ سکتا تھا۔ میری محبوبہ رکنی خواہش بھی یہی تھی۔ میں بھلا رکنی کی خواہش کیسے پوری نہ کرتا۔ میں اگر نیتارام کو قتل کئے بغیر بلونت سنگھ کا جسم چھوڑ دیتا تو رکنی ہمیشہ بے چین رہتی۔

بلونت سنگھ کا بڑا بھائی نواب سنگھ بھی گھر میں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا تھا اور پولیس بھی کسی طرح اچھٹانے کے چکر میں تھی۔ نواب سنگھ کئی مرتبہ مجھ سے اس بات کا اظہار کر چکا تھا۔ اب تک میں اٹا رہا تھا، لیکن پولیس کی طرف سے خطرے کے سبب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ نیتارام پولیس کی حفاظت میں تھا۔ آخر نواب سنگھ نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا اور میرے پاس چنبل کے غاروں میں آ گیا۔ چند ہی روز کے بعد روپا نے ایک مخبر کی طرف سے موصول ہونے والی اطلاع سے مجھے آگاہ کیا۔ ”نیتارام کا لڑکا اور لڑکی اپنی نانی کے گھر گئے ہیں۔ انہیں وہاں سے گاؤں واپس لانے کے لئے پولے ایک آدمی جانے والا ہے۔“

میں نے روپا کا مقصد سمجھ لیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اسی لئے بولا۔ ”روپا! پہلے باپ کو ختم کرو، ان“

بچوں پر ہاتھ اٹھانا.....“

میری بات ادھوری رہ گئی اور نواب سنگھ بول اٹھا۔ ”بلونت سنگھ! ایسی کمزوری نہ دکھانا.....“
”جیسے اور میرے بیٹے کون سے پوری طرح جوان ہو گئے تھے؟ ابھی تو ان کی صرف متیں ہی بیٹگی تھیں اور اس عمر میں انہیں ختم کر دیا گیا۔ نیتارام پولیس کی حفاظت میں ہونے کے سبب بڑا ہانک رہا ہے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اب کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ جب وہ اپنی اولاد کے بارے میں سنے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ کون کتنے دن کا مہمان ہے۔“

روپا یہی چاہتا تھا۔ نواب سنگھ کے آنے سے اسے بڑا سہارا مل گیا تھا۔ وہ جلدی سے کہنے لگا۔ ”ہاں ہاں، بڑے ابا ٹھیک کہتے ہیں۔ نیتارام نے میرے بے گناہ چاچا کو پولیس کے ہاتھوں مرادیا، یہ اس قتل کے بدلے لینے کا وقت ہے۔“

نواب سنگھ اور روپا کے اصرار پر میں نے دل مضبوط کر کے کہہ ہی دیا۔ ”اچھا تم لوگ یہی چاہتے ہو تو پہلے ڈالی کاٹ دیتے ہیں، تنے کی باری بعد میں۔“

میں پوری ضلع کے کان گرا گاؤں میں پولیس کے مخبر رام سروپ کو نیتارام کے لڑکے اور لڑکی کو بلانے بھیجا گیا تھا۔ یہ بات بہت خفیہ رکھی گئی تھی۔ خود نیتارام پولیس کی نگرانی میں تھا۔ اسے بچوں کو لینے نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق اٹھتے بیٹھتے اسے میرا خیال ستاتا رہتا تھا۔ اسے پولیس کے آدمی سادہ لباس میں باہر لے جاتے۔ سادہ لباس پولیس والے ہی اس کے بچوں کی حفاظت کرتے۔ اسکول میں سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو اس نے بچوں کو نانا کے گھر بھیج دیا۔
میں نے پولیس کی دسترس سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے ساتھیوں میں سے اکثر کے لئے پولیس کی وردیوں کا بندوبست کر دیا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ رام سروپ گلی کے کنویں پر نما رہا تھا۔ دوسری طرف - بچے برتن اٹھا رہے تھے۔ ابھی وہ نما ہی رہا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ ہم سب کے جسموں پر پولیس کی وردیاں تھیں۔ خاکی لباس میں مسلح افراد کو دیکھ کر گاؤں والے ہمیں پولیس والے ہی سمجھے، مگر رام سروپ ٹھنک کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا جو اٹھا کا اٹھا رہا تھا۔ رام سروپ مجھے پہچانتا تھا۔ اب یہ بات گلی راز نہیں رہی تھی کہ میں اور میرے ساتھی پولیس کی وردیاں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں۔
”ارے باپ رے!“ رام سروپ اچانک چیخ اٹھا۔ ”ڈاکو..... ڈاکو آئے..... بھاگو۔“ پھر ان نے لوٹا پھینک کر کنویں پر سے جست لگائی۔

برتن مٹھتی ہوئی عورتیں گھبرا گھبرا کر بھاگنے لگیں۔ گلی میں کھیتے ہوئے بچے چھپ گئے۔ رام سروپ پانی پٹکا پی ہوئی دھوتی سنبھالتا بھاگ رہا تھا۔ میں اسے پہلے ہی پہچان چکا تھا۔ میں نے اپنی رائفل الٹ کر اس کی طرف سیدھی کی اور پھر دوسرے ہی لمحے فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔

پہلے جس جسم سے پانی ٹپک رہا تھا، اب اسی جسم سے خون ٹپکنے لگا۔ میں قریب پہنچا تو رام سروپ گم ہو چکا تھا۔ میں خاص طور پر پولیس کے ایسے مخبروں کو زندہ نہیں چھوڑتا تھا جو مجھے پہچانتے تھے۔ رام سروپ بھی انہی میں سے ایک تھا۔

نیتارام ہوگا۔ پولیس کے سخت پیرے کے باوجود اگر میں نیتارام کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو حکومت اس داغ کو نہ دھوپائی۔ نیتارام کی سلامتی گویا پولیس کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

میں کچھ دن بے چین رہا۔ بار بار میری آنکھوں میں نیتارام کے معصوم بیٹے کا چہرہ گھونٹنے لگتا اور ہرادل بے چین ہو جاتا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنے دل کو سمجھانا شروع کیا، میں کوئی آدم زاد نہیں ایک جن زاد ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنی رکنی کی خاطر کیا ہے۔ میں نے اپنی محبوبہ سے عہد کیا تھا کہ تلسی رام کے پورے خاندان کو ختم کر دوں گا۔ پھر بھلا میں نے نیتارام کے بیٹے کو مار کے کیا قصور کیا تھا۔ مجھے تو دشمن کا خون بہانا تھا تو پھر خون کسی جوان کا ہو یا بچے کا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب مجھے صرف نیتارام کو قتل کرنا تھا۔ اس کے بعد میرا عہد پورا ہو جاتا۔ پھر چاہے مجھے بلونت سنگھ کا جسم چھوڑنا پڑتا، کوئی پروا نہ ہوتی۔

☆=====☆=====☆

میں بہر حال اپنا عہد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اسی خیال کے تحت ایک روز میں نے روپا سے کہا۔ ”روپا! نیتارام کبھی پولیس کی حفاظت سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس انتظار میں برسوں گزر جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ تدبیر لازمی ہے۔“

”تایا! آپ مجھے اجازت دیں تو میں پولیس کی حفاظت کے باوجود اسے قتل کر آؤں گا۔“ روپا بڑے اعتماد سے بولا۔

روپا یہ بات پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا، مگر مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ جس طرح شکاری کسی درندے کو شکار کرنے کی غرض سے جانور کو چارے کے طور پر استعمال کرتا ہے اسی طرح پولیس نیتارام کے ذریعے مجھے پھانسا چاہتی تھی۔

”روپا! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام کسی دوسرے کے سپرد کیا جائے جسے پولیس پہچانتی نہ ہو۔ وہ نیتارام تک پہنچ بھی جائے تو پولیس کو شک نہ ہو۔“ میں نے پہلی مرتبہ اپنے مزاج کے خلاف بات کی۔ پہلے میں یہ ضد تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے نیتارام کو قتل کروں گا۔

روپا نے میری بات سن کر اظہار حیرت کیا۔ ”یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں تایا؟“ پھر وہ خود ہی بولا۔ ”ویسے یہ ٹھیک ہی ہے۔ اس طرح آپ کی زندگی خطرے میں نہیں پڑے گی۔“ روپا کے دل کی بات زبان پر آگئی۔ اس کا اندازہ مجھے بھی تھا کہ روپا یہی چاہتا تھا، مگر سوال یہ تھا کہ یہ کام کس کے سپرد کیا جائے؟

میرے لئے الجھن بڑھ رہی تھی۔ پولیس میرے تعاقب میں تھی۔ آخر میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا۔ ”میرے گردہ میں سے جو شخص نیتارام کو ختم کرے گا، اسے میں دس ہزار روپے نقد انعام دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے ساتھیوں کے چروں کا جائزہ لیا۔ ان کے چروں سے بے یقینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں پھر بولنے لگا۔ ”مگر یہ بات یاد رکھنا کہ یہ کام جان پر کھیل کر ہی ہو سکتا ہے۔ نیتارام کو پولیس ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ وہاں تک پہنچنا پہلا خطرہ ہے۔

کنویں کے قریب ہی ایک گھر تھا۔ رائفل کا دھماکہ سن کر کوئی اس گھر کے کھلے ہوئے دروازے کو بند کرنے آیا۔ روپا نے آگے بڑھ کر اس دروازے پر ٹھوکر ماری، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تایا! اطلاع کے مطابق نیتارام کے بچے اسی گھر میں ہیں۔“

روپا نے ٹھوکر مار کر اس گھر کا دروازہ بند نہیں ہونے دیا تھا۔ نتیجتاً وہ دندنا ہوا گھر میں گھس گیا۔ میں بھی روپا کے پیچھے لپکا۔

”کہاں ہے نیتارام کا بیٹا؟“ میری گرج سن کر کونے میں چھپی ہوئی عورتیں کانپنے لگیں۔ ”جلدی بتاؤ ورنہ گھر میں جتنے بھی افراد ہیں سب کو ختم کر دوں گا۔“

”اسے نہ مارو..... میرے بھائی کو نہ مارو۔“ نیتارام کی بچی اپنی بھائی کا بازو پکڑ کر بلکنے لگی۔

میں اس معصوم بچی کے آنسو نہ دیکھ سکا، مگر اب واپسی ناممکن تھی۔ روپا آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کا بازو تھاما اور اسے دور پھینک دیا۔

”تم خواہ مخواہ ختم ہو جاؤ گی۔“ روپا غصے سے چیخا۔

میں نے رائفل کی ٹال سیدھی کی۔ میرے سامنے ایک آٹھ سالہ بچہ سما ہوا کھڑا تھا۔ اس بچے کی معصوم آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بھاگا اور دیوار میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ کچھ دیر کو میرے دل میں رحم کا جو جذبہ جاگا تھا، اسے میں نے تھک کر سلا دیا اور بے رحم بن گیا۔ لڑکے نے اگر دیوار کی طرف منہ نہ کیا ہوتا تو شاید میں اسے جھوڑ دیتا۔ پھر بھی میں اس معصوم بچے پر فائز کرتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔ آخر کار میں نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دھیمی سی ایک چیخ سنائی دی جو میرے دل میں اتر گئی۔ اگر وہ بچہ میرے دشمن نیتارام کا نہ ہوتا تو شاید مجھ میں اسے قتل کرنے کی ہمت پیدا نہ ہوتی۔ دشمنی نے مجھے بہت بے رحم بنا دیا تھا۔

چھوٹے بھائی کی لہولہان لاش سے چمٹ کر جس طرح معصوم بہن روئی، وہ منظر دیکھنا میرے لئے ممکن نہ ہوا۔ میں اس طرف سے منہ پھیر کر بھاری قدموں کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔ روپا ابھی گھر میں تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ روپا کا دل ابھی بھی نہیں بھرا ہوگا۔ وہ نیتارام کی بیٹی کو بھی شاید زندہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لئے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”روپا! جلدی واپس چلو۔“ میری آواز خود بخود بھرا گئی۔ جنبل کے غاروں تک پہنچنے سے پہلے میں نے زبان نہیں کھولی۔

اپنے مخبروں کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ بیٹے کی موت نے نیتارام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جھولی بچہ پھیلا کر مجھے بدعنائیں دے رہا تھا۔

اس ہولناک واقعے سے پولیس کی عزت پر داغ لگ گیا۔ مجھے اطلاعات ملنے لگیں کہ اب پہلے بھی زیادہ زور و شور سے ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرنے کی تیاریاں ہونے لگی ہیں۔ مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کو اب ایک لاکھ کی چوتھی یعنی پچیس ہزار روپے انعام دیے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ اب پولیس کو اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میرا دوسرا

یہ ایک طرح سے دس ہزار روپے میں موت کا سودا ہے۔” وہاں بہت سے خطرناک لوگ موجود تھے۔ مجھے معلوم تھا اس بات کا بھی کو اندازہ تھا کہ میں جو کام کسی کے سپرد کر رہا ہوں، وہ انتہائی خطرناک ہی ہو سکتا ہے۔

”فرض کریں سردار کہ نیتارام کو قتل کرنے والا خود بھی مارا جائے تو پھر؟“ کسی نے سوال کیا۔

”تو کیا تایا دس ہزار روپے نہیں دیں گے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ روپا گرم ہو گیا۔

”نہیں روپا! اس کا سوال غلط نہیں۔ تمہیں اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے روپا سے کہا، پھر بولا۔ ”اگر ایسا ہوا تو کام ختم ہونے کے بعد نیتارام کو قتل کرنے والا شخص دس ہزار روپے جس کو دینے کے لئے کہہ جائے گا، اسے ادا کر دیئے جائیں گے۔“

”پھر میں تیار ہوں۔“ ایک پرمعزز و مضبوط آواز سنائی دی۔

سب کی نظریں اس نوجوان پر جم گئیں۔ میں نے اس کے چہرے پر حوصلے کی جھلک دیکھ لی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جوان کام کر گزرے گا۔

”ٹیکا! ابھی تم نے ہو مگر مجھے تمہاری طاقت پر اعتماد ہے، بولو کب جا رہے ہو؟“ میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

”ٹھیک! میں کام تو پورا کروں گا، لیکن زندہ واپس نہ ہوا تو دوسرا کام رہ جائے گا۔“ ٹیکا چند لمبے رک کر بولا۔ ”میری بہن کو حکم سنکھ نے زبردستی اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ اسی کو آزادی دلانے کی خاطر میں نے جنبل کا رخ کیا تھا۔“

میں نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے ٹیکا۔“ میں سمجھ گیا کہ ٹیکا کو دس ہزار روپے سے زیادہ اپنی بہن کی فکر ہے۔ سو میں نے مزید کہا۔ ”اگر تم گرفتار ہو گئے یا مارے گئے تو تمہاری بہن کی رہائی کا میں ذمہ دار ہوں اور رقم کا بھی۔“

”سردار! آپ کو میری مدد کے لئے دو آدمی ساتھ کرنا پڑیں گے۔“ ٹیکا نے کہا۔

”گنجادھر برہمن اور میرا بیٹا صوبیدار تمہاری مدد کے لئے ساتھ چائیں گے۔“ میں راضی ہو گیا۔ ”مگر ایک بات کا خیال رکھنا، گاؤں کے سارے لوگ میرے بیٹے کو پہچانتے ہیں، اسے انتہائی ضرورت کے وقت گاؤں کے اندر لے جانا۔“

صوبیدار سنکھ کو ٹیکا کے ساتھ بھیجنے سے مجھے یہ تسلی تھی کہ میں نے سارا کام غیر کے سپرد نہیں کیا۔ ٹیکا نے صوبیدار کو ساتھ تو لیا مگر وہ اسے خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ وعدہ کر لیا تھا۔ ٹیکا کے لہجے سے سچائی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وار کرتے وقت میں گنجادھر کو آگے بڑھاؤں گا۔

اسی رات کو تینوں طے شدہ وقت پر روانہ ہو گئے۔

کھیزا راٹھور میں میرے جو تجربے تھے، وہ مجھے نیتارام کے معمولات سے آگاہ کر چکے تھے۔ ٹیکا اور بقیہ دونوں افراد کو میں نے ان معلومات سے آگاہ کر دیا تھا۔

نیتارام کا بیشتر وقت پولیس تھانے میں گزرتا تھا۔ دہرے کے وقت وہ تھانے کے قریب آشادرام مٹھائی والے کی دکان پر جا بیٹھتا، مگر صرف شام چار بجے تک۔ شام ہی کو میرے خوف سے گاؤں کا سارا بازار بند ہو جاتا تھا۔ نیتارام بازار بند ہونے سے پہلے ہی تھانے میں گھس جاتا تھا۔ وہ اس امید پر یہ مصیبت اٹھا رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو میں مارا ہی جاؤں گا۔ پھر وہ کھلے عام جہاں چاہے آ جاسکے گا۔

یہی وہ رات تھی کہ جب میرے اندر ایک نئی پراسرار قوت بیدار ہوئی۔ ٹیکا، صوبیدار اور گنجادھر کی روانگی کے بعد میں کوشش کے باوجود سو نہیں سکا۔ مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے صوبیدار کو ٹیکا کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ وہ میرا بیٹا نہ سہی مگر میری محبوبہ رکشی کا بیٹا تو تھا۔ اسے اگر کچھ ہو جاتا تو میں بھلا رکشی کو کیا منہ دکھاتا۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں صوبیدار کا چہرہ ابھرا اور میں چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ میں نے ٹیکا اور گنجادھر کو بھی واضح طور پر جنبل کے غاروں سے باہر نکلنے دیکھا۔ میں آنکھیں بند کئے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح جب بیدار ہوا تو رات کو پیش آنے والا پراسرار واقعہ یاد آیا۔ میں نے سوچا، کیا اب بھی ان تینوں کو آنکھیں بند کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے صوبیدار کے چہرے کا دھیان کیا، اس امید پر کہ وہ مجھے نظر آ جائے گا۔ میری توقع بے سود ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے صوبیدار کو ٹیکا اور گنجادھر کے ساتھ گاؤں سے باہر باجرے کے ایک کھیت میں چھپے دیکھا۔ میرا دل مطمئن ہو گیا کہ وہ تینوں خیریت سے تھے۔

ٹیکا مجھے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کر کے گیا تھا۔ میں نے اسی لئے اس وقت پھر اپنے غار کی راہ لی، جب سورج سر پر آ گیا۔ اپنے ساتھیوں کو میں یہ تاکید کرنا نہیں بھولا تھا کہ کسی کو بھی میرے غار میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

کچھ ہی دیر کے بعد ایک بار پھر میں اسی پراسرار تجربے سے گزر رہا تھا جس سے دو مرتبہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کرتے ہی باجرے کا وہی کھیت دیکھا جو صبح دم دیکھ چکا تھا۔ ٹیکا اور گنجادھر بھیں بدل کر اس کھیت سے باہر نکل رہے تھے۔ سائینسروالی خودکار گمن اور دستی بموں کی پوٹلی ٹیکا نے اپنے سر پر اٹھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاؤں کا کوئی کسان بازار میں خرید و فروخت کے لئے آیا ہو۔

پھر میں نے واضح طور پر ٹیکا کی آواز بھی سنی۔ وہ گنجادھر سے مخاطب تھا۔ ”سنو! نیتارام کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایک کی بجائے دوسرے کو مار دیا جائے تو زحمت الگ ہوگی اور جان خطرے میں الگ پڑے گی۔“

جواب میں گنجادھر کی آواز سنائی دی۔ ”نہیں ٹیکا! ایسی غلطی نہیں ہو سکتی۔ سب کہتے ہیں کہ نیتارام اپنے باپ کا ہم شکل ہے۔ میں نے اس کے باپ کو اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ مجھے آج

مٹھائی والا اندر جلیبی قتل رہا تھا۔ نیتارام نے اسے زحمت نہ دینے کی غرض سے ترازو کے پلڑے میں دس سیر کا باٹ رکھا، دوسرے ہاتھ سے بتاشوں کی مٹھی بھر لے گا۔ اسی لمحے میکا نے گن باہر نکال لی۔

”نیتارام! آج ٹھاکر بلونت سنگھ کا پلڑا بھاری ہے۔“ یہ کہتے ہی میکا نے گولی چلا دی۔

نیتارام کو مارنے کے لئے ایک گولی کافی تھی، لیکن میکا نے پھر بھی تین چار گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ نیتارام چیخ بھی نہ سکا۔ جس طرح بیضا تھا اسی طرح لڑکھا گیا۔ ترازو کے پلڑے میں دس سیر کا باٹ رکھا تھا اور دوسرے پلڑے میں نیتارام کے بے جان ہاتھ کی کلائی تھی۔

سارے بازار میں شور مچ گیا۔ گنجادھر اور میکا بھاگے۔ فرار ہوتے وقت گنجادھر کو میں نے جانوروں کے اسپتال کے کپاؤنڈر کرشن سے ٹکراتے دیکھا۔ کرشن نے گنجادھر کو پکڑنا چاہا، لیکن گنجادھر نے کرشن پر گولی چلا دی۔ گولی کرشن کی کلائی کو گرزتی ہوئی گزر گئی۔ پھر بھی کرشن پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ گنجادھر کے پیچھے بھاگا۔ اسے اپنے تعاقب سے روکنے کے لئے گنجادھر نے دستی بم پھینکا، مگر جلدی میں وہ بم کی پن نہیں کھینچ سکا، لہذا وار خالی گیا۔ سامنے سے فوربیک ڈرائیور آ رہا تھا۔ اسی وقت مجھے تھانے سے کچھ سپاہی نکلتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ وہ سب انسپکٹر گنجادھر کو پکڑتا تھا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنا پستول نکالا اور گنجادھر کا سینہ چھد ڈالا۔ لوگ سکتے میں آ گئے۔

”زندہ ہاتھ لگا تھا، پھر اسے ختم کیوں کر دیا؟“ کسی طرف سے آواز آئی۔

”ایسے شخص کو ختم کرنے ہی میں ہماری سلامتی ہے۔ ان لوگوں کے خلاف عدالت میں کوئی گواہی نہیں دیتا۔ پھر اگر یہ عدم ثبوت کی وجہ سے رہا ہو جائیں تو بدنامی ہمارے سر آتی ہے۔“ سب انسپکٹر نے اپنی صفائی پیش کی۔

مجھے میکا کی فکر ہوئی۔ میرے دھیان میں اس کا چہرہ ابھرا۔ پھر وہ مجھے نظر آ گیا۔ میکا کا بھی وہی حال ہوا۔ ایک پولیس والا خالی لوٹا لئے سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے میکا کے ہاتھ سے گن چھیننے کی کوشش کی، مگر میکا نے اسے بھون دیا۔ اسی وقت پولیس کا ایک خبر دو سارا رام ادھر آ نکلا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔ اس نے میکا کو ختم کر دیا۔

ہر چند کہ صوبیدار گاؤں سے باہر تھا مگر اپنے دو ساتھیوں کے قتل سے میں گھبرا گیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد میری چشم تصور نے اسے بھی دیکھ لیا۔

دھاکوں کی آوازیں یقیناً اس نے بھی سن لی تھیں۔ گاؤں کے کنارے ہی میرے ایک مخبر کا گھر تھا۔ میں نے صوبیدار کو باجرے کے کھیت سے نکل کر ادھر جاتے دیکھا۔ صوبیدار اس مخبر کے ذریعے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، میں سمجھ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ اس مخبر کو پہلے ہی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے ایک ساتھی کو مجھے یہ اطلاع پہنچانے روانہ کر دیا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ صوبیدار نے سمجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔“

”ہاں چھوٹے ٹھاکر، آپ جائیں۔ یہاں آپ کے لئے خطرہ ہے۔“ مخبر نے تائید کی۔

صوبیدار نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنے غار

بھی یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں دیکھنے ہی نیتارام کو پہچان لوں گا۔“

پھر میں نے ان دونوں کو گاؤں کے بازار میں داخل ہوتے دیکھا۔ شام ابھی کافی دور تھی۔ پولیس تھانے کے پاس سے گزرتے ہوئے میکا چونکا دکھائی دینے لگا۔ برابر میں مٹھائی والے کی دکان تھی۔ نیتارام اسی وقت دکان پر آ کر بیٹھتا تھا۔ میں نے مٹھائی کی دکان پر کھلے جسم والے ایک شخص کو بیٹھے دیکھا اور میرے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ برہمنوں کی طرح اس کے جسم پر بھی جینیو پڑا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں گنجادھر دھوکا نہ کھا جائے۔ کیونکہ وہ نیتارام نہیں گاؤں کا ایک اور شخص رام گوپال تھا۔ میکا نے سوالیہ نظروں سے گنجادھر کی طرف دیکھا۔ گنجادھر اس شخص کو کن آنکھوں سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

معاً مجھے گنجادھر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”وہ اتنا دبا نہیں ہو سکتا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا۔“

دونوں آگے نکل گئے تو مجھے اطمینان ہوا۔ گنجادھر نے وہ غلطی نہیں کی تھی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میکا اور گنجادھر خریداری کے بہانے آدھے گھنٹے سے زیادہ ادھر ادھر گھومتے رہے، پھر تھانے کی طرف لوٹے۔ انہوں نے بیک وقت مٹھائی کی دکان کی طرف دیکھا۔ ایک مرتبہ پھر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب دکان پر رام گوپال کی جگہ نیتارام بیٹھا تھا۔ میں نے نیتارام کو پہچان لیا تھا۔ گنجادھر کی آنکھوں میں مجھے چمک نظر آئی۔

”میکا! یہی نیتارام لگتا ہے۔“ گنجادھر کی سرگوشی ابھری۔

میکا کے لئے محض یہ الفاظ کافی نہیں تھے۔ وہ شاید پتہ یقین کر لینا چاہتا تھا۔ نزدیک ہی بیڑی اور تمباکو والے کی دکان تھی۔ وہاں جا کر وہ تمباکو خریدنے لگے۔

باتوں باتوں میں میکا نے دکان دار سے پوچھ لیا۔ ”وہ مٹھائی کی دکان پر نیتارام جی ہی بیٹھے جان پڑتے ہیں؟“

”جی ہاں، وہ نیتارام ہی ہیں۔“ دکان دار نے تصدیق کر دی۔

یقیناً دکان دار کو علم نہیں تھا کہ اس کے جواب پر نیتارام کی زندگی کا دارومدار تھا۔ تمباکو کی پڑیالے کر وہ دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

”گنجادھر! اب معاملہ ختم کرنا ہے۔ پھر تم گاؤں کی طرف دوڑ لگانا اور میں دوسری جانب۔ اگر کوئی درمیان میں آئے تو گولی چلاتے ہوئے نہ ہچکچاتا، سمجھ گئے.....“

جواب میں گنجادھر نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔“

اس کے بعد ان دونوں کو میں نے مٹھائی کی دکان جا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

”بیٹاشے ہیں؟“ میکا نے ہچکچائے بغیر پوچھا۔ وہ نیتارام ہی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ نیتارام کو دکان دار سمجھتا ہو۔

”جی ہاں، ہیں۔“ نیتارام جھٹ سے بولا۔

”دس سیر دے دو۔“ یہ کہتے ہوئے میکا نے سر سے پوٹلی اتاری اور اس کی گرہ کھولنے لگا۔

سے باہر آگیا۔

ظاہر ہے کہ میں جس پراسرار تجربے سے گزر چکا تھا اس کے متعلق اپنے ساتھیوں کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹیکا وغیرہ کا انتظار کرنے لگا جن میں سے اب صرف صوبیدار کو واپس آنا تھا۔ ٹیکا اور گنجادھر کا انجام تو میں خود ہی دیکھ چکا تھا۔

پہلے مخبر پنچا اور اس نے ٹیکا کے ساتھ ہی گنجادھر کے مارے جانے کی اطلاع دی۔ صوبیدار کے بارے میں اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میرا دل تو اپنے دو ساتھیوں کی طرف سے فکر مند تھا، مگر یہ فکر مندی زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ذرا ہی دیر کے بعد روپا خوشی سے ججی اٹھا۔ ”ارے تبا! دیکھنا وہ صوبیدار آ رہا ہے۔“ روپا نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اپنی مسرت نہ چھپا سکا اور اٹھ کر صوبیدار کی طرف دوڑا۔ وہ میرا نہیں تو میری محبوبہ رکنی کا بیٹا تو تھا ہی۔ میں اپنی محبوبہ رکنی کے سامنے شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ اسے میں نے گلے سے لگا لیا اور رخسار چوم کر کہا۔ ”بھوانی دیوی تیری حفاظت کرے بیٹا۔“

”باپو! ہمارا دشمن نیٹارام تو ختم ہو گیا مگر ٹیکا اور گنجادھر بھی نہیں بچ سکے۔“ صوبیدار نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

”مجھے خبر مل چکی ہے بیٹے۔“ میں بولا، پھر روپا سے مخاطب ہوا۔ ”معلوم کرو کہ ان دونوں کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ ساتھیوں کی موت کا فوری بدلہ چکانا ہے۔“ میں نے دانستہ یہ الفاظ کہے تھے ورنہ تو اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو خود ہی دیکھ چکا تھا۔

یوں دشمن تو ختم ہو گیا مگر دشمنی ختم نہیں ہوئی۔ پولیس کے خلاف میرا غصہ بڑھ گیا۔ دوسری جانب نیٹارام کے قتل نے پولیس کی کارروائی پر داغ لگا دیا۔ مجھے اطلاع ملی کہ چنبیل کے تین سرحدی اضلاع کے افسران کو اوپر سے احکام بھیجے گئے ہیں۔ ”اب حد ہو چکی ہے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرو یا پھر استعفیے دے کر گھر بیٹھو۔ بلونت سنگھ کی زندگی حکومت کی عزت کا نیلام ہے۔“

ان احکام کے نتیجے میں پولیس نے اپنا پورا زور لگا دیا۔ میں نے بھی مقابلے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ نیٹارام ختم ہو چکا تھا اور اب مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی محبوبہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ میرا گردہ بار بار پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتا۔ رہنمائی کرنے والوں کے ساتھ پولیس چنبیل کے غاروں کو روندنے لگی۔ نتیجاً یہ سنگش شروع ہو گئی کہ پہلے کون تھکتا ہے۔

پھر یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں بری طرح گھری گیا۔

اس وقت ہم راجستھان کے علاقے میں تھے۔ رکنی کا چھوٹا بیٹا دھمن سنگھ بخار میں پینک رہا تھا۔ دن رات بھٹکنے سے اس کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کسی محفوظ جگہ پہنچانا بہت ضروری تھا۔ ایک ہی ٹھکانا میری نظر میں تھا۔ بلونت سنگھ کی سرال اوریت پورہ میں تھی۔ اگر دھمن سنگھ کو وہاں پہنچا دیا جاتا تو پھر مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ اوریت پورہ پہنچنے کے لئے راجستھان کی سرحد پر بنے ہوئے دریائے چنبیل کو پار کرنا لازمی تھا۔ اس کے بعد میں مدھیہ پردیش میں بھی داخل ہو سکتا تھا۔ پولیس

تقاب میں تھی اور دھمن سنگھ سخت بیمار تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

”چلو، دھمن کو اوریت پورہ چھوڑ آئیں۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

دھمن سنگھ کی بگڑتی حالت سے سب گھبرائے ہوئے تھے۔ دھمن کی وجہ سے انہیں راستے میں آرام کرنے کے لئے رکتا پڑتا تھا۔

میری بات کے جواب میں روپا نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تبا! چنبیل کا پانی گہرا ہے اور اطراف میں کشتیاں بھی نہیں ہیں۔“

”ہم پانی میں اتر کر دریا پار کریں گے۔“ میں فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”علاج کے بغیر یہ.....“ میری آواز بھاری ہو گئی اور میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ میں ایک مرتبہ پھر آزمائش میں پڑ گیا تھا۔ دھمن سنگھ کو اگر کچھ ہو جاتا تو میں رکنی کو کیا مت دکھاتا۔

میرے حکم پر سب لوگ پانی میں اتر گئے۔ پانی ان کے شانوں تک آ رہا تھا۔ بخار میں پھٹکتے ہوئے دھمن کو چار افراد نے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ٹھنڈے پانی میں ڈیرے فرلانگ کا فاصلہ، اوپر سے سخت سردی اور تیز ہوا۔ ہمت کر کے سب آگے بڑھے اور کنارے تک پہنچے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

”ہا!“ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”اب خطرہ نہیں ہے۔“

میں بھی اس وقت خطرے سے بے خبر تھا۔ مدھیہ پردیش کی سرحد میں داخل ہو کر ہم بھینڈ کی جانب بڑھ رہے تھے تو ایک مخبر نے اطلاع دی۔ ”پولیس کی ایک کلڑی ادھر بڑھ رہی ہے۔“

یہ خبر سن کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ مجھے پولیس کا ڈر نہیں تھا، ہنگامے کی پرواہ نہیں تھی، لیکن اس وقت معاملہ نازک تھا۔ آگے بڑھ کر سامنا کرتا تو راجستھانی پولیس جھپٹ پڑتی۔ پھر دونوں جانب سے گھر جانے کا امکان تھا۔

میں سوچنے لگا، کیا کیا جائے؟ واپسی کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اس حالت میں واپسی بھی ناممکن تھی۔ میں حکمت بھی جانتا تھا۔ مجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ دھمن کی حالت تشویشناک ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ دھمن کو ہچکیاں آنے لگیں۔ اسے ریت پر کپڑا بچھا کر لٹا دیا گیا۔ میں بے بسی کے عالم میں اپنی محبوبہ کے بیٹے کی موت کی گھڑیاں گنتے لگا۔ دھمن کی چلتیاں چڑھنے لگیں اور آواز بند ہو گئی۔

وہ اندھیری رات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے بڑی محبت سے باپو کہنے والا میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے نیٹارام کا معصوم و بے گناہ بیٹا یاد آ گیا۔ موت کو خود سے قریب دیکھ کر اس کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ کیا قدرت مجھ سے اسی کا انتقام لے رہی ہے؟ میں نے سوچا۔ رکنی کے بیٹوں سے رفتہ رفتہ مجھے بھی ایسی محبت ہو گئی تھی جیسے واقعی میں ان کا باپ ہوں۔ دھمن کی جان بچانے کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ میں اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکتا تھا، مگر قدرت کو جو منظور تھا وہی ہوا۔ دھمن سنگھ نے چنبیل کے کنارے آخری سانس لیا۔ اس کی آخری رسوم ادا کرنے کا بھی انتظام نہیں تھا۔ چتا کی آگ پولیس کو ہوشیار کر سکتی تھی۔ میں نے سینے پر

ہاتھ رکھ کر دھمن کی لاش ایک کپڑے میں باندھی اور پھر اسے چنبل کی لہروں کے سپرد کر دیا۔
 ”چنبل! میں اپنے لاڈلے دھمن کو تیرے حوالے کر رہا ہوں۔“ میں نے آنسو ضبط کر لئے۔ پھر مجھے پولیس پر غصہ آ گیا۔ ”میں ان کتوں کو نہیں بخشوں گا۔“
 مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ ابھی اس سے بھی بڑا خطرہ میرے سامنے آنے والا ہے۔

☆=====☆

دھمن کی موت کے بعد میں اپنی محبوبہ رکنی کا سامنا کرتے ہوئے کترانے لگا۔ ایک ماں کو اس کے جوان بیٹے کی موت کی خبر کیسے دی جاسکتی ہے مگر کب تک میں یہ خبر رکنی سے چھپا سکتا تھا۔ میں جب اس سے ملا تو وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی کھٹک گئی۔

”کیا بات ہے ہٹاکر“ آپ کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔“ رکنی بول اٹھی۔
 ”کچھ..... کچھ نہیں“ بس ذرا تھک گیا ہوں۔“ میں نے اصل بات کو ٹالنا چاہا۔
 یہ سنتے ہی رکنی میرے پاؤں دبائے گئی۔ عام حالات میں اس کے جسم کا ذرا سا لمس مجھے دیوانہ بنا دیتا تھا، مگر اس رات تو بات ہی اور تھی۔ میں نے ہمت کر کے تمہید باندھی۔

”دھمن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“
 وہ ایک دم چونک کر بولی۔ ”کیا ہوا میرے دھمن کو؟“
 میرا سر جھک گیا۔ ”وہ..... وہ.....“ میری آواز بھرا گئی۔
 ”ٹھاکرا“ رکنی ایک دم چیخ اٹھی۔ ”جلدی بتائیں کیا ہوا اسے؟“
 ”مم..... میں اسے نہیں بچا سکا۔“ دل پر جبر کر کے میں نے بتا ہی دیا۔
 ”نہیں۔“ وہ اتنی زور سے چیخی کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔

حقیقت کا علم ہوا تو سارے ہی گھر میں کھرام پٹا ہو گیا۔ یہ میرے لئے خطرے کی بات تھی۔ نصف شب گزر چکی تھی اور رونے کی آوازیں دور دور تک جا رہی تھیں۔ میں کس کس کو صبر کی تلقین کرتا۔ کس کس کو میں یہ بتاتا کہ رونے کی آوازیں سن کر گاؤں والے ادھر متوجہ ہو جائیں گے اور پھر انہیں بھی پتا چل جائے گا کہ میں بھی گڑھی میں موجود ہوں۔ سو میں خطرہ بھانپ کر رکنی کو روتے بلکتے چھوڑ کر گڑھی سے خاموشی سے فرار ہو گیا۔

بیٹے کی موت نے رکنی پر بہت اثر کیا۔ چند ہی روز میں وہ کچھ سے کچھ نظر آنے لگی۔ آدم زاد جسم کیونکہ مٹی سے بنا ہے اس لئے جلد ڈھلنے لگتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے جو جسم اپنایا تھا پہلے ہی۔ ادھیڑ تھا۔ پھر یہ بات کہ مجھے اس جسم میں رہتے ہوئے یوں بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ رک کے دکھ کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ اسی کے نتیجے میں میرے جسم پر بڑھاپا طاری ہونے لگا۔ میرے بھرے بھرے چہرے پر بھیریاں دکھائی دینے لگیں، پیشانی پر سلونوں میں اضافہ ہونے لگا، سر اور مونچھوں کے بال سفید کا لباس پہننے میں شرط لگا رہے تھے، کمر میں اس طرح خم آ گیا تھا جیسے پشت پر اپنی محبت کی لاش لئے گھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود ابھی میرے سینے میں انتقام کے شعلے ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے۔ جب میں کسی

پر راتقل لے کر نکلتا تو کسی شیر کی طرح نظر آتا۔
 برسوں پہلے میں نے موجودہ جسم اپنایا تھا۔ میں نے بے شمار قتل کئے، ڈاکے ڈالے، بہت سے گھر اجاڑے اور کئی خاندان ختم کئے تھے۔ دوسری طرف میں نے دل کھول کر خیرات بھی دی تھی۔ میں نے غریبوں کی مدد کی، بے سارا لڑکیوں کی شادیاں کرانے کے علاوہ بچے اور نیک آدمیوں کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ میرے اندر خیر و شر کی پیکار تھی۔ انتقام و جنون کا ہیمنہ خوفناک و زندہ بھی مجھ میں تھا اور ایک بہادر اور رحم دل وجود بھی۔ میں وہی ٹھاکر بلونت سنگھ اب اپنی محبوبہ رکنی کے غم میں برابر کا شریک ہو کر بوڑھا ہو گیا تھا۔ جسم سے زیادہ میرا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے رکنی کے ناتے سے یوں محسوس ہوتا جیسے دھمن میرا ہی بیٹا تھا۔ میں آخر رکنی کے زخموں پر کیسے مرہم لگاؤں گا؟ یہ سوچ کر میں پیروں گم گم رہتا۔

”مجھے معلوم ہے تھاکر کہ آپ کو دھمن کی جدائی کا دکھ ہے۔“ روپا تسلی بھرے لہجے میں کہتا۔ ”آپ کام میں جی لگائیں تو غم کم ہو جائے گا۔“
 ”رنج تو یہ ہے کہ دھمن بخار میں پھنکتا رہا اور میں اس کی دوا نہ کر سکا، اسے کسی ڈاکٹر، حکیم کو بھی نہ دکھا سکا۔“ میں افسردہ آواز میں اپنے غم کا اظہار کرتا۔

”تھاکر! دو چار خون کر ڈالو، دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ زہر کا علاج زہر ہی سے ہو سکتا ہے۔“
 ”میں سمجھتا ہوں روپا بیٹا!“ میں ٹھنڈا سا لہجہ بھرتا۔ ”فکر نہ کرو، تمہارا تایا ہار نہیں مانے گا۔ وقت آنے پر میں جوانی کے جوش کو پھر سے بیدار کر لوں گا اور دشمنوں کے لئے فولاد بن جاؤں گا، لیکن اب..... اب میرے لئے ہندوؤں کی بجائے ایک لاشی بہت ہے۔ تمہاری، صوبیدار اور تحصیل دار کی موجودگی میں اب مجھے ہندوؤں کے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“

میری محبوبہ رکنی کے چار بیٹے تھے جن میں سے جسونت اور دھمن اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے البتہ صوبیدار اور تحصیل دار زندہ تھے۔ میرا اشارہ انہی کی طرف تھا۔ روپا کو بھی میں اپنے بیٹوں ہی کی طرح سمجھتا تھا اس لئے صوبیدار اور تحصیل دار کے ساتھ اس کا نام بھی لیا تھا۔ میں نے روپا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر میں نے کہا۔ ”یہ بات نہ بھولنا روپا کہ شیر بوڑھا ہو کر بھی شکار کرنا نہیں چھوڑتا۔“

میں اپنے دل کے زخم سب سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اب بڑی مشکل سے نیند آتی تھی۔ میری آدمی سے زیادہ رات جاگتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں رکنی کا سوگوار چہرہ گھومتا رہتا تھا۔ چنبل کے کٹاؤں میں سے سنسناتی، شور کرتی ہوئی خوفناک رات اس طرح گزرتی جیسے ہزاروں بدروہیں ایک ساتھ چیخ رہی ہوں۔ آنکھ لگ جاتی تو خواب میں نیتارام کے معصوم بیٹے کا چہرہ نظر آتا، فرادی چہرہ، رحم طلب چہرہ۔ کبھی مرتے ہوئے دھمن کا چہرہ دکھائی دیتا جس کی آنکھوں سے موت کا خوف جھانکتا۔ سوتے سوتے میری آنکھ کھل جاتی۔ میں نے اب سکون دل کی خاطر ہندوؤں ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ اپنے گروہ کی سرداری میں نے محض اس لئے سنبھال رکھی تھی کہ روپا اور رکنی کے بیٹے مایوس نہ ہوں۔ شاید

میں نے خون بہانے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی ہوتی مگر ایک اور بڑے صدمے کی کھڑی قریب آ رہی تھی جس سے میں لاعلم تھا۔

☆=====☆=====☆

جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں اس کا علم مجھے بعد میں وقت گزرنے پر ہوا ورنہ ایک غدار میری گولی سے پہلے ہی مارا جاتا۔ وہ غدار میرے ہی گروہ کا ایک فرو جگن ناتھ تھا۔ ہوا یہ کہ جب معرکہ آرائی میں قانون مجھے مات نہ دے سکا تو میرے خلاف ایک سازش کا جال بنا جانے لگا۔ حکومت نے دوسرے طریقے آزمانے شروع کر دیئے۔ میرے گروہ میں جگن ناتھ دو سال پہلے شامل ہوا تھا جو پولیس کے لالچ میں آ گیا۔ اسے دس ہزار روپے نقد اور ایک گاؤں کے حقے کا لالچ دیا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں پولیس سے ٹکراؤ کے دوران جگن ناتھ کو مجھے زخمی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے قتل کر کے وہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔

جگن ناتھ نے اسی سبب پولیس افسران سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شیر کو مارنے کا کام تمہارا ہے، میں تو اسے زخمی کر کے تمہارا کام آسان بنا دوں گا۔ پھر پولیس کو رضامند دیکھ کر اس نے مطالبہ کیا۔ ”یہ انعام صرفہ ٹھاکر بلونت سنگھ کو زخمی کرنے کا ہو تو مجھے سودا منظور نہیں۔ گولی شاید روپا کو لگے یا اس کے دونوں بیٹوں میں سے کسی کو گھائل کر دے۔ تم کو اس کا معاوضہ بھی دینا چاہئے۔“

”مگر ایسی صورت میں دس ہزار نہیں ملیں گے۔“ ایک پولیس افسر بولا۔ ”بلونت سنگھ کے علاوہ دوسروں کی قیمت ہم طے کریں گے۔ روپا کے سات ہزار، ٹھاکر کے بیٹوں کے چار چار ہزار روپے۔ بولو منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ جگن ناتھ نے آمادگی ظاہر کر دی اور یوں یہ سودا طے ہو گیا۔

جگن ناتھ بڑا چالاک تھا۔ آزادی ملنے کے بعد اس کے دو چار گاؤں سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ سالانہ پیداوار کی رقم سے جیب خرچ بھی نہیں نکلتا تھا۔ باپ دادا کے اچھے وقت کا غرور اس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا۔ کسی اور کی غلامی کر کے پیٹ پالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سے تو چنبل کی راہ بہتر تھی جہاں اس کا ٹھاکر پن محفوظ تھا۔ جگن ناتھ بھی کیونکہ ٹھاکر تھا اس لئے ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی مجھے جھوڑ کر اور کہاں جاتا، لیکن وہی جگن ناتھ ہند ہزار روپے اور ایک گاؤں کے بدلے مجھ سے غداری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے پولیس سے جو سودا کیا تھا اس میں خطرہ بہت کم تھا۔ کام نشتے کے بعد بدنامی بھی نہ ہو، جگن ناتھ نے اس کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ پولیس افسران نے اس کا نام پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر لیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

موسم برسات کے وہ آخری دن تھے۔ دریائے چنبل بھر پور انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس کے پاگل دھارے نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کافی تاراجی کی تھی۔ نئے کٹاؤ اور غار بن گئے تھے۔ زمین دھل چکی تھی۔ جنگل اور گھنے ہو گئے تھے۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔

تقریباً دو ماہ کے بعد پولیس کی سرگرمیاں ایک مرتبہ پھر زور پکڑنے لگیں۔ میرا گروہ بھی موسم

برسات میں آرام کرنے کے بعد دھرتی کا پسینہ کپکنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

میں ایک اہم ڈاکا ڈالنے نکلا۔ دوپہر ہونے والی تھی اور شام تک وہاں پہنچ جانا تھا جہاں ڈاکا ڈالنا تھا۔ رات کو کام ختم کر کے صبح تک ٹھکانے پر واپس آنا تھا۔ میں نے بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ کو ساتھ نہیں لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اب وہ زیادہ محنت اور بھگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔

اوریت پورہ کے جنگل سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے ایک مخبر سے پولیس کی موجودگی کا علم ہوا۔ میرے حکم پر سب ساتھیوں نے درختوں کے تنوں کی آڑ لے لی اور پولیس سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اطلاع کے مطابق پولیس چار دن سے اوریت پورہ کے جنگل میں گھیرا ڈالے پڑی تھی۔ پندرہ پندرہ بیس بیس افراد کی ٹکڑیوں میں پولیس دو چار فرلانگ کے فاصلے پر رکی ہوئی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

”روپا! ہمارے دو ساتھی پہلے یہاں آ کر دیکھ گئے تھے، پھر بھی انہیں پولیس کی بو نہیں ملی۔“ میں نے کہا۔ مجھے شک ہو گیا کہ گروہ کے کسی شخص نے مخبر کی ہے اور وہ پولیس سے مل گیا ہے، ورنہ اتنے بڑے جنگل میں پولیس اسی جگہ راستہ روک کر کیوں کھڑی ہوتی۔ اسی خیال کے تحت میں نے مزید کہا۔ ”اس میں پولیس کی کوئی چال ضرور ہے روپا، مگر پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں، پھر بات بنے۔ تین چار خاص آدمیوں کے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہمیں اس راستے سے گزرنہ ہے۔“

”پھر بھی فکر نہ کرو تایا۔“ روپا دور بین سے جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ہم پوری ایک ہائیلین کو اس جنگل میں چمکا دے سکتے ہیں۔“

زرا ہی دیر میں پولیس نے دور ہی سے فائرنگ شروع کر دی۔

روپا کی دو ٹالی مگر جتنے لگی۔ ”سارے بہت دنوں بعد مقابلے پر آئے ہیں۔ دو چار کو جنم رسید کرنے کی نیکی آج ضرور کروں گا۔“ روپا بڑبڑایا۔

پولیس کی عادات سے میں واقف ہو چکا تھا۔ متعدد بار پولیس سے اس طرح کے مقابلے ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک فائرنگ کر کے واپس ہونے والی پولیس بعد میں شور مچاتی کہ بڑا مقابلہ ہوا، گھنٹوں فائرنگ ہوئی۔ ڈاکو بری طرح پھنس گئے تھے، لیکن بمشکل جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے پولیس کے خیالات کا علم تھا۔ پولیس والوں کو یقین تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ ان کی گولی سے مرے والا نہیں، پھر کیوں اپنی جان گنوائی جائے۔

جگن ناتھ سرکٹا ہوا میرے مقابل آ گیا تاکہ یہی خیال کیا جائے، پولیس کی کوئی گولی کام کر گئی، مگر اس وقت تک میں جگن ناتھ کی غداری سے بے خبر تھا۔ میری ایک جانب روپا اور دوسری طرف صوبیدار تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر دونوں مجھے آڑ میں لے کر بچا سکیں۔ قریب ہی تحصیل دار موجود تھا۔

پولیس کی جانب سے فائرنگ کا زور کم ہوا تو میں نے روپا کو مخاطب کیا۔ ”اب ہم مورچہ بدلیں گے۔ شام کو ہمیں اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس سے مزید الجھنے کی بجائے ہم آڑ سے ترچھے ہو کر سرک جائیں۔ خواہ خواہ کار تو س ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔“

مورچہ بدلنے کے لئے میرے پہلو میں لیٹا ہوا تحصیل دار اٹھٹایا چاہتا تھا کہ ایک گولی اس کی جانب

لگی۔ مارنے والے نے پلو کا نشانہ لیا ہوگا، لیکن عین وقت پر ہلنے کی وجہ سے گولی پنڈلی کو چسید گئی۔ تحصیل دار کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تو میرا دل دہل گیا۔

”تحصیل بیٹے! زخم زیادہ تو نہیں آیا؟“ میں سرکٹا ہوا اس کے نزدیک پہنچا۔

روپا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ گالیاں بٹکا ہوا دانت پیس کر مخالف سمت میں گولیوں کی بارش کرنے لگا۔ مخالف سمت سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔ میں تحصیل دار کا زخم دیکھ رہا تھا۔ صوبیدار نے مجھے متوجہ کیا۔ ”باپو! روپا آگے بڑھ رہا ہے۔“

”روپا! میں نے آواز دی۔“ واپس آ جا روپا۔ تحصیل دار کو معمولی زخم آیا ہے۔“

میں اس بات سے لاعلم تھا کہ تحصیل دار پر گولی چلانے والا غدار جنگن ناتھ تھا۔ گولی چلاتے ہی اس نے اپنی جگہ تبدیل کر لی تھی۔

روپا میری آواز سن کر لوٹ آیا اور بولا۔ ”بزدل بھاگ گئے۔“ پھر اس نے بھی تحصیل دار کے زخم کو دیکھا اور مجھے اطمینان دلایا۔ ”تایا! زخم گہرا نہیں ہے، مگر.....“

”مگر کیا؟“ میں نے اسے چپ دیکھ کر سوال کیا۔ ”بول کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”یہ تایا کہ اب تحصیل دار کو ساتھ نہیں لے جانا چاہئے۔“ روپا نے قدرے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے روپا!“ میں نے تائید کی، پھر تحصیل دار کی پشت پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”پہلے ہم اسے کو محفوظ جگہ پر پہنچائیں گے۔“ اس کے بعد میں نے تحصیل دار کو مخاطب کیا۔ ”بیٹا! ضد نہ کرنا۔ دو چار دن آرام کر لو۔ ایک آدمی تمہیں تمہارے نانا کے گھر چھوڑ آئے گا۔ اس بہانے تمہاری ماں بھی تم سے دہار آ کر مل لے گی۔“

تحصیل دار کی پنڈلی سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اچھی طرح کس کر پٹی باندھنے کے باوجود دس منٹ میں پٹی خون سے تر ہو گئی۔

میں نے روپا، صوبیدار اور دوسرے ساتھیوں کو آگے رواگئی کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ آگے گاؤں جا کر ضروری انتظام کرو، ہم تحصیل دار کو اپنے ساتھ لے آ رہے ہیں۔ میرے ساتھ لو لکٹا اور دم رہیں گے۔“

لو لکٹا کو سارے ہی گروہ والے لقمان پنڈت کہتے تھے۔ وہ جوان پنڈت، روپا ہی کی طرح خوفناک اور دلیر تھا۔ دوسرا دمرو تھا جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ گروہ میں وہ میرا لاڈلا مشور تھا۔ غصہ در اور خیم خیم دم دو چار کے لئے اکیلا ہی کافی تھا۔ اس نے تحصیل دار کو اپنی پشت پر اٹھالیا۔

”تحصیل دار! تم تو کافی بھاری اور تندرست ہو۔“ دمرو نے ہنس کر کہا۔ اس کا مقصد تحصیل دار کا ہمت بڑھانا تھا۔

”دمرو!“ تحصیل دار نے سسکی لی۔ ”تجھ جیسے پہلوان کو میرا وزن کیا محسوس ہوگا۔“

میں زخمی تحصیل دار کو لے کر اگلے گاؤں بحفاظت پہنچ گیا۔ وہ چماروں کا گاؤں تھا اس لئے گھوا

کہیں سے ہاتھ نہیں لگا، لیکن روپا نے دو چار چمار تیار کر رکھے تھے۔ تحصیل دار کو ایک چارپائی پر ڈال کر انہوں نے اٹھالیا۔ اب وہ تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔

دوسرے گاؤں سے جب گھوڑوں کا بندوبست ہوا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ میں زخمی تحصیل دار سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ اس وقت مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں ’تحصیل دار‘ سے بیش کسے لئے جدا ہونے والا ہوں۔

جدا ہوتے وقت میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”رنجیت! اسے سنبھال کر پہنچانا۔“

”ٹھاکرا! آپ چتا (نکرا نہ کریں) میں چھوٹے ٹھاکر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“

را نکل، کار توں کی تھیلی اور دوسرے ہتھیار چیک کرنے کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میں انہیں کافی دیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب رکنی کا صرف ایک بیٹا صوبیدار میرے پاس رہ گیا تھا۔ جب گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اس رات میں نے ڈاکا ڈالنے کا پروگرام منسوخ کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چنبل کے غاروں میں پہنچ گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے غار میں اکیلا تھا اور تحصیل دار ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اسی پراسرار تجربے سے گزرا جو ایک مرتبہ پہلے بھی میرے لئے حیران کن ثابت ہوا تھا۔

میری آنکھیں بند تھیں اور مجھے تحصیل دار کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھ پر ارد گرد کا منظر بھی روشن ہو گیا۔ دوسرے گھوڑے پر میں نے رنجیت کو دیکھا۔ وہ دونوں دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر ان کے گھوڑوں کو میں نے بھیڑ کے جنگل میں داخل ہوتے دیکھا۔

رنجیت کے چہرے سے اب اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس نے تحصیل دار سے کہا۔ ”چھوٹے ٹھاکرا اب خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم یہ جنگل پار کر جائیں گے۔“

جواب میں تحصیل دار نے سر ہلانے پر اکتفا کیا، مگر چند منٹ بعد ہی رنجیت نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی لی۔

”کیا ہوا؟“ تحصیل دار نے چونک کر پوچھا۔

رنجیت کے چہرے پر اب خوف کے تاثرات تھے۔ اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ”ٹھاکرا! ہمیں اترنا پڑے گا۔ مجھے پولیس کی نقل و حرکت محسوس ہو رہی ہے۔“

یہ سنتے ہی تحصیل دار نے اپنے گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا دی۔ جوش میں وہ شاید اپنے زخمی بیکر کو بھول گیا تھا۔ زخمی بیکر پر وزن پڑتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر شدید کرب و اذیت کے آثار دیکھے، مگر اس نے ہونٹ بھیج لئے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تکلیف سے چیخ اٹھتا۔

”ٹھاکرا! سنبھل کر۔“ رنجیت بولا۔

”تم گھوڑوں کو آزاد چھوڑ دو، دوسری جانب چرتے رہیں گے۔ پولیس کو ہماری موجودگی کا پتا نہ چلا تو اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کھسک چلیں گے۔“ تحصیل دار نے کہا۔

رنجیت نے گھوڑوں کی پشت پر سے سامان اتار لیا۔ گھوڑوں کو چھوڑ کر دونوں قریب ہی موجود ایک کھلے نالے میں اتر گئے، مگر ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ پولیس کی نظروں میں آ چکے تھے۔ اس طرح چھپ جانے سے وہ پولیس کی نظروں میں مشتبہ ہو گئے تھے۔

میں نے تین طرف سے گھیرا ڈال کر پولیس کو آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس پراسرار تجربے سے گزرنے کے باوجود میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ اگر میں اسی وقت جنیل کے غاروں سے نکل کر بھیڑ کے جنگل کی طرف روانہ ہوتا تو وہاں تک صبح سے پہلے پہنچنا ناممکن تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود قطعی طور پر بے بس تھا۔ تحصیل دار کی مدد کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

”رنجیت..... کتے ہماری طرف آرہے ہیں۔“ میں نے تحصیل دار کی آواز سنی۔ ”آج میں ان کا خانہ خراب کر دوں گا۔“ مگر چند ہی لمحے میں اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ”ارے یہ تو دوسری رائفل ہے۔ کارٹوس بھی جلدی میں دوسری رائفل کے لئے۔ تمہاری رائفل میں کتنے کارٹوس ہیں؟“

”تین۔“ رنجیت نے مردہ سی آواز میں بتایا۔

”پھر؟“ تحصیل دار اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

قدرت نے ان کے ساتھ کیسا عجیب تماشا کیا تھا۔ ان دونوں کے پاس بہترین رائفلیں تھیں، کارٹوس بھی تھے، مگر ایک دوسرے کے لئے بیکار۔ رنجیت کی تین گولیوں سے کیا مقابلہ ہوتا۔ دونوں کیسی بے وقوفی کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کو بھی چھوڑ دیا تھا ورنہ گولی چلا کر فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ تین گولیاں فرار ہونے کے کام تو آ سکتی تھیں۔ ان سے بہر حال مسلح پولیس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ذرا دیر کے بعد رنجیت نے سر اٹھا کر نالے سے جھانکا اور اس کے چہرے پر خوف کی چادر پھیل گئی۔ پولیس والے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

”ٹھاکر! گولی چلاؤ..... دشمن نزدیک آ رہا ہے۔“ رنجیت کی آواز یہ کہتے ہوئے کانپ اٹھی۔

”تین گولیوں سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں تو طاقت ہے نہیں۔“ تحصیل دار کھوکھلے انداز میں ہنسا۔

”رنجیت! اب تو ہمیں اوپر والا ہی بچا سکتا ہے۔“

پھر تحصیل دار نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پولیس افریچھے تھا اور سپاہی آگے تھے۔ اس نے سپاہیوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

گولی چلانے کی بجائے تحصیل دار نے اچانک بلند آواز میں پولیس والوں کو للکارا۔ ”کتو! واپس چلا جاؤ ورنہ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“

تحصیل دار کا خیال شاید یہ تھا کہ اس طرح پولیس والے ڈر جائیں گے، لیکن اس کی للکار کا الٹا اثر ہوا۔ ادھر سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

”ٹھاکر! دو ایک ہی فائر کر دو۔“ رنجیت نے مشورہ دیا۔ ”پھر شاید وہ بھاگ جائیں۔“

اس کی بجائے تحصیل دار نے ایک بار پھر پولیس والوں کو للکارا۔ جواب میں فائرنگ ہوتی رہی۔ تب

تحصیل دار پھر اٹھا۔ فی الحال اس کی ایک گولی پولیس کی سینکڑوں گولیوں سے زیادہ قیمتی تھی۔ آخر کار میں نے تحصیل دار کو گولی چلائے دیکھا۔ سنسناتی ہوئی گولی ایک پولیس والے کی ران میں گھس گئی اور وہ الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر نالے سے دس قدم کے فاصلے پر آگری۔ پولیس والے اس حملے سے کچھ گھبرا گئے۔

”رنجیت!“ تحصیل دار نے جلدی سے کہا۔ ”جاؤ رائفل اٹھاؤ، وہ ہاتھ لگے تو ہم کچھ چنکار (جادو) دکھائیں۔“

میں نے رنجیت کو نالے سے نکل کر ایک درخت کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھا، لیکن ایک پولیس والے نے اسی طرح آگے بڑھ کر رنجیت سے پہلے رائفل اٹھالی۔ تحصیل دار کو یقیناً اس پر غصہ آ گیا۔ اس پولیس والے کو تحصیل دار نے بھون دیا۔ گولی کھا کر سینہ پکڑے ہوئے وہ پیچھے جا پڑا، لیکن رنجیت کو واپس نالے میں اترنا پڑا۔ اس نے بروقت خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اگر اس سے چند لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو کئی گولیاں بہ یک وقت جسم میں اتر جاتیں۔

”رنجیت! تم جاؤ، میں اس ایک گولی کے سہارے رات کاٹ دوں گا۔ اب چاند گرے بادلوں میں چھپ چکا ہے۔ اس اندھیرے میں اور اپنے ایک ساتھی کی جان گنوا کر وہ شاید اب مجھے نہیں چھیڑیں گے۔ انہیں ابھی خبر نہیں کہ ہمارے پاس کارٹوس ختم ہو چکے ہیں۔“ تحصیل دار نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم باپو کو خبر کر دو کہ وہ جلد سے جلد یہاں آ جائیں۔“

یہ کہتے ہوئے تحصیل دار اس جگہ سے جنیل کے غاروں کا فاصلہ نظر انداز کر گیا تھا۔ وہ جن حالات کا شکار تھا ان میں اسی طرح عقل خبط ہو جاتی ہے۔

”میں ٹھاکر، میں تمہیں یہاں دشمنوں کے گھیرے میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا ہے۔“ رنجیت نے ضد کی۔ ”اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ٹھاکر میری کھال کھینچ لیں گے۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس طرح میں زندہ بچ سکتا ہوں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے سے بہتر ہے کہ تم باپو کے پاس چلے جاؤ۔“ تحصیل دار نے رنجیت کو سمجھایا۔ ”یہ بھی میری مدد ہوگی۔“ پھر رنجیت کو نیم راضی دیکھ کر تحصیل دار مزید بولا۔ ”یہ رائفل اور کارٹوس لے جانا، یہ ہمارے لئے بیکار ہیں۔ ہاں یہ ہائی کی قفل بھی لے لو، راستے میں کام آئے گی۔“

تقدیر میرے ساتھ عجیب مذاق کر رہی تھی۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، مجھے سب معلوم تھا اور تحصیل دار مجھی کو مطلع کرنے رنجیت سنگھ کو بھیج رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر میرا دل خون کے آنسو روئے لگا۔ رنجیت اندھیرے میں سرک گیا۔

جنگل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا، پھر بھی مجھے سب کچھ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ درندوں کی آوازیں باجول کو خوفناک بنا رہی تھی۔ تحصیل دار پوک میں نے کراہتے ہوئے سنا۔ یقیناً اس کے زخمی ہونے کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے پانی اپنے پاس نہ رکھ کر بھی غلطی ہی کی تھی۔ پھر بھی وہ رکشی کا بیٹا تھا اور اس کی تربیت میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس نے اسی لئے آخر تک لڑنا

انتظام لیں گے۔

روپا صوبیدار اور نواب سنگھ سبھی میری طرح بابوس ہو چکے تھے۔ میں نے پھر راکفل اٹھالی تھی اس کے باوجود تحصیل دار کی رہائی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک روز اسی عرصے میں روپا نے مجھ سے کہا۔ ”تایا! ہم اتنے سارے لوگ ہیں ایک دو ختم بھی ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، مگر تحصیل دار کو جیل میں نہیں رہنے دیں گے۔“

یہ سن کر میرے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے ذہن میں بھی یہ خیال آ چکا تھا۔ تحصیل دار کو کہاں رکھا گیا تھا؟ یہ اطلاع بھی میں نے حاصل کر لی تھی۔ پھر بھی روپا جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ ممکن نہیں تھا۔

”اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے میں تم لوگوں میں سے کسی کی قربانی کیسے دے سکتا ہوں روپا۔“ میری پشیمانی پر بل پڑ گئے۔ ”اٹاؤہ جیل کے قریب تمام درخت پولیس نے کاٹ دیئے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق پولیس پوری طرح چوکنا ہے۔ اگر اس طرح تحصیل دار بچ سکتا تو میں اور صوبیدار پہلے ہی یہ خطرہ مول لے چکے ہوتے۔“

”کیا آپ مجھے صوبیدار سے الگ سمجھتے ہیں؟“ روپا نے مغموں لہجے میں سوال کیا۔

”تم سمجھ نہیں روپا!“ میں زری سے بولا۔ ”میرے بعد گروہ کے سردار تم ہی ہو گے۔ بلونت سنگھ نہ بھی ہوا تو تم اس کے نام کو زندہ رکھو گے، مجھے اس کا یقین ہے۔ میں اسی لئے تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینے دوں گا۔“

”تایا! تحصیل دار کی گرفتاری سے پولیس بہت خوش ہے، مگر ہم اس کی یہ خوشی خاک میں ملا سکتے ہیں۔“

روپا کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”تحصیل دار پر مقدمہ چلانے کے لئے پولیس کو گواہوں کی ضرورت پیش آئے گی۔“ روپا نے دانت پیٹے ہوئے جواب دیا۔ ”کس کی مجال ہے کہ وہ ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کے خلاف عدالت میں گواہی دے سکے۔ میں ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“

بس پھر قبر برسنے لگا۔ میں اور میرے ساتھی موت کے ہرکارے بن گئے۔ ہمیں جیسے ہی اطلاع ملتی کہ پولیس کسی شخص کو گواہ بنا رہی ہے تو ہم اس پر ٹوٹ پڑتے۔ پولیس کو دوسرے دن پتا چلا کہ ایک اور خون ہو گیا اور اب دوسرا گواہ تلاش کرنا پڑے گا۔

ہم دونوں ہی حریفوں کو ضد ہو گئی تھی۔ پولیس نے تحصیل دار کو پھانسی پر چڑھانے کی ضد پکڑ لی اور میں اس کی امیدوں کو خاک میں ملانے کے لئے پوری قوت سے خون بہانے پر اتر آیا۔ پھر قتل ہونے والوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔

”باپ کی زندگی میں بیٹا پھانسی پر چڑھے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ میں بار بار یہی کہتا۔

پولیس ایک زندگی کو ختم کرنے کے پیچھے پڑی تھی، اس کے بدلے میں اسے متعدد افراد کی زندگی

سیکھا تھا۔ وہ دل پر جبر کئے کراہتا رہا اور دھیرے دھیرے رات گزرتی رہی۔ اس کا یہ اندازہ بہر حال درست ثابت ہوا تھا کہ رات کے وقت اب پولیس اسے نہیں چھیڑے گی۔ اس نے راکفل کی ٹالی نالے کے کنارے پر ٹکا رکھی تھی تاکہ پولیس ڈر کر دور رہے۔

پھر صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے آخری حربہ آزمایا۔ ”میرے کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔“ تحصیل دار بلند آواز میں بولا۔ ”تم لوگ آ کر مجھے گرفتار کر لو۔“ پھر تحصیل دار نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کون ہے۔

جواب میں پولیس والے ہنس دیئے اور کہا۔ ”ٹھاکرا ہمیں بے وقوف نہ بناؤ۔ ابھی دوسری پلٹن ادھر آتی ہوگی، پھر ہم تمہیں گھیر لیں گے۔“ پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد تحصیل دار گرجا۔ ”اگر تم لوگ مجھے زندہ پکڑنے کا دھچ نہیں دو گے تو میں آخری گولی اپنے سینے میں اتار لوں گا۔“

میں نے پولیس افسر کو اپنے ماتحت سے کہتے سنا۔ ”ممکن ہے، یہ سچ ہو۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کا بیٹا اتنی دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ ممکن ہے اس کی مدد کے لئے ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی ادھر آ جائے۔ ایسی صورت میں ہنگامہ بڑھ جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں سر۔“ پولیس افسر کے ماتحت نے تائید کی۔ کچھ دیر آپس میں مزید صلاح و مشورہ کرنے کے بعد پولیس افسر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”بہتر ہے۔ تم اپنے سامان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ہم نزدیک آئیں تو کوئی گز بڑ نہ کرنا۔ اگر ذرا سے بھی ہلے تو بھون کر رکھ دیئے جاؤ گے۔“

پھر صرف چند منٹ کے اندر تحصیل دار آسانی سے گرفتار ہو گیا۔ پولیس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اب پوری طرح صبح ہو چکی تھی اور رنجیت جنیل کے غاروں میں پہنچ چکا تھا۔ مجھے اس کے آنے کی اطلاع روپا نے دی۔ میں اس وقت غصے سے پھرا ہوا تھا۔ میری آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی لاشی میں نے دور پھینک دی۔

”تایا!..... وہ تحصیل دار.....“ روپا نے پوری روداد بیان کر دی۔

”تو کیا تیرے خیال میں اب تک تحصیل دار کو گرفتار نہیں کر لیا گیا ہوگا؟“ میں چیخ اٹھا۔

روپا کا سر جھک گیا اور پھر اسی روز دوپہر تک تصدیق ہو گئی۔ مجبوروں نے خبر دے دی تھی۔

”دیکھا تو نے روپا! میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا.....! مجھے راکفل دے دے۔ میں، تحصیل دار کو

گرفتار کرنے والوں کا نام و نشان مٹا دوں گا۔“ میں گرجا۔

تحصیل دار کی گرفتاری نے جہاں میرے غصے کو بھڑکا دیا وہیں میرا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اب میں اپنی محبوبہ رکنی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مجھے ملال تھا کہ میں اس کے بیٹوں کی حفاظت نہیں کر سکا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ پولیس والے، تحصیل دار پر ظلم کی ہمتا کر دیں گے۔ وہ تحصیل دار سے میرا

گنونا پڑ رہی تھی۔

لوگ بے درپے قتل ہونے لگے تو عوام میں شور مچ گیا۔ برسرِ اقتدار لوگ بھی پولیس سے ناراض ہو گئے۔ وہ کہتے: ”اتنی پولیس اسے ختم نہیں کر سکتی؟ کیا ٹھاکر بلونت سنگھ کے ہاتھ میں موت کی لکیر ہی نہیں ہے؟ یہ قتل و غارت گری آخر تک جاری رہے گی؟“

مجھے پھسانے کے لئے ہر قسم کے طریقے آزمائے گئے۔ گاؤں گاؤں ایسے آدمی تلاش کئے گئے جو دھوکا دے کر مجھے پھنسا سکیں۔ مجھے تمام خبریں ملتی رہیں۔

میرا جوش برقرار رکھنے کی خاطر روپا مجھے دوسرے کاموں میں پھنسائے رکھا۔ کسی گاؤں میں اگر جھگڑا ہو جاتا تو کوئی عدالت کا رخ نہ کرتا۔ میرا فیصلہ سب مانتے تھے، مگر دھمن کی موت کے بعد میں نے اس طرف دلچسپی لینا کم کر دی تھی۔ پھر تحصیل دار کی گرفتاری کے بعد تو میرا وجود جیسے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ میں کافی عرصے سے اپنی محبوبہ رکنی سے بھی نہیں ملا تھا۔ آخر میں اس کے پاس کیا منہ لے کر جاتا۔ مجھے جب بھی کسی شخص کے بارے میں اطلاع ملتی کہ وہ تحصیل دار کے کیس میں پولیس کی طرف سے گواہی دینے پر تیار ہو گیا ہے تو میرا خون جوش مارنے لگتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور میں بھول جاتا کہ میرا جسم بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔

”نایا!“ روپا نے ایک روز پھر موقع دیکھ کر کہا۔ ”جب تک آپ مصالحت نہیں کرائیں گے، جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔ ایک رات کا کام ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ٹھاکر جو بھی فیصلہ دیں گے، ہمیں منظور ہوگا۔ مان جائیں نا نایا۔“

اس سے پہلے تین چار مرتبہ میں روپا کو ٹال چکا تھا، لیکن اس مرتبہ اس کی ضد کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

”ٹھیک ہے روپا۔“ میں بولا۔ ”اس گاؤں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ وہاں ایک شخص بھی تحصیل دار کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں ہوا۔ ہم آج شام وہاں پہنچ کر صبح تک واپس آ جائیں گے۔ پھر یہ کہ وہ تمہارے رشتے دار بھی ہیں۔“

روپا کے رشتے داروں اور ان کے حریفوں میں، میں نے صلح کرا دی۔ مصالحت کرانے کی غرض سے مجھے اور روپا کو رات اسی گاؤں میں گزارنا پڑی۔ صبح ہماری روانگی سے پہلے روپا کا ایک رشتہ دار رام دیال ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

”ہاں بولو۔“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”روپا پنڈت!“ وہ میری بجائے روپا سے مخاطب ہوا۔ ”تم ٹھاکر کو میرے گھر لے آؤ۔ اس غریب برہمن کے بھگ (نصیب) جاگ جائیں گے۔ ساری زندگی مجھے یہ فخر رہے گا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ میرے گھر آئے تھے۔“

روپا نے میری طرف دیکھا۔

”تمہارا رشتہ دار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سوچے گا بلونت سنگھ نے برہمن کے گھر آنے سے انکار کر

دیا۔ چلو ایک چکر لگا آئیں۔ کھڑے کھڑے واپس آ جائیں گے۔“

”میرے اچھے نصیب۔“ رام دیال پُرسرت انداز میں آگے بڑھا۔ ”زیادہ دیر روکوں گا بھی نہیں۔ کبھی دودھ بنا رکھا ہے، پی کر چلے آتا۔“

میں اور روپا، رام دیال کے ساتھ ہوئے۔ برآمدے میں چار پائیاں ڈال کر میزبان دودھ کے گلاس لینے گھر کے اندر چلا گیا۔

”یہ تمہارا رشتہ دار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

روپا میرا اشارہ سمجھ گیا اور کہا۔ ”نایا! بات یہ ہے کہ ڈاکو بن جانے کے بعد بہت سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر پولیس پوچھ گچھ کرنے آتی ہے تو کہتے ہیں: یہاں ڈاکو کا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا، اگر ہو تب بھی ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن کسی سے جھگڑا ہو جائے تو حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں، خبردار کوئی مقابلے پر آیا، میرا فلاں ڈاکو رشتہ دار ہے، اگر اسے اشارہ کر دیا تو فنا ہو جاؤ گے۔“

روپا کے لہجے میں تمسخر تھا، مگر مجھے ہنسی نہیں آئی۔ اس وقت رام دیال گلاس لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے میرے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ خلاف توقع وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بھی کا پتے دیکھا۔ روپا بھی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ٹھاکر! آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔“ رام دیال جلدی سے بولا۔ ”اب آپ لوگ دودھ پئیں۔“

میں نے کسی انجانے خطرے کو بھانپ لیا۔ میری اور روپا کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ پلکیں جھپکا کر روپا نے مجھے مخصوص اشارہ کیا اور میں نے سر ہلا دیا۔ اس نے گویا خطرے کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ اسی لئے فوراً بول اٹھا۔ ”رام دیال جی!“ روپا نے رام دیال کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے چہرے کا رنگ پل پل بدل رہا تھا۔ ”جب ہم کسی کے مہمان ہوتے ہیں تو میزبان کے بغیر کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ رام دیال نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اگر..... اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔“ پھر رام دیال نے گہری طرف منہ کر کے آواز دی۔ ”لو! میرے لئے بھی دودھ کا کٹورا لے آؤ۔“

کچھ ہی دیر کے بعد آٹھ سال کا ایک بچہ دودھ کا گلاس لے کر آ گیا۔ جب تک دودھ نہیں آیا رام دیال بے چین رہا۔ میں اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

رام دیال جیسے ہی گلاس پکڑ کر منہ کی طرف لے جانے لگا، روپا نے اسے روک دیا۔ ”رام دیال کئی! یہ کیا.....؟ مہمان سے زیادہ آپ کا گلاس بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔“ روپا کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مذاق کر رہا ہو۔ ”یہ مہمان داری کے خلاف بات ہے۔ اس سے ہم برہمنوں کی عزت پر حرف آ جائے گا۔ آپ اپنا گلاس تیا سے بدل لیں۔“

جن زاد ☆ 85 ☆ تیسرا حصہ

”ہمت بہادر بن رہے ہو، جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔“ میں نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ ”چلو قدم بڑھاؤ۔“

پھر بھی جگن ناتھ پیچھے رہ گیا۔ گھانٹی گاؤں سے گزرتے وقت سورج سر پر آچکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو درختوں کے سائے میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ کچھ ساتھی گاؤں سے کھانالے آئے۔ سب لوگ کھانا کھا کر درختوں کی چھاؤں میں لیٹ گئے۔

ہمیں لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک فائزوں کی آوازوں سے سناٹا گونج اٹھا۔ اس کا علم مجھے اپنے منجروں کے ذریعے بعد میں ہوا کہ پولیس نے مجھے ختم کرنے کے لئے کیا سازش تیار کی تھی۔ مجھے زہریلا دودھ پلانے کے بعد رام دیال کو پولیس سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ وہ کوئی ایسا زہر نہیں تھا کہ فوری طور پر مجھے ہلاک کر دیتا۔ زہر پولیس ہی نے رام دیال کو فراہم کیا تھا۔ اس زہر کا اثر تقریباً آدھے گھنٹے بعد شروع ہوتا۔ جب مقررہ وقت پر رام دیال نے پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا تو پولیس اس کے گاؤں جا پہنچی۔ وہاں اسے رام دیال کے قتل اور میرے فرار کا علم ہوا۔ پھر وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس پولیس ٹولی کے افسر کو یقین تھا کہ میں زیادہ دور نہیں گیا ہوں گا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا مجھ تک پہنچ ہی گیا۔ دھیرے دھیرے تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے درختوں کے سائے میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو آرام کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

گولیوں کی بارش ہوئی تو میں اور میرے ساتھی بھی بھڑک اٹھے۔ ہم نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ پولیس کے اچانک حملے نے میرے دو ساتھیوں کو الٹ دیا۔

”کتوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دو۔“ میں گرجا۔

ہنگامہ مچ گیا۔ غدار جگن ناتھ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے بھی فائزنگ کی، مگر وہ سب سے پیچھے رہا تاکہ پولیس کی جھپٹ میں نہ آجائے۔ ہم لوگ اونچائی پر تھے اس لئے آسانی سے پولیس کا نشانہ بن رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے چار پانچ ساتھیوں کی لاشیں مریں۔ میرے لئے راہ فرار اختیار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میرا اصول تھا کہ کسی ساتھی کی لاش پولیس کے ہاتھ نہ لگے۔ اب مجھے دو کام کرنا تھے، پولیس سے مقابلہ کرنا اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں گھینتے ہوئے پیچھے ہٹنا۔

جگن ناتھ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اب بری طرح پھنس چکا ہوں۔ پھر بھی اس نے غضب سے مجھ پر اس لئے گولی نہیں چلائی کہ نظریں آجاتا۔ ایسی صورت میں اس کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ اسے تو اب فرار کی فکر تھی۔

معاً رویا نے ایک ساتھی لاکھن کے کان میں سرگوشی کی۔ ”تم دائیں جانب سے نیچے اتر کر پولیس پر فائر کرو۔ میں بائیں طرف سے فائر کرتا ہوں۔“

رویہ کی یہ چال کامیاب ثابت ہوئی۔ پولیس گھبرا گئی۔ کئی پولیس والے مقابلے میں مارے جا چکے تھے اور بہت سے زخمی تھے۔ غرض کہ پولیس کی ہمت جواب دے گئی۔ پولیس افسر نے لاکھ جوش دلایا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ پولیس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت اوپر سے میں نے اور صوبیدار

رویہ کے آخری جملے میں سختی آگئی تھی۔ رام دیال آنکھیں پھیلا کر رویہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا اور اسے آہستہ سے رام دیال کی طرف بڑھا دیا۔ میں اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رام دیال نے اپنے ہاتھ کی لرزش چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مجھ سے نظریں ملائے بغیر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت سبھی سانس روکے ہوئے تھے، صرف آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔

اچانک رام دیال کے ہاتھ سے وہ گلاس چھوٹ کر گر گیا جو اس نے مجھ سے لیا تھا۔

”ارے یہ یہ کیا ہو گیا؟“ رام دیال خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

رویہ اور میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہماری تیز نظروں کی تاب نہ لا کر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بھاگا۔

”خبردار!“ رویہ گرجا۔ ”بھاگنے کی کوشش نہ کرنا رک جاؤ۔ تم نے آج برہمنوں کی مہمان نوازی کو شرمایا ہے۔“

اس کے باوجود رام دیال رکا نہیں۔ تب رویہ نے اپنی رائفل کی ٹال سیدھی کی اور گولی چلا دی۔ بھاگتا ہوا رام دیال اوندھے منہ زمین پر گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں اور رویہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔

چند قدم آگے بڑھتے ہی رویہ نے مجھے اس طرح مخاطب کیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ”ذرا رکنا تایا۔“

میں رک گیا۔ رویہ پلٹ کر رام دیال کے گھر کی طرف چلا گیا اور وہاں سے دودھ کا وہ گلاس اٹھا لیا جو رام دیال نے اسے دیا تھا۔ اس گلاس میں دودھ موجود تھا۔ وہ گلاس رویہ نے گلی کے ایک کتے کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے گلاس میں زبان ڈال دی، مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

”صرف تمہارے گلاس میں زہر تھا۔“ رویہ کہنے لگا۔

”چلو ایک موقع اور ٹل گیا۔“ میں نے ٹھنڈا سانس لیا، پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”پولیس کے کتے طاقت آزما کر تھک گئے ہیں اور اب ایسی چالیں چل رہے ہیں۔“

ہم دونوں گاؤں سے باہر آگئے جہاں ہمارے دوسرے ساتھی انتظار کر رہے تھے۔

”آس پاس تم لوگوں نے پولیس کی نقل و حرکت تو نہیں دیکھی؟“ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

”نہیں ٹھاکرا“ ایک ساتھی نے جواب دیا۔

”چلو جلد از جلد یہاں سے نکل چلو۔“

”ٹھاکرا“ جگن ناتھ بولا۔ ”ہم کافی تعداد میں ہیں، پھر پولیس سے کیا ڈرنا۔ مقابلہ ہو گیا تو مزہ آجائے گا۔“

نے پولیس والوں پر شدید فائرنگ کی۔ اس قدر فائرنگ ہونے کے باوجود پولیس کو ابھی تک ملک نہیں ملی تھی۔ مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر جو انعام مقرر تھا، وہ بہر حال جان سے زیادہ نہیں تھا۔ پولیس پیچھے ہٹی تو ہمارے محلے میں شدت آگئی۔ ہتھیاروں سے زیادہ لڑنے والوں کا جذبہ کام آہم ہے۔ ہم جان پر کھیل رہے تھے جبکہ پولیس والے جان بچا کر لڑ رہے تھے۔ یہ فرق میرے لئے مددگار ثابت ہوا۔ ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر ہم آہستہ آہستہ چھیل کی طرف سرک گئے۔ پولیس افسر نے یہ دکھانے کی خاطر کہ اس نے ہمیں مار بیٹھا ہے، کچھ دور تک ہمارا تعاقب کیا ورنہ تو وہ حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔

آسمان نے گھائی چولا بدلا۔ اسی کے ساتھ چھیل کے کٹاؤ میں پانچ چٹائیں جل اٹھیں۔ میں اور میرے ساتھی سوگ میں ڈوبے ہوئے بمزکتی چٹاؤں کے سامنے بیٹھے تھے۔ روپا خود کو اس تمام واقعے کا وہ دار سمجھ رہا تھا۔ نہ وہ ضد کر کے مجھے گاؤں کے بھگڑے کو نمٹانے لے جاتا، نہ پانچ ساتھیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

اچانک لاکھن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”اپنا ایک اور ساتھی کم معلوم ہوتا ہے۔“ پھر وہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”جگن ناتھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”وہ زخمی تو نہیں ہوا تھا؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔ وہ کار تو س ختم ہو جانے کا بہانہ کر کے پیچھے چلا گیا تھا۔“ لاکھن نے جواب دیا۔

”پھر کہاں گیا؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کے پھنسن اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ زخمی تحصیل دار کو پولیس نے گھیرا تھا تبھی مجھے شک ہوا تھا اور اس وقت پولیس تعاقب کرتی ہوئی ہم تک پہنچی تو مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ ہمارا کوئی ساتھی غداری پر اتر آیا ہے۔“

”تو کیا ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گیا؟“ لاکھن بڑبڑایا۔ ”آخر وہ کہاں جائے گا؟“

مجھے شدید غصہ آنے لگا اور میں نے کہا۔ ”تحصیل دار کی گرفتاری اور میرے پانچ ساتھیوں کے مرنے کی اسے بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔“

فوری طور پر خبر دوڑائے گئے، لیکن غدار جگن ناتھ ہاتھ نہیں آیا۔ کافی دنوں بعد پتا چلا کہ پولیس کی پناہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ پولیس سے اس کی ساز باز کا تمام احوال بھی معلوم ہو گیا۔ اسے نظر پید ہوا ہو گیا تھا کہ اس کا راز اب زیادہ دن نہیں چھپ سکتا اسی لئے وہ فرار ہو گیا تھا۔

جگن ناتھ کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا تو روپا نے مجھ سے کہا۔ ”میں عہد کرتا ہوں تباہ اسے زندہ پکڑ کر موت کے حوالے کر دوں گا۔“

کچھ دیر تک کوئی نہ بولا۔ میں نے لاکھن کو کسی سوچ میں دیکھ کر پوچھا۔ ”تو کیا سوچ رہا ہے؟“ ”تحصیل دار کو گرفتار کرنے والا پولیس افسر ہماری نظروں سے کیوں نکل گیا تھا؟“ لاکھن کہنے لگا۔ ”پولیس افسر رام گوبال سرکار کی آشرवाद لئے فخریہ گھوم رہا ہے کہ اس نے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے زندہ پکڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے، پہلے اب ہم اسی کو ٹھکانے لگائیں گے۔“ میں نے فیصلہ سنا دیا۔

لاکھن اور روپا رام گوبال کو ختم کرنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ رام گوبال کا تبادلہ ضلع متھرا کے ایک گاؤں بھدریا میں ہوا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی لاکھن نے مجھے اپنے اور روپا کے بنائے ہوئے منصوبے کی تفصیل بتائی، پھر آخر میں بولا۔ ”ٹھاکرا ہم اسے پولیس چوکی سے اٹھا لائیں گے۔“

☆=====☆=====☆

صبح گیارہ بجے کے قریب بھدریا گاؤں میں ایک ٹرک داخل ہوا۔ خاکی دردیوں میں ملبوس اتنے بہت سے پولیس والوں کو دیکھ کر گاؤں کے لوگوں میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ اس کا اظہار ان کے چروں سے ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے دیکھا۔

کسی کی دھیمی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ایک اور گاؤں والے سے یہ قیاس آرائی کر رہا تھا کہ شاید ڈاکو اس طرف آئے ہیں۔ یہ پولیس والے ان کا تعاقب کر رہے ہوں گے۔

ٹرک پولیس چوکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس میں سوار سارے لوگ نیچے کود گئے۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ پولیس انچارج نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان مسلح پولیس والوں کو دیکھا۔ وہ غالباً یہی سمجھا تھا کہ کوئی بڑا پولیس افسر راؤنڈ پر آیا ہے۔ وہ اپنا لباس درست کرتا ہوا دفتر سے باہر آیا۔

زودیک آتے ہی میں نے اس سے سوال کیا۔ ”رام گوبال تمہارا نام ہے؟“ میرے لمبے میں زعب تھا۔ میرے جسم پر پولیس افسر کی وردی تھی۔

”یس سر!“ اس نے مجھے سیلوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظرس میرے چہرے پر تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔

اس کا جواب سنتے ہی کہ وہ رام گوبال ہے، میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جڑے پر میرا گھونسا پڑا۔ اسی کے ساتھ میں نے کہا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کو تم نے گرفتار کیا تھا۔ میں اسی کا انتقام لینے آیا ہوں۔“

گھونسا کھا کر وہ دودھم پیچھے جاگرا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر خوفزدہ آواز میں انک نک کر بولا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ؟“ ٹھاکر بلونت..... ٹھاکر بلونت.....

”ہاں ٹھاکر بلونت سنگھ!“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تمہاری موت۔“ پولیس کی دردیوں میں ملبوس میرے مسلح ساتھیوں نے چوکی کو گھیر لیا۔ چار پانچ پولیس والے ڈیوٹی پر تھے۔ ان سے ہتھیار چھین کر انہیں قابو میں کر لیا گیا۔

چوکی کے لاک اپ پر روپا کی نظریڈی تو اسے مذاق سوجھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ان ملاوں کو بھی حوالات میں بند کر دو۔“

حوالات میں پانچ چھ چور اچکے بند تھے۔ وہ یہ تماشا دیکھ کر خوش نظر آنے لگے۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ! ہمیں بھی رہا کراؤ۔“ ایک حوالاتی عاجزی سے بولا۔

روپا کو ہنسی آگئی۔ پولیس والوں کو اس نے اندر دھکیلا اور والوں کو باہر نکال دیا۔

رام گوپال میری دو چار ٹھوکریں کھا کر ہی دروازے پر نیم جاں سا پڑا تھا۔ میں نے لاکھن اور روپا اس کے بارے میں حکم دیا۔ ”سالے کو ساتھ لے چلو۔ تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھ کر اس کے پبلو میں ایک اور ٹھوکر ماری۔

ٹھوکر کھا کر وہ چیخ اٹھا۔ روپا اور لاکھن نے اس کا ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا اور باہر کی جانب تھینے لگے ”جھگوان کے لئے مجھ پر دیا (رحم) کرو۔“ رام گوپال گڑگڑانے لگا۔

”حکومت کا مال کھا کھا کر سالا بھاری ہو گیا ہے۔“ روپا غصے سے بولا۔

”آج اس کی کھال اتاریں گے۔“ میں نے گھٹنٹے ہوئے رام گوپال کو پھر ایک ٹھوکر ماری اور دم دی۔ ”چینچا تو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔“

چتپتی دوپہر میں گاؤں کے کنارے تڑپتے ہوئے رام گوپال کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ اپنی بے اختیار چیخوں پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

”میں تو تحصیل دار کو تم لوگوں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔“ رام گوپال گڑگڑا رہا تھا۔ ”سرکار سے ذرا مجھے تم لوگوں سے انعام ملنے کی آشا (امید) تھی لیکن میرا بڑا افسر آگیا تھا۔ اس کی آمد کے سبب میں بس ہو گیا تھا۔“

”سالے! اب بد معاشی رہنے دے۔“ لاکھن نے یہ کہتے ہی اپنی کمر سے بندھانو کدر خنجر لیا اور گوپال کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔ ”اس دنیا کا آخری درشن کر لے کیونکہ میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑنے والا ہوں۔“

”نا..... نا..... نہیں۔“ رام گوپال گلا پھاڑ کر چیخا۔

لاکھن نے یکے بعد دیگرے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں، پھر کہا۔ ”ہمیں سب معلوم ہے کہ سارے گاؤں میں اکثر پھرتا تھا کہ میں نے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کو گرفتار کیا ہے۔ جس زبان سے یہ الفاظ ادا کئے، آج وہ بھی کاٹ دی جائے گی۔“ پھر لاکھن نے اس کی زبان بھی کاٹ دی۔

رام گوپال کی لاش کے ٹکڑے کر کے جب ہم چنبل کی طرف لوٹ رہے تھے تو راستے میں ایک نے مجھے بڑی ہولناک اطلاع دی۔ معلوم نہیں کب اور کیسے پولیس نے انتہائی رازداری کے ساتھ عدا میں جھوٹے گواہ پیش کر دیئے تھے۔ ان جھوٹے گواہوں نے عدالت کے سامنے یہ بیانات دیئے تھے کہ نے خود اپنی آنکھوں سے تحصیل دار کو ڈاکے ڈالنے اور لوگوں کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ عدالت نے بیانات کو بنیاد بنا کر تحصیل دار کو سزائے موت سنادی تھی۔

میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”میری زندگی میں میرا بیٹا چھانی چڑھے گا؟“ یہ کہتے ہی میری آواز بھرا سی گئی۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ آدم زادوں سے میرے کیا رشتے تھے۔ تو ایک جن زاد ہوں اور بڑھاپے کی طرف ناکل یہ جسم میرا ایک عارضی ٹھکانا ہے۔

میری بات سن کر روپا نے مجھے تسلی دی۔ ”نایا! یہ تو پہلی عدالت کا فیصلہ ہے۔ ہم بڑے سے بڑا وکیل کر کے اوپر والی عدالت میں کیس لڑیں گے۔ تحصیل دار کی زندگی اتنی مختصر نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہاتھ میں جیون رکھا (زندگی کی لکیر) خاصی لمبی ہے۔“

”نہیں روپا!“ مجھے روپا کی یہ تسلی بے معنی معلوم ہوئی۔ ”اب مجھے تمہارے جیوتش پر یقین نہیں رہا۔“

روپا کی نظریں جھک گئیں۔ پھر وہ تحصیل دار کی سزائے موت کے جواب میں قبر بن گیا۔ ڈاکا، قتل اور اغوا کے پے در پے اتنے واقعات ہوئے کہ حکومت قمر اٹھی۔ مدحیہ پردیش کے ہوم فشر نے ہنگامی پریس کانفرنس بلا کر حلفیہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک سال میں ٹھاکر بلونت سنگھ زندہ یا مردہ ہاتھ نہ آیا تو میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا۔ مجھے اس پریس کانفرنس کی پوری تفصیل اپنے خبروں کے ذریعے مل گئی۔

صوبائی ہوم فشر کے اس بیان پر اخباری نمائندے مسکرا کر رہ گئے تھے کیونکہ حکومت کی طرف سے اس طرح کے بیانات پہلے بھی دیئے جاتے رہے تھے۔ پھر بھی دوسرے دن کے تمام اخبارات میں یہ خبر پہلے صفحے پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صوبائی ہوم فشر اپنی کرسی نہیں بچا سکے گا۔

مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ پولیس افسران کو احکام دے کر صوبائی ہوم فشر میرے گرد گھیرا جگ کرنے کے لئے کچھ اور بھی اقدامات کرنے والا ہے۔ ان اقدامات کی تفصیل ابھی معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ایک سال کی مدت کے بارے میں سن کر میں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے اگر فکر تھی تو صرف اپنی محبوبہ رکشی کی۔ مجھے اس سے ملے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس رہی تھیں، لیکن مسئلہ یہی تھا کہ میں اس کا سامنا کیسے کرتا۔

پھر وقت دبے پاؤں گزر گیا اور تحصیل دار کی سزائے موت ہائی کورٹ نے برقرار رکھی۔ تب میں ٹوٹ سا گیا۔

”نہیں نہیں، میں اپنے بیٹے کو چھانی نہیں چڑھنے دوں گا۔“ چنبل کے غار میری آواز سے گونج اٹھے۔

روپا سر جھکائے میرے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ کہنے کے لئے اس کی زبان نہیں کھل رہی تھی۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ تحصیل دار کے ہاتھ میں جیون رکھا خاصی لمبی ہے۔ اس کی زندگی اتنی مختصر نہیں ہو سکتی۔ اب وہ بھلا کس طرح اور کیا کہہ کر مجھے تسلی دیتا۔

میں اپنے غار میں آگیا اور ساتھیوں کو حکم دے دیا کہ کوئی میری تنہائی میں غل نہ ہو۔ مجھے دراصل رکشی بری طرح یاد آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جوان بیٹے کی سزائے موت بحال رہنے پر اس کا کیا حال ہو گا؟ میں جس پراسرار تجربے سے پہلے بھی گزر چکا تھا، مجھے اس کا خیال آیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں پوری شدت سے اپنی محبوبہ رکشی کا تصور کر رہا تھا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے صفحہ ذہن پر رکنی کا چہرہ ابھرا اور پھر میں نے اس کی آواز سنی۔
”میرا تحصیل دار بیٹا۔“ اس کے بعد وہ چیخ اٹھی۔ اس کی چیخ سے کھیزا راٹھور کی گڑھی کے جیسے پتھر بل گئے۔
”کوئی تو میرے بیٹے کو بچاؤ۔“ وہ بین کرنے لگی۔

گھر کے بچے روتی ہوئی رکنی کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک بچے نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”دادی! روتی کیوں ہو؟ اپنے باپو (بلونت سنگھ) تحصیل دار چاچا کو رہا کر لائیں گے۔ پولیس ان سے بت ڈرتی ہے۔“
رکنی کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے معصوم بچوں کی تسلی سے رکنی کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔ میں اس کی مشکل سمجھ رہا تھا۔ وہ بچوں کو کیسے سمجھاتی کہ اب تحصیل دار کو پولیس کے قبضے سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ پولیس اسے موت کے منہ میں دھکیل کے رہے گی۔

ذرا ہی دیر کے بعد میں نے بلونت سنگھ کے عزیز رشتے داروں کو گڑھی میں جمع ہوتے دیکھا۔ ان سبھی کو تحصیل دار کی سزائے موت کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔
”ابھی ایک علاج ہے۔“ ایک شخص نے رکنی کو مخاطب کیا۔ ”حکومت سے رحم کی اپیل کر دو کہ پھانسی معاف کر کے عرقیدے دے۔“

”میں حکومت سے رحم کی اپیل کروں؟“ رکنی کی آنکھوں سے سرفی جھلکنے لگی۔ ”رحم کے لئے عاجزی کروں؟ اپنے دشمنوں کے سامنے ہاتھ جوڑوں؟ ان کی خوشامد کروں..... ان کی خوشامد کروں جو میرے سہاگ کے دشمن ہیں؟“

”لیکن تم یہ کیوں بھول رہی ہو رکنی کہ تم ایک ماں بھی ہو۔“ ایک بوڑھی عورت بول اٹھی۔
”کیا اپنے جوان بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے ماں اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتی؟“ ایک اور عورت نے کہا۔

کچھ دیر تک رکنی خاموش رہی، پھر ایک دم کہنے لگی۔ ”تحصیل دار کی خاطر میں اپنا سر جھکا دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ”میں حکومت کے سامنے ہاتھ جوڑ لوں گی.....
بیٹے تحصیل دار! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تیری نازک گردن میں پھندا پڑے۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”مگر..... مگر کیا سرکار میری بات سنے گی؟ اس کی نظر تو تحصیل دار کے باپ پر ہے۔ حکومت مجھ سے کہے گی کہ بیٹے کو بچانا ہے تو باپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ پھر.....؟ پھر کیا ہوگا؟“ رکنی بہت دور تک اور صحیح خطوط پر سوچ رہی تھی۔

اسی روز میرے ایک مخبر نے مجھے خلاف توقع خبر دی۔ معلوم ہوا کہ صوبائی وزیر داخلہ میری محبوبہ رکنی سے ملنے اس کے میکے جانے والا ہے۔ رکنی سے وہ کیوں ملنے والا تھا؟ اس سلسلے میں صرف اندازے ہی لگائے جا سکتے تھے۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ وہ اگلے روز صبح رکنی سے ملے گا۔

دوسرے دن صبح میں نے ایک بار پھر رکنی کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے رکنی کا اداس چہرہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ اپنے میکے اوریت پورہ میں تھی۔ اس وقت بھی رکنی کے پاس کئی عزیز رشتے دار بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ حکومت کے نام رکنی کی طرف سے تحصیل دار کے لئے رحم کی

درخواست لکھی جا چکی ہے۔

اسی وقت کسی نے باہر سے آکر بتایا کہ پولیس کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں میں داخل ہوا ہے۔

”معلوم کرو، وہ کون لوگ ہیں اور کیوں آئے ہیں؟“ رکنی نے بارعب آواز میں حکم دیا۔

ذرا ہی دیر میں رکنی کو حقیقت کا علم ہو گیا۔

پولیس چپوں کے ساتھ صوبائی وزیر داخلہ کی کار دھول اڑاتی رکنی کے گھر کے سامنے رک گئی۔

اندر خبر کی گئی اور رکنی نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔“ رکنی کے رشتے کا ایک بھائی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔ ”خود حکومت کا ایک وزیر ہمارے دروازے تک آ گیا۔“

جواب میں رکنی کچھ نہ بولی۔ اس وقت تک صوبائی وزیر کیلاش ناتھ اور ایس ایس پی منوہر سنگھ کو نشست گاہ میں بٹھایا جا چکا تھا۔

رکنی بڑے باوقار انداز میں چلتی ہوئی نشست گاہ میں داخل ہوئی۔

”رکنی جی! یہ صوبائی ہوم منسٹر کیلاش ناتھ جی ہیں۔“ ایس ایس پی منوہر سنگھ نے کیلاش ناتھ کا تعارف کرایا۔

رکنی نے کیلاش ناتھ کی طرف تاپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ پولیس والوں کے وزیر ہیں۔“ رکنی کے بھائی نے اسے سمجھایا۔

رکنی کے چہرے سے سختی کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے منہ پھیر لیا۔ وہ بہر حال ایک راجپوت گھرانے کی بیٹی تھی۔

ایس ایس پی منوہر سنگھ نے رکنی کے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”منسٹر صاحب خود آپ کے گھر آئے ہیں، پھر بھی ان سے ایسا برتاؤ۔“

”ہمیں ان کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھنا چاہئے۔“ کیلاش ناتھ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یہ ٹھاکر بلونت سنگھ کی بیٹی (بیوی) ہیں اور میں، پولیس کا وزیر ہوں۔ لہذا مجھ کو دیکھ کر ان کا یہ رد عمل فطری ہے۔ میں اس ٹھکے کا وزیر ہوں جس نے ان کے جوان بیٹے کو پھانسی کی سزا دلوائی ہے۔

رکنی جی کو مجھ سے نفرت کرنے کا پورا حق ہے۔ ہم ان سے یہ حق نہیں چھین سکتے۔“

صوبائی وزیر داخلہ کیلاش ناتھ مجھے میٹھی چھری محسوس ہوا۔ اس کے نرم اور سچے الفاظ نے یقیناً

رکنی پر اچھا اثر چھوڑا تھا۔ اب رکنی کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔ اسی وقت رکنی کے بھائی نے قریب

آکر اس سے سرگوشی کی۔ ”رکنی بہن! مت بھولو کہ ہم راجپوت ہیں اور راجپوت کبھی گھر آنے والے کی بے عزتی نہیں کرتے۔“

رکنی نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کیلاش ناتھ کو مخاطب کیا۔ ”آپ تشریف رکھیں، میں ابھی آتی

ہوں۔“ رکنی کے لمحے میں اب تاپسندیدگی یا نفرت نہیں تھی۔

اندر جا کر رکنی نے ایک الماری سے گزشتہ روز لکھی جانے والی درخواست نکالی اور پھر واپس

”تم موت کی دھمکی کے دے رہے ہو؟“ رکنی گرجی۔ ”جاؤ تم سے جو ہو سکے، وہ کر لیتا۔ میرے گھر آ کر اور میرے سامنے ٹھاکر کے خلاف بول رہے ہو۔“ رکنی کی آنکھوں سے آگ سی برس رہی تھی۔ اس نے کیلاش ناتھ کے ہاتھ سے رحم کی درخواست چھین لی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بے قابو سانسوں کو درست کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور دھاڑی۔ ”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

☆=====☆

رکنی ایک بہادر راجپوت عورت تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ کو یوں اپنے گھر سے نکال دینا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اتنا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس نے ایک فشر کی توہین کی تھی، صرف اس لئے کہ فشر نے مجھے برا کہا تھا۔ یوں گویا رکنی نے تحصیل دار کی قسمت پر مرگ لادی تھی۔

ایک سال کی مہلت کے دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ میرے اندر اب تک اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ رکنی سے مل سکوں۔ اس عرصے میں تحصیل دار کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کی لاش آخری رسوم کے لئے رکنی کے حوالے نہیں کی گئی تھی اور یہ سراسر ظلم تھا۔ حکومت اپنے ایک فشر کی توہین کا پورا بدلہ لے رہی تھی۔ لاش کو درخاء کے حوالے نہ کرنے کا یہ جواز تلاش کیا گیا تھا کہ اس سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔ اطلاع کے مطابق تحصیل دار کو پھانسی دینے سے پہلے رکنی کو ملاقات کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ بیٹے سے اس کی یہ آخری ملاقات ہے اور آئندہ روز صبح تحصیل دار کو پھانسی دی جانے والی ہے۔

رفتہ رفتہ اب میں اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا تھا کہ مجھے ٹھاکر بلونت سنگھ کا جسم چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اب اس جسم میں رہنے کا حاصل بھی کیا تھا۔

مجھے اطلاعات مل رہی تھیں کہ ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی میرے موجودہ جسم کو ختم کرنے کے لئے پولیس زبردست انتظامات کر رہی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ کیلاش ناتھ کے استعفیے سے بڑی بدنامی اور کیا ہوئی۔ مجھے ختم کرنے کی غرض سے تھرڈ ایجنٹ آری فورس بنائی گئی۔ اس فورس میں چھانٹ چھانٹ کر پھاڑی اور گورکھے سپاہی لئے گئے جنہیں خصوصی تربیت دی گئی۔ چھیل کے راستے مسدود کرنے کے بعد میرے گروہ سے اس نئی آری فورس کے مقابلے شروع ہو گئے۔ چاند پور، بڑگاری، جی اولاری، ہر جگہ ٹکراؤ ہوا۔ پھر بھی نہ تو مجھے پکڑا جاسکا، نہ ہی زخمی کیا جاسکا۔ یہ آنکھ پھولی مسلسل جاری تھی۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ آری فورس کے ساتھ پولیس کے کچھ دستے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ پولیس والے تھے جن سے پہلے بھی میرا ٹکراؤ ہوتا رہا تھا اور وہ چھیل کے پورے علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہی میں ایک سینئر پولیس افسر زنجی سنگھ بھی تھا جس کا تعلق امرتسر کے ایک گاؤں سے تھا۔ متعدد بار اس سے میرے مقابلے ہو چکے تھے۔ خود میں بھی اس کی بہادری کا معترف تھا۔

میں نے اب راکٹل چھوڑ کر ہاتھ میں لائٹھی تمام لی تھی۔ میری کلائی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور ہاتھ کی غٹوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ بیٹے کو پھانسی ہونے کی

نشت گاہ میں آگئی۔ رکنی نے کیلاش ناتھ کے ہاتھ میں وہ درخواست تھما دی۔ کیلاش ناتھ درخواست پڑھنے لگا۔ میری توجہ اب اس درخواست کی عبارت پر تھی۔

درخواست میں رکنی نے اپنے بیٹے تحصیل دار کے لئے رحم کی اپیل کی تھی۔ میں نے کیلاش ناتھ کے ہونٹوں پر بڑی عیارانہ مسکراہٹ نقش کرتے ہوئے دیکھی۔ اس نے درخواست پڑھ کر کہا۔ ”رکنی جی! میں اسی لئے آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ کے جوان بیٹے کی سزائے موت عمر قید میں بدل سکتی ہے، مگر اس کی ایک شرط ہوگی۔“

”وہ کیا؟“ رکنی ایک دم بول اٹھی۔

”شرط یہ ہے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ خود کو قانون کے حوالے کر دے۔“ کیلاش ناتھ نے شرط بتائی۔

اب میں اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر رکنی بولی۔ ”حکومت اگر ٹھاکر کو معافی دے دے تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ ڈاکے ڈالنا چھوڑ دیں گے۔ میں انہیں اس پر راضی کر لوں گی۔ وہ میری بات مان جائیں گے۔ اپنی حکومت کے دور میں ٹھاکر خود بھی ڈاکے ڈالنے سے خوش نہیں ہیں۔“ رکنی بڑے بڑے تپتے الفاظ میں بول رہی تھی۔ ”اگر سرکار مان جائے تو ٹھاکر باقی زندگی اپنے بچوں کے درمیان گزار دیں گے۔“ رکنی یہ کہہ کر پرامید نظروں سے کیلاش ناتھ کی طرف دیکھنے لگی۔

چند منٹ تک کیلاش ناتھ چپ رہا۔ اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر وہ بولا۔ ”تم اپنے پتی (شوہرا) کو سمجھاؤ کہ وہ گرفتاری پیش کر دے۔“

”پھر آپ ان پر مقدمہ تو نہیں چلائیں گے؟“ رکنی نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ اچانک کیلاش ناتھ کا لہجہ بدل گیا۔ ”اس جیسے بدنام ڈاکو کو حکومت کس طرح معاف کر سکتی ہے۔“

”بدنام ڈاکو۔“ رکنی کی بھنویں تن گئیں۔ اس کے لہجے کی نرمی اب ختم ہو چکی تھی۔ ”جا کر پورے علاقے میں پوچھو، گاؤں گاؤں معلوم کرو، اگر ایک شخص بھی ٹھاکر کو بدنام ڈاکو کہہ دے تو میں خود انہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں گی۔ لوگ تو انہیں انصاف کرنے والا سمجھتے ہیں، ان سے اپنے فیصلے کراتے ہیں۔“

”حکومت ٹھاکر بلونت سنگھ کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اس کے سیاہ کارناموں کی طویل فہرست ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر وہ اپنے جوان بیٹے کو سزائے موت ہونے کی وجہ سے چھپتا رہا ہو تو خود کو ہمارے سپرد کر دے۔ سرکار ایسی صورت میں اس کی قانونی مدد کرے گی۔ اگر وہ عدالت کے سامنے خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا تو اسے سزائے موت نہیں ہوگی۔“ پھر کیلاش ناتھ نے دھمکی دی۔ ”نہیں تو وہ پولیس کے سامنے زیادہ دن تک نہیں ٹک سکے گا، بری طرح مارا جائے گا۔“

اس سے پہلے کبھی کسی نے رکنی سے ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ لوگ اس کا ادب کرتے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ رکنی کے سامنے مجھ برا کہہ سکے۔

بلونت سنگھ کو اس کا پتا بھی نہیں چلے گا۔

شادی کی یہ دعوت ہی اس غدار کی موت کا سبب ہوئی۔ میں نے روپا کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔

جس روز اور جس وقت جگن ناتھ کو شادی میں شرکت کرنا تھی، میں نے اس کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا منہ چہرے میرے سامنے تھا۔ وہ بنا ٹھٹھا نظر آ رہا تھا۔

”بس دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے پولیس والوں سے کہا۔ ”ڈر کے مارے بند ہو کر رہ گیا تھا۔“

”دو مسلح آدمی ساتھ لیتے جاؤ۔“ ایک پولیس افسر نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں۔“ جگن ناتھ نے انکار کر دیا۔ ”یہ میرے ٹھاکر پن کی بے عزتی ہے۔ بلونت سنگھ ٹھاکر ہے تو میں بھی ٹھاکر ہوں۔ پھر یہ کہ پولیس والے میرے ساتھ ہوئے تو میں دوسروں کی نظر میں بھی آ سکتا ہوں۔“ بات کرتے ہوئے پہلے تو اس نے سینہ تان لیا، پھر چہرے سے قدرے خوف جھلکنے لگا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ پولیس نے کہہ دیا۔

لیکن اصل مرضی تو قدرت کی تھی۔ جگن ناتھ کو اس کی موت بلاری تھی۔

گاؤں میں داخل ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وہ اپنی بہادری کی بڑبانگ رہا تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے چوٹا دیا۔ ایک گھڑ سوار ہاتھ میں رائفل تانے بڑی دلیری کے ساتھ چھینٹا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جگن ناتھ نے اسے اپنی ہی طرف لپکتے دیکھا تو اس کی تپتی ہوئی گروں، ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر مجھے پسینہ بہتا ہوا نظر آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔

پھر اس سے پہلے کہ جگن ناتھ بھاگ جاتا، اسے مسلح افراد نے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

”کے!“ روپا اس کا گریبان پکڑ کر گر جا۔

جگن ناتھ جھٹکا کھا کر پانچ گز دور جا گرا۔ روپا گھوڑے سے کودا۔ پھر اس نے چت پڑے ہوئے جگن ناتھ کے سینے پر پیر رکھ دیا۔

”بے ایمان.....! غدار.....! تیرا وقت ختم ہو گیا۔“ روپا ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھا۔

جگن ناتھ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے روپا کو رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑنا چاہا۔ اسی وقت روپا نے اس کے چہرے پر ٹھوکر ماری۔ زبردست ٹھوکر سے جگن ناتھ کا ایک رخسار پھٹ گیا۔

اس وقت دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ لوگ کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے جگن ناتھ کا انجام دیکھ رہے تھے۔

”سالے کو رسی سے باندھ لو۔“ روپا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

وجہ سے میری کمرٹھ گئی ہے۔ اب میرے چہرے سے واضح طور پر بڑھاپا جھلکنے لگا تھا۔ بات تھی بھی سچ۔ رکنی سے جدائی برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ راتوں کو میں اکثر جاگتا رہتا اور کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آتی۔ اسی دوران ایک روز میں روپا سے مخاطب ہوا۔ ”روپا! پولیس کی دھمکی چاہے غلط ثابت ہو، مگر لگتا ہے اب اوپر والا مجھے مہلت نہیں دے گا۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ کسی دن اچانک میرا بلاوا آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں ذہنی طور پر روپا کو تیار کر رہا تھا کہ یہ جسم چھوڑ کر چلا جاؤں تو اسے زیادہ ملال نہ ہو۔ یہ جسم چھوڑنے کا مطلب ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت ہی ہوتی۔ ”روپا! اس سے پہلے کہ میری آنکھیں بند ہوں جگن ناتھ کو کسی طرح اس کی غداری کی سزا ملنی چاہئے۔“ میں ابھی تک غدار جگن ناتھ کو بھولا نہیں تھا۔ میرے دل میں یہ کانٹا بڑی طرح کھک رہا تھا۔ جگن ناتھ کی غداری کے نتیجے ہی میں تحصیل دار پہلے زخمی اور پھر گرفتار ہوا تھا۔ جب تک جگن ناتھ زندہ تھا، میں سکون سے کیسے رہ سکتا تھا۔

”تاما! میں بھی اسی کی فکر میں ہوں۔“ روپا نے جواب دیا۔ ”میں نے اس پر کڑی نظر رکھی ہوئی ہے۔ ہمارا مخبر ہر وقت اس کی ناک میں رہتا ہے۔“ پھر اس نے دانت پیسے اور کسنے لگا۔ ”لیکن وہ بزدل پولیس کے پہرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔“

روپا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھ سے بہتر بھلا کون اس بات کو جانتا۔ میں اپنے تصور کی پراسرار قوت کو کام میں لا کر کئی بار غدار جگن ناتھ کو پولیس کے تخت پہرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے روپا سے کہا۔ ”دیکھنا اس سے پہلے ہی میری روح جسم کا ساتھ نہ چھوڑ جائے۔“ یہ کہہ کر میں نے ٹھٹھا سانس بھرا۔

میرے ان الفاظ نے روپا کو جیسے مجسم شعلہ بنا دیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ”جان خطرے میں ڈال کر بھی اسے ختم کر دوں گا۔“

جگن ناتھ کے بارے میں مخبروں سے بھی مجھے اطلاعات مل رہی تھیں۔ ان سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ موت اس کے سر پر منزل لا رہی ہے۔ اسے یہ نظر بندی کھک رہی تھی جس کا وہ کئی افراد سے اعتماد بھی کر چکا تھا۔ مجھ سے غداری کے صلے میں اسے زمین اور نقد رقم ملی، مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ چوبیس گھنٹے پولیس کے گھیرے میں رہتا۔ یہ جیل جیسی زندگی تھی۔ لوگ آزادانہ گھومتے اور مزے اڑاتے، لیکن پیسے ہونے کے باوجود وہ مجبور تھا۔ غم بھلانے کے لئے وہ شراب پیتا۔

گاؤں کے ایک رشتے دار نے اسے شادی کا دعوت نامہ بھیجا تو وہ چڑ گیا۔ مجھے بھی اس کی خبر مل گئی کہ جگن ناتھ نے اپنے چند خاص دوستوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ ذلیل لوگ مجھے مدعو کر کے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں باہر نہیں نکل سکتا۔ اب میں شادی میں شریک نہ ہوا تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے کہ دیکھا، جگن ناتھ نہیں آیا۔ کیسے آئے کہ اس کا باپ ٹھاکر بلونت سنگھ جو سینے پر سوار ہے۔ نہیں نہیں، اس مرتبہ میں لوگوں کو یہ موقع نہیں دوں گا کہ وہ میرا مذاق اڑا سکیں۔ میں خاموشی کے ساتھ شادی میں شرکت کر کے سب کو حیرت زدہ کر دوں گا۔ میں دو گھنٹے کے اندر اندر لوٹ آؤں گا۔ ٹھاکر

روپا کی بے رحمی سے جگن ناتھ اچھی طرح واقف تھا۔ شاید اسی لئے وقت سے پہلے ہی اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی تھی۔ جب اسے باندھا گیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ روپا گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھی دور نکل گئے تو روپا نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا الف ہو گیا تو اس نے ایک دم لگام چھوڑ دی۔ گھوڑے نے دوڑ لگائی اور جگن ناتھ پیچھے گھسٹنے لگا۔

لوگوں نے جگن ناتھ کو گھسٹتا، ٹکراتا اور چپٹا چلاتا دیکھا تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں کہ بند آنکھوں سے مجھے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ غدار جگن ناتھ کو روپا میرے ہی پاس لے کر آتا۔

پھر جب روپا نے جگن ناتھ کو میرے سامنے پیش کیا تو اس کا عضو عضو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس غدار کو اپنے سامنے دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور چیخ اٹھا۔ ”ذلیل..... بے ایمان..... غدار..... کتے.....“ ایک ایک گالی کے ساتھ جگن ناتھ پر میری لاشیں برسے لگی۔

ذرا سی دیر میں جگن ناتھ کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑ گئے۔ اس کی آخری چیخیں چنبل کے کٹاؤ میں دفن ہو چکی تھیں۔

جگن ناتھ کی لاش اسی رات اس کے گاؤں میں پھونکا دی گئی۔

دوسرے دن مجھے اپنے ایک تجربے سے پولیس کا رد عمل معلوم ہوا۔ جگن ناتھ کے قتل نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پولیس کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھی جگن ناتھ کا انتظار کر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب کوئی میری خبری کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ پولیس کو براہ راست مجھ سے ٹکراتا ہو گا۔

☆=====☆

اگلے تین ماہ چنبل کے کٹاؤ گولیوں کی آدازوں سے گونجتے رہے۔ پولیس کے مسلح دستے دن رات میری تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر بھاگتا رہا۔ موقع ملنے ہی میں ڈاکا ڈا کر پولیس کے منہ پر چائنا مار دیتا۔ میں اور پولیس دونوں ہی مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

سورج مغرب کی جانب جھک رہا تھا۔ جگہ جگہ چنبل کے کنارے پولیس کی پٹریں پڑاؤ ڈالے ہو۔ تمہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو لئے پچا پچاتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں میری دانست میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کئی روز سے دن رات بھاگتے بھاگتے میرے ساتھی تھک چکے تھے۔ میرے حکم پر سب آرام کرنے لگے مجھے گمان بھی نہ تھا کہ رکنی سے بیشہ کے لئے پھرنے کی گھڑی آ پہنچی ہے، نہ یہ خبر تھی کہ ڈاکا بولنت سنگھ کے جسم میں وہ میرا آخری دن ہے۔

بس اچانک ہی مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر جنم کے دہانے کھل گئے تھے۔ سنسناتی ہوئی پہلی لاکھن کے شانے کو چسپاں گئی۔ میرے ساتھیوں نے ہوشیار ہو کر ہتھیار اٹھائے۔ روپا اور صوبیدار نے آ ساتھ ٹریگر دبائے تھے۔ میں نے ایک درخت کی آڑ لے لی تھی۔ صورت حال کا اندازہ لگانے کے لئے

نے پیچھے ہی درخت کے تنے سے سر نکال کر باہر جھانکا، ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے پہلو سے گزر گئی۔ لمحے بھر کو مجھے خیال آیا کہ میں اب تک بہت خطرناک کھیل کھیلتا رہا ہوں۔ اگر مجھے گولی لگ جائے اور میں اس جسم سے فرار نہ ہو سکوں تو جن زاد ہونے کے باوجود میرا ”دی اینڈ“ کتنے دیر نہیں لگے گی۔ میں نے سوچا، لیکن اسی کے ساتھ خود کو نشانہ بنائے جانے پر میں شیر کی طرح بپھر گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی لاشی پھینک کر رائفل اٹھالی۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ میرے مقابلے پر زرنجن سنگھ ہے۔ میں تو اس وقت چونکا جب مجھے اس کی بلند آواز سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ”بوڑھا بلونت سنگھ!“ زرنجن سنگھ نے چیخ کر کہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر زرنجن سنگھ پر گولی چلاتا، اس کی گولی میرے پیر کو رگڑتی ہوئی گزر گئی۔

لاکھن زخمی ہونے کے باوجود مجھے آڑ میں لے کر فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ ”نہیں لاکھن، مجھے لڑنے دے۔ کتوں کو ختم کرنے کا اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

زرنجن سنگھ کے ساتھ ہی ایس پی گوہند تھا بھی تھا۔ وہ جوش میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نشانہ لیتے دیکھا۔ اسی لمحے خود میں بھی اس کا نشانہ لے چکا تھا۔ یقیناً وہ ایک ہی لمحہ تھا کہ جب گوہند تھا اور میں نے ایک دوسرے پر گولی چلائی۔ دورا نکلوں کے ٹریگر ایک ساتھ دبے۔ ادھر گوہند ٹپا اپنا سینہ تھامے گرا، ادھر میرے سینے میں آگ سی بھر گئی۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اب ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم کو چھوڑنے کا وقت آ گیا۔ میں نے اگر ایسا کرنے میں تاخیر کی تو مارا جاؤں گا۔ میرے آنکھوں کے آگے اندھیرا رقص کرنے لگا تھا۔ میرے سینے سے گرم گرم خون بہہ کر زمین کو سرخ کر رہا تھا۔ میرا سانس گھٹنے لگا، رگیں ٹوٹنے لگیں۔ اسی وقت میری زبان ذرا سی سرسرائی اور ہونٹ پھڑپھڑائے۔ ”بے بھوانی۔“

پھر میں ایک ہی جھٹکے میں ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم سے باہر آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بلونت سنگھ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”تایا!“ روپا چیخ اٹھا۔ اس پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بلونت سنگھ کے مردہ جسم کے قریب کھڑا ہوا گولیاں برسانے لگا۔ ”ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“ وہ پھر گیا۔

بلونت سنگھ کے مرنے سے پولیس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ زرنجن سنگھ نے پولیس والوں کو لٹکارا۔ جب سے میں نے بھوانی کا جاپ کیا تھا، زیادہ دیر کسی آدم زاد کے جسم سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے لئے کوئی نہ کوئی قالب ضروری تھا، خواہ وہ قالب حیوانی ہی کیوں نہ ہو۔ ذرا سی دیر میں مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہونے لگا اور میرے وجود میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

”کچھ لوگ عقب میں چلے جاؤ۔ ڈاکوؤں کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔“ زرنجن سنگھ کی آواز مجھے سنائی دی۔

میرے ایک ماتحت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”سر! ہماری مدد کے لئے پولیس کی ایک اور کھڑی آگئی ہے۔“ میں اس وقت تک زرنجن سنگھ کے جسم سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔

☆=====☆

صوبائی ہوم منسٹر کیلاش ناتھ نے رات کو دس بجے ہنگامی طور پر پریس کانفرنس بلائی۔ اس پریس کانفرنس میں ڈی آئی جی کراچی کی حیثیت سے میں بھی موجود تھا۔ کیلاش ناتھ کا چہرہ خوشی سے تھم رہا تھا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ کو اس کے انجام تک پہنچا دیا گیا۔ وہ ختم کر دیا گیا۔“ کیلاش ناتھ نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا۔ ”بلونت سنگھ کے ساتھ ساتھ ہی اس کا بیٹا صوبیدار بھی مارا گیا۔“ اخباری نمائندے اس غیر متوقع اعلان پر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ”ناممکن..... یہ نہیں ہو سکتا۔“

پھر اخباری نمائندوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ”کہاں؟ کیسے؟ کس جگہ؟ ٹھاکر بلونت سنگھ کس کے ہاتھوں مارا گیا تھا؟“

کیلاش ناتھ نے ہر سوال کا جواب بہت اطمینان سے دیا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا کیا ثبوت ہے؟“ کسی اخباری نمائندے نے سوال کیا۔ کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ یہ سوال کرنے والے کا ٹکٹ صحیح تھا۔ پہلے بھی ٹھاکر بلونت سنگھ کے مرنے کی افواہیں کئی بار گفت کر چکی تھیں۔ جھوٹی خبریں چھاپ کر اخبار والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”آپ کو ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا یقین آجائے گا۔“ کچھ دیر بعد کیلاش ناتھ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بلونت سنگھ کی بیوی اس کا یقین دلائے گی۔“

پھر پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔ کیلاش ناتھ نے میری توقع کے مطابق مجھی کو حکم دیا کہ رکنی کو ساتھ لے کر آؤں۔

میں اوریت پورہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس وقت میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جانے میری محبوبہ کس حال میں ہوگی۔

میری جیب آخر کار اوریت پورہ پہنچ گئی۔ جیب کو میں نے رکنی کے گھر کے سامنے ہی کھڑا کیا تھا۔ دستک دینے پر رکنی کا بھائی باہر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک لاش کی شناخت کرانے کے لئے رکنی کو ساتھ لے جانا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے سے لگا ہوا سب کچھ سن رہا ہے۔ میرے خیال کے مطابق وہ رکنی ہی ہو سکتی تھی۔

رکنی کا بھائی اندر چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ وہ رکنی ہی سے مخاطب تھا۔ ”بہن! ڈی آئی جی صاحب آئے ہیں۔“

”کیا کام ہے؟“ رکنی کی اداس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”کسی لاش کی شناخت کرانا ہے۔“ رکنی کے بھائی نے بتایا۔

”لاش!“ رکنی کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”کس کی لاش؟“

زرنجن سنگھ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے میری محبوبہ رکنی سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہے۔ اسے اس کی سزا ضرور ملنا چاہئے۔ میں نے سوچا اور سزا کا فیصلہ کر لیا۔ ”سزا“ سزائے موت ہی تھی۔

جس وقت میں ’زرنجن سنگھ کے قریب پہنچا‘ لاکھن کو گولی کھا کر مرتے دیکھا۔ وہ جس سردار بلونت سنگھ کی زندگی بھر تمکبانی کرتا رہا تھا، اسی کے قریب لیٹ گیا۔

”روپا! تم پولیس کو سنبھالو، میں باپو کا جسم بھاتا ہوں۔“ میں نے صوبیدار کی آواز سنی جسے بلونت سنگھ کے مردہ جسم کی فکر تھی۔ باپ کی موت پر آنسو بہانے کا یہ موقع نہیں تھا۔ صوبیدار کو اپنے باپ کے مردہ جسم کی فکر اس لئے تھی کہ ہندو عقیدے کے مطابق بیٹے کے ہاتھوں آخری رسوم ادا ہونے ہی مرنے والے کی روح کو سکون ملتا تھا۔ صوبیدار کے لئے اسی سبب رونے کی بجائے یہ جان لٹا دینے کی گھڑی تھی۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کسی صورت پولیس کے ہاتھ نہ لگے، اس کی یہی کوشش تھی۔

روپا اور دوسرے ساتھی، پولیس کو الجھانے کی خاطر تیزی سے فائرنگ کرنے لگے۔ کبھی کبھ صوبیدار بھی اپنے باپ کی لاش گھینٹتے ہوئے فائر کرتا۔

زرنجن سنگھ اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”بلونت سنگھ کی لاش ہمارے ہاتھ سے نہ جانے پائے ورنہ ثبوت ختم ہو جائے گا کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور.....“ اس جملہ ادھر واپس رہ گیا۔ میں اس کے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔

حسب معمول مجھے اس نئے آدم زاد کے جسم میں داخل ہو کر رگ و ریشے میں اترتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، مگر اس طرح جیسے وہ کوئی خواب ہو۔ اسی عرصے میں صوبیدار نے باپ کی لاش کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ اسے غالباً لاش کو گھسیٹنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میرے ایک ماتحت بنواری نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے صوبیدار پر گولی چلائی اور یوں صوبیدار بھی مارا گیا۔ باپ اور بیٹے کی لاشیں لڑھک کر ایک جھاڑی میں اٹک گئیں۔

روپا سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور دردناک آواز میں بولا۔ ”ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا..... باپ جیسا تایا اور بھائی جیسا صوبیدار دونوں گئے..... نہیں نہیں، نہیں ہو سکتا۔“ وہ چیختا ہوا لاشوں کی طرف بڑھا۔

لاشیں پندرہ بیس گز دور پڑی تھیں اور اب لاشوں پر قبضہ کرنے کے لئے زور آزمائی شروع ہو چکی تھی۔

روپا آہستہ آہستہ لاشوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی اسے آڑ میں لئے ہوئے تھے اب سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

”لوٹ جاؤ کتو!“ روپا کی بلند آواز آئی۔

جواب میں پولیس کی طرف سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ روپا کو شاید یہ آس تھی کہ اندھیرے آدھ سے پولیس آگے نہیں بڑھے گی اور صحیح نشانہ بھی نہیں لے سکے گی، مگر پھر یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔

”یہ انہوں نے نہیں بتایا۔“

مجھے علم تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اور صوبیدار کا نام سن کر رکنی پھر جاتی پھر اسے گوالیار لے جانا مشکل ہو جاتا۔

ذرا ہی دیر میں رکنی چادر اوڑھے باہر آئی تو اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اسے خالص عرصے بعد دیکھا تھا۔ اس عرصے میں وہ بالکل ڈھے گئی تھی۔ پھول بالکل مرجھا گیا تھا۔ اس پر خزاں چھا گئی تھی۔ یہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کے بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا حسین جسم ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہا تھا۔ یقیناً یہ وہ رکنی ہرگز نہیں تھی جو میری محبوبہ تھی اور میں جس کا دیوانہ تھا۔ جوان بیٹوں کا غم اسے کھا گیا تھا۔

جو سوال اس نے اپنے بھائی سے کیا تھا، مجھ سے بھی کیا کہ لاش کس کی ہے؟

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے دانستہ نہیں بتایا۔ ”مجھے تو اوپر سے حکم ملا تھا کہ آپ کو گوالیار پہنچا دوں۔“

رکنی کے ساتھ اس کا بھائی بھی تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ جیب میں بیٹھ گئی۔ گوالیار تک خاموشی رہی۔

آخر وہ بری گھڑی آ ہی گئی۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی سانسے پڑی تھی۔ رکنی کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے اشارے پر ایک پولیس والا لاش کے چہرے سے چادر ہٹانے کو جھکا۔

چادر ہٹتے ہی رکنی کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ ”ٹھاکر!“ اس نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔ رکنی کو یوں بین کرتے دیکھ کر میرے دل پر بھی چوٹ سی گئی۔

وہ مظلوم عورت بے خبر تھی کہ اس کا شوہر ٹھاکر بلونت سنگھ تو بہت عرصے پہلے مر چکا تھا، اس وقت جب میں نے اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا۔ رکنی سے تو میں عشق کرتا رہا تھا جو آج بھی زندہ سلامت تھا، ہاں اب جسم دوسرا تھا۔ میں زنجبیں سنگھ کے جسم میں تھا۔

ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔

مسکراتا چہرہ، سفید مونچھیں، تین چار دن کی بڑھی ہوئی داڑھی، پیشانی پر ابھری ہوئی شکنیں، چپکتی ہوئی بے جان آنکھیں، یہ بلونت سنگھ ہی تھا جو شیر کی طرح زندہ رہا تھا اور شیر کی طرح مرا تھا۔ رکنی نے جبکہ کر بلونت سنگھ کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ آخری ملاپ تھا اور پھر بیشک کی جدائی تھی۔

معا رکنی کے بچتے ہوئے آنسو ختم گئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی کی طرف بڑھایا اور بلونت سنگھ کی بے جان کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے ساگ کا نشان مٹا دیا، کلائی کی سبز چوڑیاں توڑ دیں۔ یہ چوڑیاں میں نے ہی اسے لاکر دی تھیں۔ چوڑیوں کے ٹکڑے رکنی کی پیوگی کی چٹلی کھاتے ہوئے زمین پر بکھر گئے۔

”اب دوسری لاش کی شناخت کرنا ہے۔“ میرے ہونٹ ہلے۔

رکنی چونک اٹھی اور پھر کہنے لگی۔ ”ارے بے رحمو! تم ایک عورت کے دل پر کتنے زخم لگاؤ گے؟“

پھر جب صوبیدار کی لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی تو رکنی نے آنسو نہیں بہائے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ”باپ کے لئے ایک بیٹے نے بھی اپنی جان دے دی۔“ جب رکنی کو لاشوں کے پاس سے ہٹا دینے کی بادی آئی تو اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ وہ بولی۔ ”لاشیں میں لے جاؤں گی۔“

صوبائی وزیر داخلہ کی لاش ناٹھ پہلے ہی یہ حکم جاری کر چکا تھا کہ لاشیں رکنی کے حوالے نہ کی جائیں۔ میں نے اسی لئے جی کڑا کر کہہ ہی دیا۔ ”یہ..... یہ نہیں ہو سکتا۔ لاشیں لے جانے کا حکم نہیں ہے۔“ جو بہانہ تحصیل دار کی لاش کے سلسلے میں کیا گیا تھا، اس مرتبہ بھی وہی بہانہ حکومت نے کیا تھا کہ ایسا کرنے سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔

”ارے ظالمو!“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”ہمیں تم باپ بیٹے کی آخری رسوم بھی ادا نہیں کرنے دو گے؟“

خردوں کے ساتھ بھی دشمنی کر رہے ہو۔

رکنی بہت گڑگڑائی، اس نے بہت آنسو بہائے، مگر میں مجبور تھا۔ خالی پیشانی، بغیر چوڑیوں کے ہاتھ، زخمی دل اور مایوس قدموں کے ساتھ رکنی پلٹی اور پھر چند ہی قدم چل کر ڈھیر ہو گئی۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا، لیکن وہ میرے پہنچنے تک دم توڑ چکی تھی۔ اس سے شوہر اور جوان بیٹے کی موت کا دہرا صدمہ برداشت نہیں ہو سکا تھا۔

☆=====☆=====☆

گوالیار کے کیمپ کا میدان انسانی سروں سے بھر چکا تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے وزیراعظم کی تقریر سننے نہیں آئے تھے، اس شخص کو دیکھنے آئے تھے جس کے متعلق انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن اب تک اسے دیکھا نہیں تھا۔

پولیس والے شاید لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اب زندہ نہیں رہا یا پھر وہ اپنی بہادری کی نمائش کر رہے تھے۔ ایک ایک پولیس افسر جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ ہر ایک سینہ پھلائے کھڑا تھا۔ سب کے چہروں سے غور جھلک رہا تھا۔ ہر افسر کی آنکھیں گویا ایک ہی بات کہہ رہی تھیں کہ آخر کار ہم بلونت سنگھ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں ہرگز یہ علم نہیں تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ تو بہت پہلے رہائی پانے سے قبل ہی مر چکا تھا۔ وہ تو ایک جن زاد، یعنی میں تھا جو اتنے عرصے پولیس سے برسریکا رہا تھا اور آج بھی ان کے درمیان موجود تھا۔ وہ مجھے ختم نہیں کر سکے تھے۔ میں خود کو اس بھیڑ میں تھا تھا سا محسوس کر رہا تھا۔

ٹھاکر بلونت سنگھ کے مردہ جسم کو چارپائی سے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ چارپائی اتنی اونچائی پر رکھی گئی تھی کہ سب لوگ دیکھ سکیں۔ ہلکے سبز رنگ کی چپک کی قمیض، گلے میں کالا، لمبا قد، رعب دار چہرہ، یہ جگل کا شیر ٹھاکر بلونت سنگھ تھا جس نے پورے اکیس سال تک پولیس کو اپنی انگلیوں پر نچایا تھا۔ اس نے

میں نے اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا۔ اب تو مجھے بس اس کے مردہ جسم سے نجات حاصل کرنا تھی۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھا کر مجھے اسی روز شام کو یہ موقع مل گیا، مگر ایک آدم زاد کے جسم کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدم زاد کے جسم میں داخل ہوتے وقت اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی دشواری محسوس نہیں کی تھی۔

وہ زنجن سنگھ کا نوجوان، وجہ اور خوبصورت، بہتجاوے سنگھ تھا۔ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ اچھی صحت کی وجہ سے چھ سات سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔ برسوں بعد وہ گزشتہ روز ہی اپنی نھیال سے ناک پور آیا تھا۔

زنجن سنگھ کا بڑا بھائی سوہن سنگھ تھا جو اپنے چھوٹے بیٹے وجے کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا۔ زنجن سنگھ کا بہتجاوے مجھے پسند آیا۔ وہ دونوں مجھ سے مل کر گئے تو میں نے زنجن سنگھ کی بیوی سے کہا۔ ”میں اندر کمرے میں کچھ دیر آرام کرنے جا رہا ہوں۔ کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ہاتھ پیر دبا دوں“ تھکن اتر جائے گی۔“ زنجن سنگھ کی بیوی معنی خیر لہجے میں بولی۔ وہ خاصے ذیل ڈول کی مالک تھی۔

”نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا اور اندر والے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا۔

یہ اس شخص کا جسم تھا کہ جس کی وجہ سے ٹھاکر بلونت سنگھ مارا گیا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر میں نے اس سے انتقام لے لیا تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پڑی تھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اس پر لیٹ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے ”بے جھوٹی“ کا نعرہ لگا کر زنجن سنگھ کے جسم سے باہر آ گیا۔ میں نے زنجن سنگھ کے مردہ جسم پر آخری نگاہ ڈالی اور اس بند کمرے سے نکل آیا۔

وجے اپنے باپ کے ساتھ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ میں نے اس کے جسم میں داخل ہونا چاہا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ میرے وجود کو جھٹکا سا لگا اور میں دور جا کر ا۔ میری حالت خراب ہونے لگی۔ میرے لئے یہ بات شدید حیرت کا سبب تھی کہ میں کسی آدم زاد کے جسم میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔

وہ دونوں باپ بیٹے آگے بڑھ چکے تھے۔ میں ایک بار پھر ان کے پیچھے لپکا۔ اس مرتبہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ وجے پر حملہ کیا۔ وجے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے باپ سوہن سنگھ نے گہرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا بیٹے؟“

وجے اس قابل نہیں تھا کہ کوئی جواب دے پاتا۔ وہ تو اپنا سینہ پکڑے جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے آدھے جسم میں اتر چکا تھا۔ سوہن سنگھ نے اپنے جھٹکے ہوئے بیٹے کو سنبھال لیا۔ معاً مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت کے ساتھ میرے وجود کو وجے کے جسم سے باہر دھکیل دیا ہو۔ میں اس کے جسم سے چل کر باہر آ کر ا۔

گیارہ سو ڈاکے ڈالے تھے اور ایک سو پچاس خون کر چکا تھا۔ آخری سال میں اس نے پولیس سے تقریباً (81) مقابلے کئے۔ ان مقابلوں میں دو درجن کے قریب پولیس والے ہلاک ہوئے تھے اور ایک درجن سے زیادہ اس کے ساتھی مارے گئے تھے۔ اسے ختم کرنے کے لئے پولیس نے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے تھے۔ اسی ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کو دیکھ کر لوگ رونے لگے تھے۔ کیا وہ لوگ پاگل تھے؟ ایک ڈاکو کی موت کا سوگ کیوں منایا جا رہا تھا؟

مجھے اس کا سبب معلوم تھا۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کا دیدار کرنے والوں میں بہت سے لوگ وہ تھے جن کی مدد اگر بلونت سنگھ نہ کرتا تو ان کی جوان بیٹیوں کی کبھی ڈولی نہ اٹھتی۔ ایسے لڑکے بھی تھے جو بلونت سنگھ کے تعمیر کردہ مسافر خانوں میں رہ چکے تھے۔ بھلا وہ لوگ بلونت سنگھ کی موت پر کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ انہیں رنج تھا کہ ان کے سردوں پر ہاتھ رکھنے والا ان سے جدا ہو گیا۔

یہ تماشا میں زیادہ دیر نہ دیکھ سکا اور بقیہ کارروائی اپنے ماتحتوں کے سپرد کر کے چلا آیا۔ پولیس ہیڈ آفس پہنچ کر اپنے کمرے میں بیٹھے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آئی جی پولیس نے طلب کر لیا۔

میں آئی جی کے کمرے میں پہنچا تو اس نے کہا۔ ”ہوم فیسٹر کی لاش ناٹھ جی تم سے بہت خوش ہیں۔ تم کیونکہ ایک طویل عرصے تک ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرنے کے لئے اس سے برسرِ پیکار رہے ہو اس لئے اگر چاہو تو چند مہینے آرام کر سکتے ہو۔ چھٹی کی درخواست لکھ دو، میں فوراً منظور کر لوں گا۔“

میں فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔ یوں بھی مجھے اب اس علاقے میں رہتے ہوئے دشت ہو رہی تھی۔ میں وہاں سے کہیں بہت دور نکل جانا چاہتا تھا، کسی ایسی جگہ جہاں کوئی ٹھاکر بلونت سنگھ کا نام لینے والا نہ ہو، جہاں ماضی کی یادوں کا غبار میرے دل سے نکل جائے۔ اس کے علاوہ مجھے ادویز عمر زنجن سنگھ کے موجودہ جسم سے بھی نجات حاصل کرنا تھی۔ میں اب کسی نوجوان کے جسم کو اپنانا چاہتا تھا۔

میں نے فوراً تین مہینے کی چھٹی کے لئے درخواست دے دی جو آئی جی نے اسی روز منظور کر لی۔ دوسرے ہی روز اپنے ایک ماتحت کو چارج دے کر میں امرتسر کے ایک گاؤں ناک پور کے لئے روانہ ہو گیا۔ زنجن سنگھ پنجاب کے اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پنجاب تک کا سفر زنجن سنگھ کے جسم ہی میں کروں گا اور پھر وہاں پہنچ کر پنجاب کے کسی گھروں نوجوان کے جسم میں داخل ہو جاؤں گا۔

پنجاب کے سرسبز و شاداب علاقے میں داخل ہو کر مجھے عجیب سی تازگی اور فرحت کا احساس ہوا۔ ناک پور بڑا خوبصورت گاؤں تھا۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے جب میں ’زنجن سنگھ کے گھر میں داخل ہوا۔ سارے گھر میں میری آمد سے خوشی کی لہری دوڑ گئی۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ جلد ہی یہ گھر ماتم کدہ بننے والا ہے۔ زنجن سنگھ کو میں اپنے عہد کے مطابق پہلے ہی سزائے موت دے چکا تھا۔ وہ تو اسی دم مر گیا تھا جب

لبے لبے سانس لیتا ہوا دے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ سوہن سنگھ کے استفسار پر ہانپتے ہوئے اسے بتانے لگا۔ ”کوئی..... نہ جانے کون میرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دو..... دو مرتبہ وہ مجھ پر حملہ کر چکا ہے۔“

سوہن سنگھ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ وجہ کی بات سمجھنے سے قاصر ہو۔

میرے وجود میں شعلے سے بھڑکنے لگے تھے اور میں انتہائی اذیت سے گزر رہا تھا۔ تیسری مرتبہ اپنی پوری قوت کے ساتھ میں نے وجہ کو دبوچ لیا۔

وجہ کے جسم میں قرار پانے اور اس کے رگ وریشے میں اترنے کے لئے مجھے انتہائی جدوجہد کرنا پڑی، لیکن اس بار میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے وجہ کے جسم پر فٹ پائی تھی۔ میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے دیکھا، سوہن سنگھ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کچھ بتا تو سہی بیٹے کہ تجھے ہوا کیا.....؟ بول نا۔“ سوہن سنگھ گھبرا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں..... اب ٹھیک ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور وہ..... وہ جو تیرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا.....“

”بھاگ گیا۔“ میں بول اٹھا۔

”اچھا چل، جلدی گھر چل۔“ سوہن سنگھ میرا بازو پکڑ کر اپنی دانست میں سہارا دینے لگا۔

”مجھے سارے کی ضرورت نہیں باپو۔“ میں بولا۔ ”میں خود چل سکتا ہوں۔“

”تیرے نانا کو آج ہی اپنے گاؤں واپس جانا ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے گردن ہلا دی۔

جلد ہی میں، سوہن سنگھ کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے سوہن سنگھ کی ادھیڑ عمر بیوی اور ایک بوڑھے کو دیکھا۔ یہی بوڑھا، سوہن سنگھ کا سر تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری سماعت سے جو الفاظ ٹکرائے انہیں سن کر میں چونک اٹھا۔ بوڑھ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ بتا کہ اب تیرا دے دشمنوں سے بدلہ لینے کے قابل ہو گیا ہے یا نہیں؟“

سوہن سنگھ کی بیوی کوئی جواب دینے بغیر ایک دم اٹھی اور بولی۔ ”میں ابھی آئی بابا۔“

بوڑھے کے برابر ہی چار بابی پر سوہن سنگھ بیٹھ گیا۔ مجھے اس کے چہرے پر فکر مندی کے سے آثار نظر آرہے تھے۔ اس فکر مندی کی وجہ فوری طور پر میں نہ سمجھ سکا۔

ذرا ہی دیر کے بعد سوہن سنگھ کی بیوی تین بڑے بڑے گھاسوں میں لسی بنا کر لے آئی۔ بوڑھے نے اپنی بیٹی سے گھاس تولے لیا مگر اسے پیٹے ہوئے جھینکنے لگا۔ یہ دیکھ کر سوہن سنگھ کی بیوی مسکرائی اور بولی۔ ”بابا! یہ تمہاری ہی دی ہوئی بھینس کے دودھ کی لسی ہے۔ چار سال پہلے تم ہی تو بھینس بھجوائی تھی کیا بھول گئے۔“

بوڑھا بھی مسکرا دیا اور لسی پینے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اکثر ہندو اور سکھ گھرانے کے لوگ ہن

بیٹیوں کے گھر کھانا پینا پسند نہیں کرتے۔

اسی وقت پڑوس کے گھر سے ایک دراز قد اور متناسب جسم کی ایک عورت گھونگھٹ کاڑھے اور ہاتھ میں خالی مٹکا اٹھائے نکلی۔

”کون ہے یہ عورت؟“ بوڑھے نے دھیمی آواز میں اپنی بیٹی سے پوچھا۔

”یہ کلنٹا ہے، پڑوس کی بڑی ہو۔“ بوڑھے کو جواب ملا۔

اس نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ دیا۔ ”دشمن کو پڑوسی کہتی ہے۔ خبردار یہ دشمن ہیں۔ انہیں کبھی پڑوسی مت کہنا۔ دشمن کو دشمن۔“

مایاکور، یعنی وجہ کی ماں بولی۔ ”لیکن یہ کلنٹا تو بڑی بھلی عورت ہے۔“

”اگر بھلی ہوگی تو اپنے لئے ہوگی۔“ بوڑھا غصے سے کہنے لگا۔ ”جانے کس کینے نے اس بد نصیب کو ان بد معاشوں کے گھر بھیج دیا۔ تو اسے اچھا سمجھتی ہے، مگر یہ سوچا ہے کہ اسی کے پیٹ سے تیری اولاد کے دشمن پیدا ہوں گے۔ میرے اور تیرے بیٹے کو قتل کرنے والے اسی کی کوکھ سے جنم لے کر پالنے میں جھولیں گے۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت ہے۔“ بوڑھا غصے کی وجہ سے کانپنے لگا۔

میں دور کھڑا ہوا اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میری نظریں جاتی ہوئی عورت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی چال میں بلا کی نزاکت تھی۔ مجھے اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی کمر کی لچک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا، یہ عورت سامنے سے کیسی ہوگی؟

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سوہن سنگھ نے بات بدلنے کے لئے اپنے بوڑھے سر سے اس کے گاؤں اور رشتے داروں کی خیر خیریت پوچھنا شروع کر دی۔ اس کی بیوی کھانا پکانے کے لئے رسوئی (بادرچی خانہ) کی طرف چلی گئی۔

میں نے دونوں بزرگوں کو باتوں میں مگن دیکھا تو سوچا، کم از کم اس گھر کو تو دیکھ ہی لیتا چاہئے جہاں اب مجھے رہنا ہے۔ اس طرف آتے ہوئے میں نے اس گھر کی اوپری منزل پر دو کمرے بنے دیکھے تھے۔ سو میں گھر کی اوپری منزل پر چلا گیا۔

دونوں کمرے صاف ستھرے تھے۔ ایک کمرے کی دیوار پر گردناتک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی صفائی اگر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور ہوتی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں مجھے صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے صندوق کھول کر دیکھا تو اس میں مردانہ کپڑے، کپانیں اور تلواریں رکھی تھیں۔ کپڑوں میں سے میں نے ایک کرتہ نکالا اور اپنے جسم پر رکھ کر ناپنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کرتہ میرے موجودہ جسم کے ناپ کا تھا۔ وہ کرتہ میں نے پہن لیا اور آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، سرخ و سفید رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ اور بڑگوشت بازو۔ پھر میں نے صندوق سے تلوار نکالی۔ تلوار خوبصورت اور چمکدار تھی۔

مرف کپڑے سوکنے کے لئے پڑے تھے۔ ابھی میں اس عورت شکلتا کے دھیان میں گم تھا کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بوڑھا نانا کھڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا اس وقت پڑوس کی چھت پر شکلتا نہیں ہے۔ اگر بوڑھا اسے دیکھ لیتا تو جانے کیا سوچتا۔

”وجے“ بوڑھا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں دھرم مگر واپس جا رہا ہوں۔ ابھی روانہ ہو گیا تو اڑے پر بس مل جائے گی۔“ بوڑھا میرے کچھ اور قریب آ گیا اور کہنے لگا۔ ”بیٹے! میرا دیا ہوا سبق بھولنا مت۔“

میں نے جبکہ کر بوڑھے کے پیر چھونا چاہے۔ بوڑھے نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر سینے سے لپٹا لیا۔ ”یہ میری ڈانگ تو رکھ لے۔“ بوڑھے نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈانگ مجھے دے دی۔ ”تجھے معلوم ہے، میں یہ ڈانگ سوتے ہوئے بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔“

”تو پھر نانا، مجھے اپنی ڈانگ کیوں دے رہے ہیں، میرے پاس بھی تو ڈانگ موجود ہے۔“ میں بولا۔ بوڑھا مسکرایا اور کہا۔ ”وجے! تجھے یہ ڈانگ جیسی نظر آ رہی ہے ویسی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈانگ کا ایک سرا پکڑ کر زور لگایا تو ڈانگ کے اندر سے دوسرے سرے پر مگی ہوئی برچھی نکلی۔ بوڑھا بولا۔ ”تو اب سمجھ گیا ہو گا کہ میں یہ ڈانگ تجھے کیوں دے رہا ہوں۔ اس کو بڑی حفاظت سے رکھنا۔ قانوناً یہ ہتھیار رکھنا منع ہے، مگر تجھے ان چاروں سے نمٹنے کے لئے قانون وغیرہ کا خیال نہیں کرنا۔ تو اکیلا ضرور ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تو اب دشمنوں پر بھائی رہے گا۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے نے بڑی حقارت سے پڑوس کے گھر پر نظر ڈالی، پھر کہا۔ ”میں تھوڑے دنوں میں خشونت سیکھ کر بھی یہاں بھیج دوں گا تاکہ تیری تھائی ختم ہو جائے۔“ دونوں ماموں بھانجے مل کر رہنا۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں مل کر اس گاؤں پر راج کرو گے۔“

پھر وہ بوڑھا مجھے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ چند ہی روز میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا، اسے جان کر میں نیرت زدہ رہ گیا۔ اس نئے جسم کو اپنا کر بھی نفرت و انتقام کا کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔

سوہن سنگھ، یعنی وجے کا باپ بھی ایک پولیس افسر رہ چکا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اب اس کی گزر برزداشت پر تھی۔ پڑوسی جاٹ خاندان سے وجے کے خاندان کی دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جھگڑا دشمن پر ہوا تھا۔ جب بھی دونوں خاندانوں میں لڑائی ہوتی کوئی نہ کوئی مارا جاتا یا پھر اتنا شدید زخمی ہو جاتا کہ بات پولیس تک جا پہنچتی۔ وقتی طور پر خون خرابے کے بعد بات ختم ہو جاتی، مگر دلوں میں دشمنی کی ہنگامیاں اس وقت تک زندہ رہتیں جب تک نئی نسل بڑی ہو کر لڑنے کے قابل نہ ہو جاتی۔ ہمیشہ دونوں طرف سے آئندہ نسلوں پر نگاہیں ضرور ہوتیں۔ وجے کے دو بڑے بھائی اور ماموں ایسی ہی لڑائیوں میں نکل ہو چکے تھے۔ اس وقت وجے کا بڑا بھائی اے بیس سال کا اور اس سے چھوٹا بھائی بیس برس کا تھا۔ اس کے ماموں کی عمر بھی اتنی ہی رہی ہوگی۔ پورے علاقے میں ان تینوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وجے کا باپ سوہن سنگھ اس وقت پولیس افسر تھا۔ وجے اس کا سب سے چھوٹا

اتنے میں کہیں قریب ہی مجھے چوڑیوں کی ٹھکنٹا ہٹ سنائی دی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پڑوس کی عورت کپڑے سکھانے کے لئے چھت پر ڈال رہی تھی۔ یہ وہی دروازہ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے گھر کے دروازے کے پاس سے پانی بھرنے نکلی تھی۔ اس کی چال مجھے اب تک یاد تھی۔ میں اسے دیکھ جا رہا تھا۔ واقعی وہ بلا کی حسین تھی۔ عورت کے سر پر دوپٹا نہیں تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال کٹے ہوئے تھے۔ میں نے تلواریں واپس صندوق میں رکھ دی اور کمرے سے نکل کر اس عورت کو دیکھنے لگا۔ وہ کپڑے پھیلائے سے پہلے جھکتی تاکہ سلوٹیں دور ہو جائیں۔ جھکے کے ساتھ اس کے جسم کے خوبصورت اور حسین زادیئے مزید واضح ہو جاتے۔

اچانک اس عورت نے نظر اٹھائی۔ میری نظروں سے اس کی نظریں ٹکرائیں۔ میں سمجھا تھا کہ عورت شرما کر نظریں جھکا لے گی اور پھر شاید سامنے سے بھاگ بھی جائے گی، مگر اس کی نظریں تو جیسے پلٹا بھول گئی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر مجھے دیکھ جا رہی تھی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کو چھپانا چاہا، لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کچھ اور کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں وہاں سے ہٹ گیا۔ ابھی میں مڑا ہی تھا کہ چوڑیوں کی ٹھکنٹ پھر سنائی دی۔ وہ اب ہلکے ہلکے ٹروں میں ایک گیت گنگنا رہی تھی۔ اس پنجابی لوک گیت کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ”سوہنے کھڑے والے آج تجھے پہلی مرتبہ دیکھا ہے، مگر ایسا لگتا ہے جیسے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تجھے کہاں دیکھا ہے، شاید خوابوں میں دیکھا ہو۔“

گیت کے بول سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے سوچا، یہ تو شادی شدہ عورت ہے۔ پھر یہ مجھے دیکھ کر ایسا گیت کیوں گا رہی ہے؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عورت کے گانے کی آواز پھر آنے لگی۔ ”تیرے ہونٹوں کی زمین پر سبزے کا آغاز ہے۔ تو جوان ہو گیا۔ تیرا رنگ بھی گورا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ یقیناً وہ عورت میرے ہی لئے گیت گا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت گھر میں اس عورت کا مرد نہیں ہو گا، جیسی وہ ایسا گیت گا رہی ہے۔ اس گھر کے مرد کا خیال آتے ہی مجھے اس بوڑھے کے الفاظ یاد آ گئے جو میرے موجودہ جسم کے ناتے میرا نانا تھا۔ ”دشمن کی بیوی کی کوکھ سے دشمن ہی جنم لیں گے۔“ پھر مجھے سوہن سنگھ کی بیوی کا جملہ بھی یاد آیا۔ ”یہ اچھی عورت ہے۔“ میں نے سوچا، عورت بھلی سہی مگر ہے تو اس خاندان کے دشمن کی عورت۔ کہیں اس میں بھی دشمن کی کوئی چال نہ ہو۔ پہلے اس عورت نے سوہن سنگھ کی بیوی پر چادو چلایا اور اب مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ پھر میں نے سوچا، یہ موقع اچھا ہے۔ مجھے دوستی دشمنی سے کیا لینا۔ عورت بہر حال حسین ہے۔ دشمن کی بیوی سے پیار جتا کر میں گاؤں بھر میں اسے بدنام کر سکتا ہوں۔ کسی جاٹ خاندان کے لئے اس سے زیادہ ذلت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی عورت کی دشمن سے آشنائی ہو۔ میں گویا اس عورت کے قرب کی خاطر ہمارے ڈھونڈ رہا تھا۔

اب میں کمرے میں واپس آ گیا تھا۔ میں نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو پڑوس کی چھت خالی تھی۔

بیٹا تھا۔ جس خاندان سے دشمنی تھی، اس کے کھیت وجے کے خاندان والوں کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ آئے دن ایک دوسرے کے گھر سے کالم گلوچ اور جھگڑے ہوتے رہتے۔ ذرا سا بھانہ ملنے کی دیر ہوئی کہ کپائیں، خنجر اور بھالے نکل آتے۔ پھر جب تک کسی ایک طرف کی لاشوں پہ لاشیں نہ گر جاتیں دوسروں کو چین نہ آتا۔

وجے اس وقت چھوٹا ہی تھا جب ایک روز کسی نے سوہن سنگھ کو آکر خبر دی۔ ”کھیتوں پر جھگڑا ہو گیا ہے اور چار پانچ آدمی مارے گئے ہیں، جلد پہنچو۔“

سوہن سنگھ نے ہاتھ میں کھانڈی تھامی اور صافہ باندھے بغیر لپک کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ پولیس وہاں سوہن سنگھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ سوہن سنگھ نے جلدی سے اپنی کھانڈی جھاڑیوں میں چھپا دی اور آہستہ آہستہ اس طرف بڑھا جہاں پولیس بیانات لے رہی تھی۔ زمین پر کچھ ذور تین لاشیں پڑی تھیں جن سے اب بھی خون بہہ کر دھرتی کی پیاس بجھا رہا تھا۔

ان لاشوں سے کچھ فاصلے پر سوہن سنگھ کا بیٹا خنچے زخمی حالت میں کھڑا تھا۔ خنچے کا ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، مگر دوسرے ہاتھ میں اس کی شام لگی ڈانگ اب بھی موجود تھی جس پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ سوہن سنگھ لپک کر خنچے کے پاس پہنچا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کیا ابے مارا گیا؟“ یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز مرتعش تھی۔

خنچے نے بھی آہستہ آواز میں بتایا۔ ”ہماری طرف سے ماما (ماموں) مارا گیا اور بڑا بھائی بھاگ گیا۔ اس کا اشارہ ابے کی طرف تھا۔“ سامنے والوں کے دو آدمی مارے گئے۔“

بیٹے سے یہ سن کر سوہن سنگھ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس کی دانست میں ابے نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ پولیس کے ہاتھ آنے سے پہلے بھاگ جانا ہی بہتر تھا۔ تاکہ جب بھی موقع ملے، دشمن کے دو چار آدمیوں کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔ کسی نہ کسی روز ابے کو پولیس کے ہاتھ تو آنا ہی تھا۔ گرفتار ہونے کے بعد ابے کو پھانسی ہی کی سزا ہوتی۔ ان حالات میں اس نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔

اس مرتبہ جب جھگڑا شروع ہوا تو بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ دشمن کے دو آدمیوں نے الزام لگایا کہ تمہارے جانور ہمارے کھیتوں میں آگئے تھے اور انہوں نے ہماری فصل برباد کر دی۔ بولو، تم نے ایسا کیوں کیا؟ اپنے جانوروں کو ہمارے کھیتوں میں کیوں ہانک دیا؟

پھر اس سے پہلے کہ وہ جواب کا انتظار کرتے انہوں نے وجے کے ماما پر حملہ کر دیا۔ ابے نے غصے میں کپان نکال لی اور ان پر بھپٹ پڑا۔ ذرا ہی دیر میں وہاں دو آدمیوں کی لاشیں خون میں نہا گئیں۔ اسی دوران دونوں طرف کے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ جو ہتھیار بھی جس کے ہاتھ لگا، اس سے لڑنے لگا۔ ابے پولیس کے آنے سے قبل ہی گھوڑی پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ خنچے نے ماما کی تڑپتی ہوئی لاش کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ ماما، میں تیرے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔

کیس چلا۔ دو آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور باقی چھوڑ دیئے گئے۔ چھوڑے جانے والوں میں خنچے بھی تھا۔ ٹانگ پور جانے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا ہی تھا کہ ایک سمت سے تین گولیاں چلیں اور

خنچے کا کام تمام کر گئیں۔ دشمن خنچے سے زیادہ ہوشیار نکلے تھے۔

خنچے کے قتل کی خبر گاؤں پہنچنے کے ساتھ ساتھ مفرد بھائی ابے تک بھی پہنچی۔ ابے اسی انتظار میں رہا کہ چھوٹا بھائی پولیس سے جھوٹ کر گھر پہنچے تو اسے سمجھائے کہ ماں باپ کی آرزوؤں کا اب تو ہی رز ہے، مجھے تو کسی نہ کسی دن پھانسی چڑھنا ہے اس لئے دشمن کے چاروں بیٹوں کو قتل کرنے کی ذمہ داری تمہاری ہی رہنے دے تو درمیان میں نہ آ۔ تجھے ماں باپ کی خدمت کرنا ہے، وجے کو پڑھانا لکھانا ہے۔ گھر کے لئے میں جو کرنا چاہتا تھا اب نہ کر سکوں گا۔ آئیں اور تو ذمہ داریاں بانٹ لیتے ہیں۔ گھر کو تو بچہ باہر کی ذمہ داریاں مجھ پر۔ مگر دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ خنچے کو خالوں نے راستے ہی میں مار ڈالا۔ اب انتقام کی ایسی آگ میں جل رہا تھا جو صرف دشمن کے خون سے ہی بجھ سکتی تھی۔ خنچے کے قتل نے اس پر دیوانگی سی طاری کر دی تھی۔

مجبوری یہ تھی کہ پولیس ہر طرف پھیل کر ابے کو تلاش کر رہی تھی۔ دشمن تک پہنچنا ابے کے لئے اسی سبب مشکل ہو گیا تھا۔ ادھر ابے سے بچنے کے لئے دشمن کے آدمی خود کو گاؤں میں محفوظ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ابے پولیس کی نظریں آئے بغیر گاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وجے کی طرف سے دشمن کو خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ گاؤں کے ہر آدمی کو معلوم تھا کہ پولیس گاؤں کی اطراف پھیل کر ابے کو تلاش کر رہی ہے۔ ابے ایسے میں گاؤں کا رخ نہیں کر سکتا، مگر ماں کا دل میں مانتا تھا۔ وجے کی ماں مایاکور بے چین تھی۔ وہ اکثر راتوں کو دروازہ کھولے دیر تک کھڑی رہتی۔ ہر ہٹ پر وہ چونک اٹھتی۔ ہوا کی سرسراہٹ تک اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ وہ سمجھتی کہ شاید اس کا ہاتھ آیا ہے، مگر وہاں کوئی نہ ہوتا۔ رات گزر جاتی اور مایاکور آئندہ رات کا انتظار کرنے لگتی۔ وجے ماں کے بے چین دیکھتا، مگر کچھ نہ کر پاتا۔

وہ رات اندھیری تھی جب ابے اپنے دشمنوں کے خون سے پیاس بجھانے گاؤں کی طرف آیا۔ ان نے پگڑی اتار کر آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ابھی وہ گئے کے کھیتوں میں گھسنے ہی والا تھا کہ کسی اندھے نے پکار کر مدد چاہی۔ ”ہے کوئی جو اندھے کو راستہ بتائے۔“

ابے نے آواز سنی اور قریب پہنچ کر اندھے کا ہاتھ تھام لیا۔ اندھے کو اس نے گئے کے کھیتوں سے انکر راستے پر لا کھڑا کیا۔ پھر اندھے کو وہاں چھوڑ کر وہ خود گئے کے کھیت میں جا پہنچا۔ ابے بے خبر تھا کہ پولیس نے اس کے لئے کھیتوں میں بھی جال پھیلانے ہوئے ہیں۔ ابھی اسے کھیت میں داخل ہوئے ذرا مایاکور ہوئی تھی کہ خطرے کی بو سونگھ لی۔ ابے سمجھ گیا کہ پولیس کہیں قریب ہی موجود ہے۔ اس نے ذرا سے اندر ہی اندر بڑھنا شروع کیا۔ وہ کھیت کے پتوں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسی دوران اس نے ذرا ملے پر کچھ شعلیں روشن ہوتے دیکھیں جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ شعلوں کی روشنی میں اسے پولیس والے حرکت کرتے نظر آئے۔ ابے سارا معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے مارا ہونے ہی میں بہتری ہے، پکڑا گیا تو دل کی آگ نہیں بجھ سکوں گا، پھر بھائی کا انتقام کون لے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ابے بے حس و حرکت کھیت میں پڑا رہا تاکہ پولیس کو یقین ہو جائے کہ وہ

فرار ہو چکا ہے، لیکن پولیس والوں نے تو جیسے نہ بٹنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگر اسی طرح رات گزر جاتی تو دن کا اجالا پھیلتے ہی وہ پولیس کی نظریں آ جاتا۔ اب نے یہ خطرہ محسوس کر کے پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ راستہ ملتے ہی نکل جائے، مگر راستے ہر طرف سے مسدود تھے۔ پولیس اتنی چوکنا تھی کہ ذرا بھی آہر ہوتی تو رائفلیں شعلے اگلنے لگتیں۔ آخر اب نے پولیس سے بچنے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ اس نے ایک طرف گولی چلائی اور تیزی کے ساتھ دوسری سمت نکل گیا، لیکن یہ حربہ بھی ناکام ہوا۔

جس طرف اب گولی چلاتا، پولیس والے ادھر فائرنگ ضرور کرتے مگر اس سمت میں پوری پولیس پارٹی نہ بڑھتی۔ باقی سپاہی دوسری جانب نظر رکھتے۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ رات کے سنائے میں گولیوں کی آوازیں دور تک سنی جاسکتی تھیں۔

ان کھیتوں سے صرف نصف میل دور نانک پور گاؤں آباد تھا۔ اب کے ماں باپ گولیاں چلنے کی آوازیں سننے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے کان اس وقت آنکھوں کا کام کر رہے تھے۔ آدھے میل دور چلتی ہوئی ہر گولی انہیں اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ابے گاؤں کی طرف آیا ہوگا اور یہ چمڑپ پولیس کے ساتھ ہو رہی ہے۔

رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ رات بھر سارا گاؤں جانتا رہا۔ کبھی اگر گولیاں چلنا بند ہو جاتیں تو ابے کے والدین کے چہرے اتر جاتے اور دل ڈوبنے لگتے کیونکہ گولیوں کا نہ چلنا ابے کی موت کا اشارہ تھا۔ رات بھر وہ دعائیں مانگتے رہے، بیٹے کی زندگی کی دعائیں، گولیاں چلنے کی دعائیں، یہی گولیاں تو ابے کی زندگی کا ثبوت تھیں۔ رات گزرتی رہی دلیل صبح کے ساتھ گولیوں کی آوازیں میں کمی ہو گئی۔

ابے کے پاس کار تو س ختم ہو گئے۔ وہ اسی لئے پریشان ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پولیس برابر گولیاں چلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ابے نے بندوق ایک ہاتھ میں تھامی اور دوسرے ہاتھ کو زمین پر رکھ کر نانک پور گاؤں کی مٹی بھر مٹی اٹھا لی۔ ابھی وہ اس مٹی کو چوم کر اپنے ماتھے تک لایا ہی تھا کہ گولیوں کے پاڑھ نے اس کے جسم میں شعلے ہی شعلے بھر دیئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اعصاب کھینچ گئے۔ پولیس اب بھی گولیاں پھلا رہی تھی، لیکن اب ان سے بچنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر گولیوں کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔

وہ سننے کی مسلسل جنگ کے بعد سنا ہوا تو مایا کو کراہت سے روک کر لایا۔ وہ جان گئی کہ بیٹا مارا گیا۔ اس کی بانیں برس کی کھائی لٹ گئی۔ اب وہ کبھی ابے کی صورت نہیں دیکھ سکے گی۔ آج اس کا ایک اور بیٹا خاندانی دشمنی کی جھینٹ چڑھ گیا تھا۔

ابے کی موت کے باوجود نہ جانے کتنی گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس جب ابے کی لاش کے قریب پہنچی تو اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں گاؤں کی مٹی تھی۔ ابے کو اپنی مٹی سے بہت پتا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ پولیس والوں کی آنکھوں میں بادل سے امنڈے، لیکن ہر دفعہ بادل برسائیں کرتے۔ پولیس کے ہاتھوں ابے کی موت کا یہ واقعہ خود کچھ پولیس والوں کے بیانات اور مفروضات پر مبنی تھا کیونکہ ابے پر جو کچھ گزری، وہ اسے سننے کے لئے زندہ نہیں رہا تھا۔ پھر یہی واقعہ میں نے بھی سنا۔

وہ اپنے نانا کے کہنے پر عمل کرتا۔ شراب پی کر فٹے میں وہ خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑے کرتا، ان سے لڑتا اور اپنے سے بڑوں کے مقابلے پر بھی جم جاتا۔ اب اسے بھی لڑائی جھگڑے میں مزہ آنے لگا تھا۔ لڑائی جھگڑے میں طاق کر کے نانا نے اب اسے چوری کی تربیت بھی دینا شروع کی۔ وہ کبھی کسی کی مرغی، کسی کی بکری، کسی بھینس چالاتا اور نانا اسے اس "کارنامے" پر شاباشی دیتا۔ چوری چکاری میں بھی وہ بہت جلد ہوشیار ہو گیا۔

کئی دفعہ وہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھا۔ بوڑھا نانا اسے باتیں بنا کر چھڑا لاتا کہ ابھی تو یہ بچہ ہے، چوری دوری کا اسے کیا پتا۔ دوسروں کے سامنے تو بوڑھا، وہ کو معصوم ہی کہتا، مگر اکیلے میں ہمیشہ تعریف کرتے ہوئے وہ بچے سے کہتا۔ "بیٹا! بڑے ہو کر خطرناک ڈاکو بننے کا یہی راستہ ہے۔"

وقت گزرتا گیا۔ گاؤں کے آوارہ لڑکوں میں سے وہ بچے کے بھی کچھ دوست بن گئے تھے۔ ان لڑکوں نے وہ بچے کی سرکردگی میں ڈاکا ڈالنے کا چھوٹا سا منصوبہ بنایا۔ پہلا ڈاکا انہوں نے ایک حلوئی کی دکان پر ڈالا۔ مٹھائی چرائی گئی، ساتھ ہی سونے کا پانی چڑھا ہوا ایک کڑا بھی ان کے ہاتھ اگلا۔ مٹھائی لے کر وہ سب کے سب کھیتوں میں چلے گئے۔ جتنی مٹھائی خود کھائی گئی، کھائی باقی ڈھور ڈھور کو کھلا دی۔ اس کے بعد کڑا دس روپے میں بیچ کر پیسے بانٹ لئے گئے۔

چوری کی اس واردات کا پتا لگانا پولیس والوں کے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ لوگوں نے دیکھا تھا کہ وہ بچے نے ڈھور ڈھور کو مٹھائی کھائی ہے۔ پولیس نے وہ بچے کو گرفتار کر لیا۔ بوڑھا نانا اس مرتبہ بھی آڑے آیا اور وہ بچے کو نادان کہہ کر چھڑا لایا۔

وہ سولہ سال کا ہوا تو اپنے ذیل ڈول سے بیس ایکس برس کا لگنے لگا۔ نانا نے سوچا، وہ بچہ اب جوان ہو گیا ہے، اسے ماں باپ کے پاس لے جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ نانا چاہتا تھا، وہ بچہ یہ جان لے کہ اسے اپنی طاقت کس کے خلاف استعمال کرنی ہے۔ نانا کو یقین تھا کہ دشمن کو دیکھ کر وہ بچے کا خون ضرور جوش مارے گا اور اسے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ ماموں کی موت بھی یاد آ جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ بوڑھا، وہ بچے کو نانک پور لے کر آیا تھا۔

وہ بچے کے ساتھ ساتھ مجھے شکنتلا کے بارے میں بھی سب کچھ پتا چل گیا۔ شکنتلا کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال تھی۔ اس کا شوہر پچاس سال کا تھا۔ تین سال پہلے پچاس سالہ بوڑھے سے اس کی شادی ہوئی

۷۔ اس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اب تک اس سے میری براہ راست گفتگو یا ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے ہی روز میری یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں تھا کہ وجے کی ماں نے جو اب گویا میری ماں تھی، مجھے نیچے سے آواز دی۔ ”وجے! او وجے! ذرا نیچے تو آ۔“

میں نیچے پہنچا تو وہ عارت گر ہوش و خرد بھی موجود تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہے ماں؟“

”کھانا نہیں کھائے گا کیا! شکتلا پراٹھے بت اچھے پکاتی ہے، کھائے گا تو انگلیاں چائنا رہ جائے گا۔“ میں نے شرارتی نظروں سے شکتلا کی طرف دیکھا، پھر بڑے بھولپن سے پوچھا۔ ”کس کی انگلیاں ماں؟“

میرا جملہ سن کر شکتلا شرما گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ماں نے مجھے ڈانٹا۔ ”وجے! ثواب جو ان ہو گیا ہے، منہ سے ذرا سوچ سمجھ کر بات نکالا کر۔“

شکتلا جلدی سے بارہوی خانے میں چلی گئی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر چارپائی پر آ بیٹھا۔ ذرا ہی دیر بعد ماں نے کھانا سامنے لا کر رکھا۔ پراٹھوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے میری بھوک چکا دی۔ میں نے شکتلا کو ترجمانی نظروں سے دیکھا اور بے خیالی میں گرم گرم پراٹھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پراٹھوں کے گرم سگی سے میری انگلیاں جل گئیں اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسی لمحے شکتلا کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ دور سے ہنس دی۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔

ماں نے میری حالت دیکھ کر کہا۔ ”کھانا کھاتے ہوئے دھیان کھانے کی طرف رکھتے ہیں، ادھر ادھر کی نہیں سوچتے۔“

پراٹھے کھاتے ہوئے میں کن انکھیوں سے شکتلا کی طرف بھی دیکھتا جاتا۔ جب میں شکتلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو جھپٹتی مسوں پر ہاتھ پھیرنے لگتا اور کبھی اپنی پگڑی سنبھالنے لگتا۔ میں اس طرح اسے وہ گیت یاد دلانا رہا تھا جو اس نے پہلی مرتبہ مجھے دیکھ کر گایا تھا۔

وقت گزر گیا۔ دن سے رات ہو گئی اور میں، شکتلا کے دھیان میں کھویا رہا۔

اس رات پہلی مرتبہ مجھے اپنی وجود میں پیدا ہو جانے والی ایک پراسرار قوت کا خیال آیا۔ یہ قوت مجھ میں خود بخود ہی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت جب میں، ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم میں تھا۔ اپنی اس قوت کو آنانے کی خاطر میں نے آنکھیں بند کر کے شکتلا کے حسین چہرے کا دھیان کیا اور میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ میں کامیاب رہا تھا اور بند آنکھوں سے شکتلا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا بوڑھا شوہر چارپائی پر پڑا پاؤں دبوڑا رہا تھا۔ شکتلا پاؤں دباتے دباتے جانے کن خیالوں میں کھو گئی اور اس کے ہاتھ رک گئے۔

”کیا سوچ رہی ہے؟“ اس کا شوہر چیخ اٹھا۔ ”ہاتھ کیوں نہیں چل رہے تیرے؟“

شوہر سے ڈانٹ کھا کر بھی شکتلا کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر نہیں آئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب تک بلا سبب ہی ڈانٹ کھاتی رہی تھی، لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میرا وجود اس کا جواز بن

تھی۔ وہ جب بہو بن کر اس گھر میں آئی تو گھر اسے پھاڑ کھانے کو دوڑنے لگا۔ تھائی کا احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ اس کا بوڑھا شوہر تقریباً ناکارہ تھا۔ گھر میں شکتلا کی عمر سے بڑے تین دیور اور بھتیجی عمر کا شوہر تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ بد معاش بڑھا اپنی جوان بیوی کی ہر بات پر شک کرتا تھا۔ جب عورت پر اسی کے گھر میں شک کیا جانے لگے تو اسے دشمن بھی اچھے لگتے ہیں۔ شکتلا خود اس گھر میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس گھر کے جھگڑوں اور بد معاشیوں کا پتا تھا۔ اسی بنا پر اس گھر کے بڑے لڑکے کی شادی جوانی میں نہ ہو سکی۔ جب شکتلا اس کی بیوی بنی تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ شکتلا کے گھر والے بھی جانتے تھے کہ دشمنی سوہن سنگھ جاٹ جیسے بہادر خاندان سے ہے۔ سوہن سنگھ کے دو بیٹوں کی موت کے بعد یہ جھگڑے ذرا بند ہو گئے تھے اس لئے شکتلا کے لالچی باپ نے اسے اس جنم میں دھکیل دیا تھا۔ شکتلا نے اس پر بہت احتجاج کیا، بہت روٹی پیٹی مگر اسے باپ کی ضد کے آگے جھکتا ہی پڑا۔ پہلی رات ہی شکتلا نے پیار کے بولوں کی جگہ احکام سنے۔ اس کے شوہر نے پہلا حکم یہ دیا کہ کبھی تھائی میں جوان دیوروں کے پاس نہ جانا بلکہ کسی بھی جوان مرد کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔

شکتلا سمجھ گئی کہ سہاگ رات نصیمتوں میں گزرے گی۔ اس نے کروٹ لی اور سو گئی۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ چیخ مار کے جاگ اٹھی۔ اس کے اذیت پسند بوڑھے شوہر نے نازک سے مہندی لگے ہاتھ پر جلتی ہوئی سگریٹ بجا دی تھی۔ شکتلا ہاتھ کی جلن سے تڑپ رہی تھی اور بڑھا ہنس رہا تھا۔ سہاگ رات سے شروع ہونے والے ظالم بڑھتے ہی گئے۔ دن گزرتے گئے اور شکی شوہر نے خود کو شکتلا کی نظروں سے بالکل گرا لیا۔ شکتلا نے وجے کی ماں مایا کو رے ملنا شروع کر دیا۔ جو محبت اسے یہاں ملی اس نے شکتلا کا دل موہ لیا۔ مایا کو ر، شکتلا کی مظلومیت پر آنسو بہاتی اور اسے اپنے دونوں بیٹوں کے مارے جانے کے واقعات سناتی۔ دونوں دھکی تھیں، سوانہوں نے ایک دوسرے کا دکھ بانٹ لیا۔ اس طرح ان کی دوستی میں اضافہ ہو گیا۔ سبھی ان کے میل ملاپ سے واقف تھے۔

اسی عرسے میں زرنجن سنگھ کی اچانک موت بھی اس خاندان کے لئے صدمے کا سبب ہوئی تھی۔ زرنجن سنگھ کیونکہ پولیس کے محکمے میں ایک بڑے عہدے پر تھا اس لئے سوہن سنگھ کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ پولیس والے اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود سوہن سنگھ پولیس افسر رہ چکا تھا۔

موجودہ صورت حال میں میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں، وجے کے جسم کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتا یا پھر اس خاندانی دشمنی سے الگ تھلک رہتا۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم میں طویل عرصے رہ کر میں دشمنی اور انتقام کے انجام سے آگاہ ہو چکا تھا۔

کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس فیصلے میں شکتلا کے قرب کی آرزو کو بھی بہت دخل تھا۔

ایک روز میں، شکتلا کے دیدار کی خاطر چھت پر گیا تو وہ مجھے نظر نہ آئی۔ شکتلا اس وقت اپنے بارہوی خانے میں مصروف تھی۔ میں نے چھت سے ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ ٹکڑا اس کی کمرے

گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ان لمحات کے تصور میں گم تھی جب میری اور اس کی نظریں ملی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ آج بڑی خوش نظر آ رہی ہے؟“ اس کے شوہر نے پوچھا۔

شکنتلا نے فوراً بات بنا دی۔ ”آج صبح جب میں گردوارے گئی تھی تو وہاں سادتری چاچی ملی تھی۔ وہ پرسوں گاؤں جا رہی ہے۔ اگر تم کو تو میں بھی ماں سے مل آؤں۔“

”چھایہ بات ہے۔“ شوہر نے طویل سانس لیا۔ ”چلی جانا، مگر واپس آ جانا۔“ یہ کہہ کر اس کا شوہر کرتار سنگھ کروٹ بدل کر سو گیا۔

شکنتلا نے اپنا بستر نیچے فرش پر بچھا لیا۔ میاں بیوی ایک چھت کے نیچے سو رہے تھے، مگر وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔

معاً مجھے بڑھے کرتار سنگھ کے تینوں بھائیوں کا خیال آیا اور ان کے چہرے میرے صفحہ ذہن پر ابھر آئے۔ تینوں بھائی گھر کی چھت پر لیٹے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کا موضوع گفتگو دسبے، لیز میں ہی تھا۔ گھنشیام کہنے لگا۔ ”پڑوس میں دسبے آ گیا ہے، مگر بڑے بھائی کو کچھ فکر ہی نہیں۔“

دوسرا بھائی گوپال بولا۔ ”بڑے بھائی کو اپنی جوان بیوی کے خڑے اٹھانے سے فرصت ہو تو کچھ سوچیں۔ انہیں کیا فکر۔ وہ تو بند کمرے میں سوتے ہیں۔ مرنا تو ہمیں پڑے گا۔“

تیسرے بھائی آنند نے کہا۔ ”ہاں یار، بڑے بھائی کو جوان اور حسین بیوی کے ساتھ دیکھ کر تو میری بھی طبیعت اب شادی کرنے کو چاہنے لگی ہے۔“

گوپال نے آنند کو ڈانٹا۔ ”تجھے شادی کی سوجھ رہی ہے، ارے کم بخت! اس وقت تو ہمیں دسبے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اس کا نانا جب یہاں سے واپس جا رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ جلد ہی خشونت سنگھ کو بھی بھیج دوں گا۔ بڑھا یقیناً ہم چاروں کے لئے ہی اپنے بیٹے اور نواسے کو تیار کر رہا ہو گا تاکہ وہ دونوں مل کر ہم چاروں کو.....“

اسی وقت آنند بول اٹھا۔ ”بھول جاؤ چار کو۔ اس لئے کہ بڑا بھائی تو کسی کام کا نہیں رہا۔ اسے جوان بیوی کے آچل میں منہ چھپانے ہی سے فرصت نہیں۔ ہم اب صرف تین ہیں۔“

گھنشیام نے آنند کی بات سمجھتے ہوئے تائید میں کہا۔ ”اور اب ہم تینوں کو ہر وقت ساتھ رہنا چاہئے۔ خبردار بغیر ہتھیار کے کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔“

میرے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں اور میں آنکھیں بند کر کے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرا دھیان ایک مرتبہ پھر شکنتلا کی طرف چلا گیا۔ اسے میں نے بے خبر سوتے دیکھ کر آنکھیں کھول دیں اور دھیان سلسلہ نوٹ کیا۔ میں کروٹیں بدلتے ہوئے سوچنے لگا کہ شکنتلا میرے دل میں کیوں گھر کرتی جا رہی ہے؟ تو ایک شادی شدہ عورت ہے۔ ہر چند کہ اپنے شوہر سے اس کے ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہو سکے، شادی سے پہلے جیسی تھی، ویسی ہی اب بھی ہے لیکن میرے موجودہ جسم کے ناتے وہ دشمن کی بیوی تھی۔ پھر میرے دل میں اس کے قرب کی آرزو کیوں چل رہی ہے؟ انہی خیالوں میں گم، جانے کب میری آنکھ

لگ گئی۔ خواب میں بھی مجھے شکنتلا ہی نظر آتی رہی۔

☆-----☆-----☆

صبح جب میں جاگا تو سوہن سنگھ کھیتوں پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بابا! میں بھی تمہارے ساتھ کھیتوں پر چلوں گا۔“

”نہیں دسبے! ابھی تم آرام کرو۔ خشونت سنگھ دو چار دن میں آ جائے گا تو دونوں ساتھ ساتھ کھیتوں پر جایا کرنا۔“ سوہن سنگھ نے جواب دیا۔

پھر مایاکور مجھے سمجھانے لگی۔ ”دسبے! یہاں کسی سے لڑنا بھڑنات۔“

میں کچھ نہ بولا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دسبے کے ماں باپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خاندانی دشمنی کو بھول جانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ بھی شکنتلا کے جادو کا اثر ہے یا مایاکور نے اپنے بیٹے کے لئے شکنتلا جیسی کوئی بو ڈھونڈ لی ہے؟ میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سوہن سنگھ کھیتوں پر چلا گیا۔ مایاکور باورچی خانے میں مصروف ہو گئی۔ میں اوپر چھت پر آ گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے آہٹ سنائی دی۔ مایاکور کام میں مصروف تھی۔ سوہن سنگھ جا چکا تھا۔ پھر یہ اوپر کون آیا ہے؟ میں چونکا ہو کر اٹھا اور ڈانگ سے برہمی نکال کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ جس طرح شیر کے شکاری کے سامنے اچانک کوئی ہرنی آ جائے تو اس کا جو حال ممکن ہے، وہی میرا ہوا۔ بڑی بڑی آنکھوں والی ایک خوبصورت ”ہرنی“ کو میں نے دوسرے کمرے میں دیکھا۔ وہ شکنتلا تھی جو کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔

”تو یہاں کیوں آئی ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”چوری کرنے۔“ شکنتلا دھیرے سے ہنس دی۔ ”میں تو یہاں ہر تیسرے چوتھے دن آتی ہوں اور اس گھر کی مٹی لے جاتی ہوں۔ یہ چوری ہی تو ہوئی۔“

میرے ہاتھ میں اب تک برہمی تھی اور اس پر مجھے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

شکنتلا مجھے نگاہ غلط انداز سے دیکھتے ہوئے مزید بولی۔ ”تم بہت دنوں کے بعد گاؤں واپس آئے ہو اس لئے تمہیں شاید پتا نہیں کہ اب اس گاؤں میں چور ڈاکو نہیں رہتے جن کے لئے ایسے خطرناک ہتھیار کی ضرورت ہو۔“

”شکنتلا!“ میرے لمبے میں سختی آ گئی۔ ”یہ ہتھیار چور ڈاکوؤں کے لئے نہیں، دشمنوں کے لئے ہے..... تیرے شوہر اور دیوروں کے لئے۔ سمجھی۔“

میں نے شکنتلا کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا۔ اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

مجھے فوری طور پر یہ احساس ہو گیا کہ اس سے سخت لمبے میں بات نہ کرنا چاہئے تھی۔ یہ سوچ کر میں اس کے قریب آ کر بولا۔ ”شکنتلا! تجھے دونوں خاندانوں کی دشمنی کا پتہ ہے، پھر تو یہاں کیوں آتی ہے؟ تو آخر ہمارے گھر کا کام کیوں کرتی ہے؟“

”دشمنی تو مردوں کے درمیان ہے۔“ وہ بھولپن سے بولی۔ ”اس میں ہم عورتوں کا کیا بیج۔ کیا تیری ماں میری دشمن ہے؟ رہے تم باپ بیٹے، تو تم لوگوں کی بھی مجھ سے دشمنی نہیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر شکلتا کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔ ”میں تیرا دشمن نہیں ہوں شکلتا۔ ہم تو دوست ہیں۔ بول دوستی کرے گی مجھ سے؟“

میرے ہاتھ میں بہت دن بعد کسی عورت کا ہاتھ آیا تھا۔ سو میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ میں نے شکلتا کے چہرے پر عجیب سکون سا محسوس کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”ارے! دروازہ تو کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔“ شکلتا خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”تیری ماں آ جاتی تو؟“

”جب دل کا دروازہ کھل جاتا ہے تو پھر کسی دروازے کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔“ میں نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ ”بول اب تو کچھ دوستی ہو گئی نا؟“

اس نے شرما کر میرے سینے میں منہ چھپا لیا، پھر بولی۔ ”یہ دوستی مجھے کتنی مہنگی پڑے گی، تجھے کیا پتا۔ میرے شوہر نے آج صبح ہی منع کیا تھا کہ اب دشمنوں کے گھر نہ جایا کر۔ وہاں ایک جوان لڑکا آگیا ہے۔ پھر بھی تیری محبت مجھے یہاں بھیج لائی۔“

مجھے شرارت سو جھی اور کہا۔ ”میں نے بھی تجھے مایوس نہیں کیا۔“

”بڑا بے شرم ہے تو۔“ وہ تڑپ کر میری آغوش سے نکل گئی اور پھر زینے کی طرف بھاگتی ہوئی بولی۔ ”کل نہیں آؤں گی، انتظار نہ کرنا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے میکے جا رہی ہے۔ پھر شکلتا دو روز تک نہیں آئی۔ میں سوچنے لگا کہ ہر وقت دشمنی ہی کیوں؟ دنیا میں اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ اس دنیا میں محبت بھی تو ہے۔ پھر ہم محبت کیوں نہیں کرتے؟ ہم آخر دشمنی کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ میں نے خود کو اتنا الجھا ہوا کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ شکلتا نے مجھے ایک نئی الجھن میں گرفتار کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے قبضے میں تھی کہ جس سے وجہ کے خاندان کی دشمنی تھی۔ شکلتا چاہتی تو میرے بازوؤں کو جھٹک دیتی، میری آرزوؤں کی تکمیل نہ ہونے دیتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ خود کو اس نے میرے سپرد کر دیا۔

گھر میں رہتے ہوئے مجھے وحشت سی ہونے لگی تو میں باہر نکل آیا۔ اس عرصے میں وجہ کے بہت سے دوستوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ وجہ کے بچپن کے دوست تھے۔ میں نے وجہ کے جنم میں آکر ایک اور بات محسوس کی۔ یہ شراب کی طلب تھی۔ وجہ کا جسم شراب نوشی کا عادی تھا۔

ذرا سی دیر میں وجہ کے کچھ پرانے دوستوں کو میں نے تلاش کر لیا۔ ان کے ساتھ میں نے شراب نوشی کا پروگرام بنایا۔ ہم نے دارو (شراب) لی اور پھر سب کے سب بستی کے باہر ایک ویران سے کنویں کے پاس آ بیٹھے۔ دور پر دور چلے، باتیں ہوئیں، آپس کی باتیں، غیروں کی باتیں۔ وقت گزرتا گیا۔ جب مجھے گھر کا خیال آیا تو شام سے رات ہو چکی تھی۔ سب اٹھنے لگے مگر میں بیٹھا رہا۔ گھر کا خیال آنے کے باوجود بھی میں اس مدھوشی کے عالم میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔

”کب تک بیٹھ رہنے کا ارادہ ہے؟“ ہری نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کسی کا انتظار تو نہیں ہے؟“

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا اور پوچھا۔ ”کس کا انتظار؟“

”ارے تجھے خبر نہیں، یہ بات تو سارا گاؤں جانتا ہے کہ اس کنویں کے اندر سے رات گئے چوہدری کی عورت کے رونے کی آواز آتی ہے۔“ ہری نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کر۔“ میں بولا۔

”بات سننے کے چکر میں رہا تو شاید اس کے آنے کا وقت ہو جائے۔“ ہری نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”بات یہ ہے کہ اپنے برابر والے گاؤں کے چوہدری نے ایک جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ سنا ہے کہ لڑکی بہت ہی سندر تھی۔ جانے کیوں چوہدری کو یہ احساس ہو گیا کہ بڑھاپے میں جوان اور خوبصورت بیوی آفت سے کم نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ عورت اپنی ذات سے بہت نیک اور اچھی تھی مگر چوہدری کو شک و شبہ نے پاگل کر دیا۔ ایک دن وہ اپنی جوان بیوی کو میکے پہنچانے کے بہانے یہاں لایا اور اس کنویں میں دھکیل دیا۔ بس اسی روز سے ہر رات اس کنویں میں اس بے گناہ کے رونے کی آواز آتی ہے۔“

ہری کی زبانی چوہدری کی حسین و جوان بیوی کا یہ انجام سن کر میں چونک اٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں شکلتا کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

”کیوں؟ بس ڈر گیا؟“ ہری کہنے لگا۔

میں تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ ہری کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ہری سے پوچھا۔ ”وہ چوہدری ابھی تک زندہ ہے؟“

”تجھے اس سے کیا کام ہے؟ وہ غریب تو دوسرے ہی دن پاگل ہو گیا تھا۔ چل اب چلیں۔“

میں اور ہری گھروں کی طرف چل دیئے۔ ہری نے جو واقعہ سنایا تھا، اس سے مجھے شکلتا اور اس کا بوڑھا شوہر کر تار سنگھ یاد آ گیا تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم آگے بڑھ رہا تھا کہ ہری کہنے لگا۔ ”یار وجہ! میری نظر میں ایک جگہ ہے جہاں سے بہت مال مل سکتا ہے۔ اگر تو ہمت کرے تو کام بن جائے گا۔“

”کس کا گھر ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ تقدیر مجھے ایک بار پھر ماضی کی ڈگر پر لے جا رہی تھی۔

ہری ہنس کر بولا۔ ”نہ وہ گھر کسی جاٹ کا ہے نہ اس گاؤں میں ہے۔ اس کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔ بہت سارے زیورات اس نے ہوا رکھے ہیں۔ ہم نے بھی بند دست تو سب کر لیا ہے۔ اگر تو ساتھ دے تو تیسرا حصہ تیرا۔“

”تیسرا حصہ کیوں؟“ میں غصے اور حیرانی سے بولا۔

”ہم تین ہیں۔ پریم سنگھ سے بھی بات ہو چکی ہے۔ یہاں سے چار میل دور جانا ہو گا۔ دو گھنٹے بعد ہم یہاں سے نکلے تو صبح تک واپس آ جائیں گے۔“ ہری نے بتایا۔

”آج نہیں، کل چلیں گے ہری۔“ میں نے کہا۔

”کل آخری رات ہوگی۔ پرسوں شادی ہے، یہ مت بھولنا۔“ ہری کہنے لگا۔

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ کل بیس مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر میں، ٹکٹا کے خیالوں میں گم گھر کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ٹکٹا میرے پاس آئی تو کہہ دوں گا، تو میرے پاس نہ آیا کہ۔ تیرے شوہر کو شک ہو گیا تو وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسی سوچ بچار میں گھر آ گیا۔ ماں نے دروازہ کھولا اور میں نے اوپر کی راہ لی کہ وہیں سوتا تھا۔ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جیسے میرے کمرے میں بہار آ گئی۔ ٹکٹا ہنسی مسکراتی ہوئی بالوں میں پھول لگائے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے کے بعد مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر جو کچھ میں نے سوچا تھا، کہوں گا سب بھول گیا۔ سفید بلاؤز اور سفید ساڑھی میں لمبوس ٹکٹا نے مجھے گم سم کر دیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے جا رہے تھے، یوں جیسے جدائی کی تسکین اتار رہے ہوں۔ پھر ٹکٹا نے پلکیں جھپکائیں اور مسکراتے ہوئے ایک ڈبا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لے میں تیرے لے گا جڑ کا حلوا لائی ہوں۔“ میں اب تک پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ جا رہا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ کہنے لگی۔ ”تجھے پسند ہے اس لئے اپنے ہاتھ سے بنا کر لائی ہوں، بائبل کے گھر سے۔ یہ نہ سمجھنا کہ دشمنوں کے گھر سے آیا ہے۔“

میں مسکرا دیا اور ڈبا کھولا۔ ڈبے سے تھوڑا سا حلوا نکال کر میں نے کھایا اور کہا۔ ”بہت مزیدار ہے“ لیکن یہ بتا اس میں زہر ملا کر تو نہیں لائی؟ تو بہر حال دشمن کی بیوی ہے اس لئے یہ بات پوچھ رہا ہوں۔“

”اور تیری کون ہوں؟“ وہ ایک ادا سے قریب آ کر بولی۔

”میری زندگی۔“ میں اب مزید برداشت نہ کر سکا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس میں تو پہلے سے اتنا زہر بھرا ہے کہ قاتل سے قاتل زہر اثر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں تیری ماں سے پوچھ آتی ہوں کہ چینی کے ساتھ حلوے میں کتنا زہر ڈالنا چاہئے؟ کیونکہ حلوہ بنانا تو مجھے تیری ماں ہی نے سکھایا ہے۔“

میں ہنسا اور اسی وقت میری نگاہ اس کی گردن پر پڑی جس پر نیل پڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تیری گردن پر یہ نشان کیا ہے؟“

”تجھ سے دوستی کی سزا ملی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں منع کرنے کے باوجود تیرے گھر آئی تھی۔“

”ٹکٹا! تیرا شوہر ہو کر بھی وہ تجھے جانوروں کی طرح مارتا ہے۔“ میں دکھی لہجے میں بولا۔

”وہ بھی کیا کرے۔ دن بھر جانوروں کے ساتھ رہ کر عادتیں بھی جانوروں کی سی پڑ گئی ہیں۔ کچھ اور تو بس میں نہیں، اسی طرح اپنی مردانگی جتایا ہے۔“

”پھر بھی تو مجھ سے ملنے چلی آئی؟“

”ہاں۔“ تجھے زہر ملا حلوہ بھی تو کھانا تھا۔“ وہ ہنس دی اور میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر ٹکٹا نے اپنی ساڑھی کے پلو سے بندھا ہوا ایک تعویذ کھول کر میری طرف بڑھایا۔ ”لے، یہ تعویذ پن لے، تیرے

لے بنا کر لائی ہوں۔ جب میں، ماں کے گھر جا رہی تھی تو پتا چلا تھا کہ گاؤں میں کوئی پیر آیا ہوا ہے جو تعویذ دیتا ہے۔ میں اس کے پاس گئی تو وہ سمجھا، اولاد کے لئے تعویذ لینے آئی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ایسا تعویذ لکھ دو جو پسینے والے کی ہمیشہ حفاظت کرے۔“

میں بولا۔ ”تو پھر یہ تعویذ مجھے کیوں دے رہی ہے؟ اپنے شوہر کو دے۔ میں تو اس کا دشمن ہوں۔ جو آدمی تیرے سہاگ کو لوٹنے والا ہے، تجھے اس کی زندگی کا اتنا خیال کیوں ہے؟“

وہ مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔ ”تجھے یہ تعویذ دے کر میں اپنے سہاگ ہی کی تو حفاظت کر رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”تو مجھے اپنا سہاگ کہہ کر کیوں گناہ میں شامل کر رہی ہے۔“

”اگر کسی ماں کے اکٹوتے بیٹے کی زندگی اور گھر میں آنے والی بو کے سہاگ کی حفاظت کرنا گناہ ہے تو یہ گناہ بھی مجھے منظور ہے۔“

”یہ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے ٹکٹا؟ کیا تو..... تو کسی اور عورت کو میرے ساتھ برداشت کر لے گی؟“

”ہاں۔“ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے۔ میں نے اپنے صدمے کی محبت تجھ سے وصول کر لی اور..... اور

زندگی آرزو نہیں۔ سارا جیون بیتانے کے لئے یہ بھی بہت ہے۔“

ٹکٹا کے ہاتھ میں اب تک تعویذ موجود تھا۔ میں نے اس سے تعویذ لے لیا اور بولا۔ ”میں بھی تجھے کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

تو نے مجھے پہلے ہی بہت کچھ دے دیا ہے، وہ جس کا میں صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ مجھے اور کچھ میں چاہئے۔“

”لیکن میں تو تجھے اپنی محبت کی نشانی دینا چاہتا ہوں۔ بول کیا تو میری محبت کا تحفہ قبول نہیں کرے گی؟“

”مگر وہ تحفہ ہے کیا؟ یہ تو بتا دے۔“

”ابھی نہیں بتا سکتا، لیکن وعدہ کر جب کچھ دوں گا تو انکار نہیں کرے گی۔ اس وعدے کے بعد ہی یہ تعویذ گلے میں ڈالوں گا۔“

میری بات ختم ہوتے ہی ٹکٹا بول اٹھی۔ ”دبے! تو جو کچھ بھی مجھے دے گا، انکار نہیں کروں گی، لہجے میری قسم ہے، آج کے بعد کبھی تعویذ کو خود سے الگ نہ کرنا۔“

پھر وہ چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کی چال میں بلا کا اعتماد تھا۔

☆=====☆=====☆

رات ہوئی تو میں، بری سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق گھر سے نکلا۔ آج رات گھر سے غائب ہونے کے لئے بہانہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ برابر کے گاؤں میں رام لیا تھی۔ آس پاس کے گاؤں والے رام لادیکھنے جا رہے تھے۔ دس بجے کی ماں مایا کو نے مجھے روکنا چاہا، مگر دوستوں کے ساتھ جانے کا سن کر مطمئن

شکنتلا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہتے ہتے کرتا سنگھ پھر گالیاں بکنے لگا۔ وہ شکنتلا پر الزام لگا رہا تھا کہ میرے ساتھ اس نے ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ اسے یقیناً خبر نہیں تھی کہ یہ الزام نہیں،

”میں نے ننگن اس لئے نہیں رکھے کہ یہ قیمتی ہیں۔ میں تو انہیں چوری کی یاد کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”مجھے حصہ دینا ہے تو ننگن دو رو نہ کچھ بھی نہیں چاہئے۔“ دراصل میں وہ ننگن شکلتا کو تختے میں دینے کے لئے پسند کر چکا تھا۔ شکلتا کی گوری گوری کلائیوں میں وہ ننگن بہت تھیں۔ میری بات سن کر خاموشی چھا گئی۔ پھر ہری اور پریم نے اپنے اپنے حصے اٹھائے۔ انہوں نے میرا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ میں نے بھی ننگن لے لئے اور کھڑا ہو گیا۔

حقیقت ہے۔ شکلتا نے ایک مرتبہ بھی الزام کی تردید نہیں کی تھی۔
سو نے سے پہلے کرتا شکلتا نے دھکی دی۔ ”اگر تو نے اپنے ہاتھ پایوں کے نیچے سے نکالے تو تیرے ہاتھ ہی کاٹ ڈالوں گا۔“

پھر ذرا ہی دیر میں ظالم کرتار شکلتا سو گیا۔ شکلتا سستی رہی، مگر کرتار شکلتا بے خبر سوتا رہا۔
میرا جی چاہا کہ ابھی جا کر ظالم بوڑھے کے سینے میں کرپان اتار دوں جو میری محبوبہ کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔ قانون اور سماج کی نظر میں شکلتا اس بوڑھے کی بیوی تھی۔ مجھے اس معاملے میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ رات میں نے جیسے انگاروں پر لوٹنے ہوئے گزاری۔ ایک لمحے کو بھی میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ صبح ہوئی تو میں نے برابر والی چھت پر دیکھا۔ شکلتا مجھے نظر نہیں آئی تو میں نیچے آ گیا کہ شاید وہ مایاکور سے ملنے آئی ہو، لیکن وہ باورچی خانے میں اکیلی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل بگھ گیا۔ مایاکور مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”چل اب جلدی سے ناشتا کر لے۔ آج تو نے بڑی دیر کر دی سو کے اٹھنے میں۔“

میرا جی چاہا، پوچھ لوں کہ کیا شکلتا آئی تھی، لیکن یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کچھ لمحے تذبذب میں گزرے۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچ لی اور بولا۔ ”ماں! تو نے مجھے جلدی کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا شکلتا کے ساتھ باتیں کرنے میں لگی رہی؟“

”نہیں بیٹے! رات کو تو دیر سے آیا تھا تاں اس لئے میں نے سوچا، ذرا آرام کر لے۔ شکلتا تو آج صبح سے آئی ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا، پھر فوراً ہی ہنستے ہوئے بات بدل دی۔ ”اگر ایک دن شکلتا نہیں آئی تو کیا ہو گیا۔“

”تو نہیں جانتا بیٹا، وہ بڑی بھلی عورت ہے۔ میرا اس سے دل لگ گیا ہے۔“ مایاکور نے کہا۔
”پھر تو ماں تجھے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کیوں نہیں آئی؟ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟“

ناشتا کرنے کے بعد میرے ممبر کا بیٹا نہ لبرز ہو گیا۔ میں نے مایاکور سے ”ابھی آیا“ کہا اور گھر سے نکل گیا۔ باہر آ کے میں سیدھا شکلتا کے گھر کے پاس رکا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر میں ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ ایک کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر شکلتا پر پڑی۔ وہ سامنے کمرے میں چرخا کات رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے نظریں اٹھائیں اور چونک اٹھی۔

”دبے! تو یہاں؟“ وہ سسے ہوئے لمبے میں بولی اور جلدی سے چارپائی پر پڑا ہوا دوپٹا اوڑھ لیا۔
”خفیہ ہاتھ اس نے کمرے کے پیچھے چھپا لئے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ پھر بول اٹھی۔ ”تو یہاں کیوں آ گیا؟“

”جب تو وہاں نہیں آئی تو میں خود یہاں چلا آیا۔“ میں نے جواب دیا۔

شکلتا کی نظریں کھلے ہوئے دروازے پر جم گئیں۔

میں سمجھ گیا کہ شکلتا مجھے اپنے گھر میں اچانک دیکھ کر گھبرا رہی ہے، اسی لئے بولا۔ ”تو بیٹھ، میں دروازہ بند کئے دیتا ہوں۔“ دروازے کی کنڈی لگا کر جب میں واپس آیا تو شکلتا کے چہرے پر اطمینان جھلکے لگا۔ میں نے اپنی جیب سے ڈبا نکالا اور اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”شکلتا! میں تجھے یہ دینے کے لئے آیا ہوں۔“

میرے ہاتھ میں وہی ڈبا تھا جس میں شکلتا اپنے میکے سے میرے لئے حلوا لائی تھی۔ ڈبے کو دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اسے واپس دینے کی اتنی جلدی کیا تھی؟ یا اس ہانے تو مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے؟ بول، میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں نا؟“ اس نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”تجھ سے ملنے کے لئے اب مجھے کسی ہانے کی ضرورت نہیں ہے شکلتا! تو آج گھر نہیں آئی تو ماں کو فکر تھی۔ ماں تو یہاں آ نہیں سکتی۔ یہ دشمن کا گھر ہے نا۔ اس لئے میں آیا ہوں۔ تیری میری تو پکی دوستی ہے نا اور ہاں یہ ڈبا خالی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بند ڈبا شکلتا کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اب بھی اپنے دونوں ہاتھ چھپائے خاموش بیٹھی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جو بات چھپا رہی ہے، مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ میں نے مزید کہا۔ ”تو نے یہ ہاتھ کیوں چھپا رکھے ہیں؟ کیا مجھ سے ڈر لگ رہا ہے کہ تیری کلائی.....“

”نہیں۔“ وہ بول اٹھی۔ ”تجھ سے بھلا میں کیوں ڈرنے لگی۔“

”تو پھر ڈبا کھول کر دیکھتی کیوں نہیں کہ میں کیا لایا ہوں۔“

”کیا لایا ہے، تو ہی دکھا دے نا۔“

”اچھا، لے دیکھ۔“ میں نے ڈبا کھول کر سونے کے کنگن اور انگوٹھی اس کے سامنے رکھ دی۔
شکلتا حیران رہ گئی۔ اسے یقیناً کسی ایسے قیمتی تحفے کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس نے شوہر کو دیا جانے والا تعویذ مجھے دیا تھا اور میں کسی بیوی کو دیا جانے والا تحفہ اسے دے رہا تھا۔

میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”کیا سوچ رہی ہے شکلتا؟ شاید تجھے میرا تحفہ پسند نہیں آیا۔“ پھر میں نے جان بوجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”لا، اپنے ہاتھ ادھر لا۔ دیکھو تیری گوری گوری کلائیوں میں یہ کنگن کیسے لگتے ہیں؟ ٹھیک بھی آتے ہیں یا نہیں۔“

شکلتا پیچھے ہٹ گئی۔ میں اس پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کے اوپر ہونے والے ظلم کا علم ہے۔ بہر حال میں نے اس کے ہاتھ پکڑی لئے۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ ہاتھ زخمی ہوں گے مگر اتنے زیادہ زخمی ہونے کا گمان نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت سے وہ تڑپ اٹھی حالانکہ گرفت زیادہ سخت نہیں تھی۔ میں نے اس کے شدید زخمی ہاتھ دیکھے تو لرز گیا۔ شکلتا کا چہرہ اس طرح دھواں دھواں ہو رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

سب کچھ جانتے بوجھتے میں نے غصے میں پوچھا۔ ”کیا یہ تیرے شوہر کی حرکت ہے؟ تو مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپا رہی تھی؟ دیکھتا ہوں، اب وہ بڑھا مجھ سے بچ کر کہاں جاتا ہے۔“

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور پھر غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے میرے سینے سے آگئی۔
 ”ٹکٹلا! مجھے بتاؤ یہ سب کیوں برداشت کرتی ہے؟ تجھے جو سزا ملی، وہ مجھے ملنی چاہئے۔ میری ہی وجہ سے تجھے یہ ظلم برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ میں ٹھیک کہتا ہوں نا۔“

”بتاتی ہوں‘ سب بتاتی ہوں۔“ وہ بولی اور پھر گزشتہ رات کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ کسی شخص نے گھر میں میری موجودگی کی اطلاع کھیتوں پر دشمنوں کو پہنچا دی تھی۔ دروازے پر اب ڈنڈے برسائے جا رہے تھے۔ چاروں بھائی مسلح ہو کر آئے تھے۔ ٹکٹلا سہم گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”ٹکٹلا! تو اہم رکھ‘ میں اکیلا ہی ان بزدلوں سے نمٹ لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔

ٹکٹلا نے میرا راستہ روک لیا اور بولی۔ ”کیا تو مجھے اس طرح بدنام کرنا چاہتا ہے.....؟ اگر نہیں تو دبے‘ تجھے میرے پیار کی قسم جس طرح چپ چاپ میاں آیا تھا اسی طرح خاموشی کے ساتھ واپس چلا جا۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اس نے پچھلی کھڑکی سے مجھے باہر نکال دیا۔ میں تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی اوپری منزل پر پہنچ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ میرے پیچھے ٹکٹلا پر کیا گزری۔ میں نے اس کا دھیان کیا۔ وہ گھر کے دروازے کی کنڈی کھول رہی تھی۔ جس ڈبے میں کنگن اور انگوٹھی تھی‘ اس نے کیں چمپا دیا تھا۔ دروازے کھلتے ہی سب سے پہلے کر تار سنگھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔

”اتنی دیر میں دروازہ کیوں کھولا؟ کیا اپنے یار سے.....“ کر تار سنگھ نے چیخ کر ایسی بات کہی جو کسی بھی غیر مت مند شخص کی زبان پر نہیں آ سکتی۔

ٹکٹلا نے اس کی فحش کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ذرا نیند آگئی تھی۔“

”جھوٹی حرامزادی۔“ کر تار سنگھ چیخا۔ ”اور کون ہے تیرے ساتھ اندر؟“

ٹکٹلا انجان بن گئی۔ ”اندر.....؟ اندر تو کوئی نہیں..... اندر کون ہوتا۔“

اتنی دیر میں کر تار سنگھ کے تینوں بھائیوں نے پوری تلاشی لے لی تھی۔ کر تار سنگھ نے ٹکٹلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے پوچھا۔ ”بتا کہاں ہے وہ؟“

پھر اس سے پہلے کہ ٹکٹلا کچھ کہتی‘ کر تار سنگھ اسے مارنے لگا۔ ٹکٹلا زمین پر گر پڑی۔

”میاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ آئند نے بھائی کو بتایا۔

”ٹھیک طرح سے دیکھ آئند‘ آج بچ کر کہاں جائے گا وہ۔“ کر تار سنگھ نے یہ کہتے ہوئے ٹکٹلا کی پیٹھ پر زور سے ڈنڈا مارا۔ ٹکٹلا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس ظلم پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میری محبوبہ ایک ظالم کے ظلم

ہائٹانہ بن رہی تھی‘ میں کس طرح یہ برداشت کر لیتا۔ وہ کھلے عام میرا نام لے رہا تھا کہ گھر میں ٹکٹلا کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہا تھا‘ اس کے ایک آدمی نے مجھے گھر میں گھستے دیکھا تھا۔ ٹکٹلا کی چیخ جیسے میرے وجود کو دوہیم کر گئی۔ میں غصے میں ہوش کھو بیٹھا۔ میں نے اپنی ڈانگ اٹھائی اور پھر برجمی نکال کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس وقت کر تار سنگھ دوبارہ ٹکٹلا کو ڈنڈا مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا۔

”شیطان کے بیٹے۔“ میں چیخ اٹھا۔ ”عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے‘ مرد ہے تو میرے سامنے آ۔“

کر تار سنگھ نے مڑ کر مجھے دیکھا تو چہرے پر خوف پھیل گیا۔ اس کے تینوں بھائی بھی قریب آ گئے۔ میں نے انہیں پھر لٹکارا۔

اب عجیب صورت حال تھی۔ پیچھے ہٹنے پر عورت کے سامنے ان کی بیٹی ہوتی تھی۔ چاروں نے ہتھیار سنبھالے اور سامنے آ گئے۔ میں بھی تیار کھڑا تھا۔ مجھ میں اتنی اہمیت بھی تھی اور طاقت بھی کہ ان چاروں سے تھلاؤ سکتا۔ پھر یہ کہ وہ نیچے تھے اور میں دیوار پر کھڑا تھا۔

نکارا بڑھنے لگی۔ اس دوران گوپال اور آئند نے دیوار پر چڑھنا چاہا‘ لیکن میں نے انہیں نیچے گرا دیا۔ اس پر گوپال آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک برجمی تھی۔ اس نے اچھل کر مجھ پر وار کرنا چاہا۔ میں اس وقت تک ڈانگ میں لگی ہوئی برجمی سے گوپال کی گردن کا نشانہ لے چکا تھا۔ قریب تھا کہ میری برجمی گوپال کا کام تمام کر دیتی کہ شور و غل سن کر اسی وقت دبے کی ماں مایا کو کرے سے نکل کر آنگن میں آگئی۔ اس نے میرے دونوں پیر پکڑ لئے۔

”بس بیٹا‘ بس! نیچے اتر آ۔“ مایا کو کر کی آواز میں التجا تھی۔

یوں گوپال اس روز بچ گیا اور نہ اس کی موت یقینی تھی۔ چیخ و پکار سے تمام محلہ جمع ہو گیا۔ غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج یہ قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔ خاص طور پر میں‘ ٹکٹلا کے شوہر کر تار سنگھ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ٹکٹلا پر ظلم کرنے والے اس بڑھے کو ختم کرنا ضروری تھا۔ سو میں نے اس کا نشانہ لیا۔

”دبے!“ مایا کو کر چیخ اٹھی۔ ”تجھے میری قسم جو اب ہاتھ اٹھائے۔“

وہ عورت جو اس جسم کے ناتے میری ماں تھی‘ اس نے جیسے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ محلے کے لوگ بھی چیخ میں آ گئے۔ پھر بھی اس جھگڑے میں گھنشیام اور آئند کے سر پھٹ چکے تھے۔ گوپال بھی شدید زخمی ہو گیا تھا‘ مگر بڑھا حرامزادہ کر تار سنگھ ٹھیک تھا۔ وہ کینہ اور بزدل آگے ہی نہیں آیا تھا۔

محلے کے لوگ دونوں گھروں کے درمیان جمع ہو گئے تھے اور سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ پانی دشمنی پھر شروع ہو گئی‘ کون جانے اب کیا ہو۔

دوپہر کے وقت جو جھگڑا ہوا تھا‘ اس کی خبر شام تک دھرم گھر پہنچ گئی۔ جاٹوں کا اصول ہے کہ وہ جس طرح بیٹی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے‘ اسی طرح بیٹی کی سرال کی دشمنی بھی اپنے سر نہیں لیتے۔ ایسا نہ ہوتا تو دبے کا بوڑھا نانائک کا خود انتقام لے چکا ہوتا۔

دبے کی ماں پیش آنے والے واقعے سے بہت پریشان تھی کہ اگلے ہی روز اس کے سیکے سے

واقعات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کر دیا، مگر شکنتلا کا نام گول کر گیا۔ عمروں کے فرق کے باوجود میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وجہ اور خشونت کے درمیان دوستی تھی۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ جلد از جلد دو ایک دشمنوں کو موت کی نیند سلا دینا چاہئے۔ کسی کو قتل کرنا میرے لئے کون سی نئی بات تھی۔ جانے کتنے آدم زاد میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ خشونت اور وجہ کی دوستی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ اس کے آجانے سے میری ہمت مزید بڑھ گئی تھی۔ مجھے اس کی موجودگی سے اگر کوئی خطرہ تھا تو صرف یہ کہ میں شکنتلا سے نہیں مل سکوں گا، اگر ملا بھی تو پہلے جیسی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔

میں اور خشونت ناشتا کر رہے تھے کہ اس نے مایاکور سے کہا۔ ”بہن! باپو نے کہا ہے کہ آئندہ تم مردوں کے جھگڑے میں نہ پڑنا۔“

مایاکور کے چہرے پر دکھوں کی چادر پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔

”باپو نے یہ بھی کہلوایا ہے کہ تم جھگڑے میں پڑیں تو وہ کبھی تمہارا منہ نہیں دیکھیں گے۔“

خشونت نے مزید کہا۔

ناشتا کر کے میں چھت پر چلا آیا۔ سامنے ہی شکنتلا کا صحن نظر آ رہا تھا۔ وہ میری طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ معاً اس نے پلٹ کر چھت کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں اسے کس طرح چھت پر میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ ہم دونوں کی نظریں دیر تک ایک دوسرے ملی رہیں۔

اچانک نیچے سے خشونت نے آواز دی۔ ”وجہ! نیچے آ۔ تیرا کوئی دوست ملے آیا ہے۔“

میں چونکا کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ نیچے آ کر دیکھا تو وہ پریم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”آؤ پریم! کیسے آئے؟“

”ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“ پھر اس نے بتایا۔ ”غصیب ہو گیا وجہ! چوہدری کے گھر چوری کے شے میں پولیس نے ہری کو پکڑ لیا ہے۔“

”کب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”آج صبح۔“ پریم نے جواب دیا۔ ”چوری کی تفتیش کے لئے امرتسر سے ایک پولیس افسر آیا ہے۔ مشتبہ لوگوں میں ہری کا نام بھی ہے کیونکہ ہری اس رات گاؤں میں نہیں تھا اور ادھی رات تک گھر سے غائب رہا تھا۔ پولیس کے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے۔ اب پولیس مارپیٹ کر کے اس سے سب کچھ اگوا لے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہری ہم دونوں کا بھی نام نہ لے دے۔“ پریم کے چہرے پر یہ کتنے ہونے ہوئے اڑ رہی تھیں۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

پریم کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا اور بولا۔ ”خبردار پریم! ہری کے متعلق ایسا سوچنا بھی مت۔ وہ انکار دوست ہے۔ پولیس ظلم کرنے کے باوجود اس سے کچھ بھی نہیں اگوا سکے گی۔“ پھر میں نے معلوم کیا۔ ”یہ بتاؤ ہری کے گھر سے چوری کا سامان تو برآمد نہیں ہوا؟“

”نہیں، اس کے گھر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔“ پریم نے جواب دیا۔

”پھر تو کوئی پرواہ کی بات نہیں۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”اب تو جا اور معلوم کر کہ ہری پر

خشونت سنگھ آ گیا۔ میں نے اب تک اس کا نام ہی نام سنا تھا۔ وہ وجہ کا ماموں تھا اور میرے موجودہ جم کی عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا۔

نانا نے وہ گھوڑی بھی بھیجی تھی جو وجہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ گھوڑی کا نام مانک تھا۔ مایاکور سمجھ گئی کہ اس کے باپ نے ہی خشونت کو بھیجا ہوگا۔

”مجھے دیکھ کر کس سوچ میں پڑ گئیں بہن؟“ خشونت نے سوال کیا۔

”بابا نے تجھے یہاں رہنے کو بھیجا ہے تو پھر مانک کو ساتھ کیوں لایا ہے؟“ مایاکور بولی۔

خشونت نے جواب دیا۔ ”باپو نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ جب تک اس دشمنی کا فیصلہ نہ ہو جائے، میں یہیں رہ کر وجہ کی مدد کروں۔ باپو نے مجھے یہی وجہ کے لئے بھیجی ہے۔“

تازہ رات کے خیر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ وجہ... بھی آ گیا ہے۔ گزشتہ رات سے تقریباً ہر گھر دشمنانوں کی دشمنی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ بوڑھے اپنی یادیں تازہ کر رہے تھے کہ ان خاندانوں کی دشمنی کے سبب اب تک کتنے لوگ مارے جا چکے تھے۔ کتنے بچے یتیم اور کتنی عورتیں یتیم ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی لوگ یہ پیش گوئی بھی کر رہے تھے کہ اب جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ مجھے تمام خیر اپنے دوستوں کے ذریعے مل رہی تھیں۔ خشونت کی آمد سے لوگوں کے شکوک یقین میں بدل گئے تھے کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔

میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ مجھے یہ جاننے کی فکر تھی کہ خشونت کی آمد کا ان پر کیا رد عمل ہوا ہے۔ اس کے لئے میں نے اپنے دھیان کی پراسرار قوت آزمائی جس کے ذریعے میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا اور کانوں سے سن سکتا تھا۔

”آہستہ بولو۔“ کرتار سنگھ بولا اور کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں شکنتلا موجود تھی۔ ”کہیں وہ نہ سن لے۔“ بوڑھے کو اب اپنی بیوی پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ ”وہ اپنی ضد کی پکی ہے، رات سے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اسے مارا بھی کہ کھانا کھالے، مگر نہیں مانی اور نہ ہی اس نے یہ اقرار کیا کہ دشمن کے گھر نہیں جائے گی۔“

شکنتلا کمرے سے نکل کر گھر کے کام میں لگ گئی۔ چاروں بھائی اسے گھورنے لگے۔ گھنشیام نے اس پر جملہ کسا۔ ”آج چال کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔“

گوپال بولا۔ ”چال کیوں نہیں بدلے گی۔ مارتو اتھے اچھوں کے کس مل نکال دیتی ہے۔“

چاروں بھائیوں نے کھیتوں پر جانے سے پہلے چھت پر جانے والے زینے کے دروازے میں تالا لگا دیا کہ شکنتلا اوپر نہ جاسکے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے سارے گھر کی کڑکیاں بھی مقفل کر دیں۔ اس طرح گویا انہوں نے شکنتلا کو گھر میں قید کر دیا تھا۔ گھر کے صدر دروازے پر بھی وہ تالا لگا گئے تھے۔ دشمنوں کی طرف سے باخبر ہو کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی کے ساتھ شکنتلا کا مظلوم چہرہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دشمنوں کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد خشونت سنگھ کو میں نے اب تک پیش آنے والے

”پولیس ہری سے کہہ رہی ہے کہ اگر تو رام لایا دیکھنے گیا تھا تو کوئی گواہ پیش کر۔ ہری جواب میں کہہ رہا ہے کہ گواہ کی بجائے تم گاؤں کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو کہ میں اس رات وہاں تھا یا نہیں؟ کوئی تو مجھے پہچان ہی لے گا۔ ٹانگ پور کے بہت سے لوگ بھی وہاں گئے تھے۔“

میں سمجھ گیا کہ ہری اپنا عہد نبھا رہا ہے۔ پولیس کے تشدد سے اسے بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ میرے دل میں ہری کی وقعت بڑھ گئی تھی۔ آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور پریم سے بولا۔

”پریم! میں تھانے جا رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ پریم نے پوچھا۔ ”تو وہاں جا کر کیا کرے گا؟“

”گوای دوں گا کہ میں نے ہری کو رام لایا میں دیکھا تھا۔ ہری پر پولیس ظلم ڈھائے اور ہم چپ بیٹھے رہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ گزشتہ روز جب کرناٹک اسکھ اور اس کے بھائیوں سے میرا جھگڑا ہوا تھا تو وجہ کے باپ سوہن سنگھ نے اپنی کوشش سے تھانے میں اس کیس کو درج ہونے سے روک لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ’پولیس کی نظروں میں نہ آؤں۔ اس کا بڑا بیٹا ہے‘ پولیس ہی سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اور پریشان تھا۔ اپنی اس پریشانی کا اظہار سوہن سنگھ نے مایا کوڑ سے بھی کیا تھا۔ جب تک وجہ اپنے تاتا کے پاس تھا سوہن سنگھ بے فکر رہا، لیکن اس کے گھر آتے ہی سوہن سنگھ کے دل میں طرح طرح کے دوسروں نے جگہ بنا لی تھی۔ گاؤں کا تھانیدار اس کا دوست تھا۔ سابق پولیس افسر ہونے کی وجہ سے پولیس کے محکمے میں اس کی عزت تھی۔ میرے تحفظ کی خاطر وہ آج کل پولیس والوں کے ساتھ زیادہ اچھے بیٹھے لگا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں ’پولیس تھانے سے دور رہی رہوں۔“

جب میں تھانے جا رہا تھا تو خشونت نے بھی مجھے اس سے منع کیا تھا کہ میں ’پولیس کی نظروں میں نہ آؤں‘ مگر ظاہر ہے مجھے یہ مشورہ قبول نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، صرف یہی گواہی تو دینا تھی کہ ہری کو میں نے رام لایا میں دیکھا تھا۔

میں نے تھانے میں اقدم رکھا تو پولیس کا ایک بڑا افسر متا تھانیدار سے خوش گہیوں میں مصروف تھا۔ یہی پولیس افسر امرتسر سے اس کیس کی تفتیش کرنے آیا تھا۔ ہری پر تشدد کر کے پولیس تھک چکی تھی، مگر اس نے قرار جرم نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے گھر سے مال بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ تھا کہ محض شہبے کی بنیاد پر کوئی ذمہ دار پولیس افسر ہری کو مجرم قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ہری کے خلاف پولیس کے پاس کوئی بھی ثبوت نہیں تھا۔

میں نے پیغام بھجوایا تو متا نے مجھے بلوا لیا۔ متا اور تھانیدار کے سامنے پہنچنے ہی میں نے انہیں سلام کیا اور معصومیت سے بولا۔ ”صاحب! ہری اس رات واقعی رام لایا دیکھنے باہر گیا تھا۔ میں نے خود اسے وہاں دیکھا تھا۔ میں یہی کہنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

متا اور تھانیدار دونوں ہی میرے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔ وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ ہری کی بے گناہی ثابت کرنے اور گواہی دینے میں ہی تھانے کیوں آیا ہوں؟

کیا جی۔ شام سے پہلے مجھے آکر جانا۔“

پریم آگے بڑھا ہی تھا کہ خشونت باہر آگیا اور مجھ سے پوچھا۔ ”کیا کوئی پھندا ہو گیا تھا؟“

میں چونک اٹھا اور پھر سوچا کہ خشونت تو میرا ساتھ ہی دینے کے لئے آیا ہے اس سے کیا پردہ ہو میں بولا۔ ”ہاں! میاں آکر ایک جگہ پر ہاتھ مارا تھا۔ آج میرے ایک ساتھی کو پولیس نے دھرا لیا ہے۔ اسی کی خبر دینے پریم آیا تھا‘ لیکن مال میرے ساتھی ہری کے گھر سے برآمد نہیں ہوا اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔“

خشونت نے میری پیٹھ پر تھپکی دی اور کہنے لگا۔ ”واہ! تو نے میاں آتے ہی کام دکھا دیا لیکن تیرے حصے کا مال تو گھر میں نہیں ہے؟ اگر مال گھر میں موجود ہے تو اسے جلد سے جلد ٹھکانے لگا دے۔ پولیس کی مار سے تو اچھے اچھوں کا پانی اتر جاتا ہے۔“

”نہیں! میں نے تو اپنے حصے کا مال کل ہی ٹھکانے لگا دیا تھا۔“

میں نے کہنے کو تو یہ الفاظ کہہ دیے، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کل کے ہنگامے میں ننگن اور انگوٹھی، شگلتا کے شوہر یا دیوروں کے ہاتھ آگے ہوں گے تو کیا ہوگا؟ مجھ پر اگر چوری کا الزام آگیا تو ایک سابق پولیس افسر، یعنی وجہ کے باپ کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔

میں نے سوچا، مجھے جلد از جلد شگلتا سے انگوٹھی اور ننگن کے بارے میں معلوم کر لینا چاہئے، مگر اس وقت خشونت کی موجودگی میں یہ کام مشکل تھا۔ مجبوراً میں ’خشونت کے ساتھ کھیتوں پر چلا آیا۔ اس پاس کے کھیتوں میں جا کر خشونت نے وجہ کے دوستوں سے ملاقات کی۔ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ دشمنوں سے لڑائی کے وقت وہ کیا مدد کر سکتے تھے۔ وہ میرے ساتھ جہاں جہاں بھی گیا، سب نے اسے یقین دلایا اور مدد کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ تم دونوں کوئی قدم تو اٹھاؤ، ہم ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں۔

خشونت کو یقین ہو گیا کہ میرا پلہ بھاری ہے۔

دوسری طرف ہمارے دشمن کرناٹک اسکھ اور اس کے بھائی بھی اسی فکر میں تھے۔ اطلاعات کے مطابق انہوں نے چار غنڈوں کو نوکر رکھ لیا تھا۔ وہ ان کرائے کے غنڈوں کے ذریعے مجھے ختم کرا دینا چاہتے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب کھیتوں پر میں اور خشونت اکیلے ہوں تو ہم پر حملہ کر دیا جائے تاکہ اچانک حملے کی صورت میں ہمیں بچنے کا موقع نہ مل سکے۔ میں ان اطلاعات کے باوجود ظاہر ہے کہ خوفزدہ یا پریشان نہیں تھا۔

شام کو پریم مجھ سے ملنے کھیتوں پر آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”کیا ہوا پریم؟ ہری کر حال میں ہے؟“

پریم نے بتایا۔ ”ایک حوالدار کے ذریعے پتا چلا ہے کہ پولیس نے ہری کو بہت مارا ہے، لیکن ہرگز اب تک یہی کہہ رہا ہے، چوری والی رات کو میں باہر گیا گاؤں میں رام لایا دیکھنے گیا ہوا تھا۔ میں چوری کے بارے میں نہیں جانتا۔“

”پھر اب پولیس کیا کہتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

تھانے دار نے متا کو خاموش دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا۔ ”یہ نوجوان‘ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر سوہن سنگھ کا بیٹا ہے۔ ٹانگ پور آئے ہوئے ابھی اسے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے یہ اپنے تانا کے پاس دھرم مندر میں رہتا تھا۔ سوہن سنگھ کو میں جانتا ہوں‘ اچھے آدمی ہیں۔ یہ نوجوان اچھے خاندان کا ہے۔“

”تو ہری کو کب سے جانتا ہے؟“ متانے کرخت لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

”ہم تو بچپن سے ساتھ کھیلتے آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تیری عمر کیا ہے؟“ متانے پوچھا۔

”میرے باپو کہتے ہیں‘ سترہ سال کا ہوں۔ ویسے میں دیکھنے والوں کو اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا ہوں

تاصاحب؟“

میری بات پر متا مسکرانے لگا اور تھانیدار بھی دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر متانے کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ اگر کوئی بغیر بلائے خود کسی ملزم کی گواہی دینے آ جائے تو پولیس گواہی دینے والے پر بھی شبہ کر سکتی ہے؟“

متا کے یہ الفاظ سن کر میں دل ہی دل میں ہنسا‘ پھر بڑی معصومیت سے بولا۔ ”مجھ پر شبہ کیوں ہوگا صاحب۔ ہم جاٹ لوگ چوری تو کبھی کرتے ہی نہیں۔ آپ تو خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے۔“

کچھ دیر متانے غور کیا‘ پھر تھانیدار سے انگریزی میں کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے‘ یہ لڑکا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ہری کو چھوڑ دینا‘ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دینا کہ یہاں کی باریشٹ کا باہر ذکر نہ کرے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ پھر وہ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھ اس وقت تو میں‘ ہری کو تیری گواہی پر چھوڑے دے رہا ہوں‘ لیکن اگر چور پکڑے نہ گئے تو اسے اور تجھے دونوں کو بند کر دوں گا۔ سمجھ گیا؟“

”جی سمجھ گیا صاحب۔“ میں جلدی سے بول اٹھا‘ پھر واپسی کے لئے مڑنے سے پہلے ایک بار پھر متا کو سلام کیا۔

متا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”کیا کرتا ہے تو؟“

”باپو کے ساتھ کھیتوں پر جاتا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”تیرے باپو پولیس کے محکمے میں ملازمت کر چکے ہیں‘ تو بھی پولیس میں بھرتی ہو جا‘ مگر ابھی تیری عمر کم ہے۔“ متا کے لہجے میں بے تکلفی آگئی۔

”جی ہاں صاحب‘ میرے باپو بھی یہی کہتے ہیں۔“ میں بولا۔

متا کو مجھ سے اس انداز میں بات کرتے دیکھ کر تھانیدار کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ پھر متا چلا گیا اور تھانیدار نے ہری کو حوالات سے نکالا۔

میں نے ہری کو لولہمان دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ پھر بھی خاموش رہنے ہی میں مجھے بہتری نظر آئی۔ ہری کی حالت ایک ہی دن میں ایسی ہو گئی تھی جیسے وہ برسوں کی جیل کاٹ کر آیا ہو۔ تھانیدار نے

ہری کو بتایا۔ ”دبے نے تیری بے گناہی کی گواہی دی اور متا صاحب مان گئے۔ تو اس لئے بچ گیا ورنہ میں تجھے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اب جا اور رات کو ادھر ادھر آوارہ نہ گھوما کر ورنہ کسی دن بے موت مارا ائے گا۔“

ہری کے چہرے پر بے یقینی سی نظر آئی۔ پھر وہ میرے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ باہر آتے ہی مجھے بے کا پ سوہن سنگھ نظر آیا۔ وہ مجھے غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خشونت ہی نے میرے تھانے جانے کی خبر دی ہوگی۔ اندر سے تھانیدار کی نظر سوہن سنگھ پر پڑی تو وہ بھی باہر آ گیا۔

”سوہن سنگھ جی۔“ تھانیدار قریب آ کر بولا۔ ”تمہارے دبے نے تو آج کمال کر دیا۔ جب یہ ائے آیا تو مجھے اس کی بے وقوفی پر بڑا غصہ آ رہا تھا‘ مگر اس نے تو متا صاحب جیسے سخت انسر پر دیکھتے ہی ہلچے جادو سا کر دیا۔ وہ بڑی دیر دبے سے باتیں کرتے رہے‘ پھر خود ہی ہری کی رہائی کا حکم بھی دے گئے۔ تمہارا بیٹا تو بڑا بہادر اور ذہین ہے‘ متا صاحب سے ذرا بھی نہیں ڈرا۔“

سوہن سنگھ کے چہرے سے غصے کے آثار غائب ہو گئے۔ وہ مجھے اور ہری کو چھوڑ کر تھانیدار کے اٹھ اندر چلا گیا اور اس سے ہنس کر باتیں کرنے لگا۔

ہری اتنا زخمی تھا کہ مجھے اسے سہارا دے کر چلنا پڑ رہا تھا۔ یہ منظر پورے گاؤں نے دیکھا۔ گاؤں لوں کو بھی خبر تھی کہ میں تھانے گیا ہوں‘ لیکن انہیں غالباً یقین نہیں تھا کہ میں‘ ہری کو چھڑا لاؤں گا۔ شاید اسی لئے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور ہری کو ساتھ ساتھ دیکھ کر ذرا سی دیر میں اسے گاؤں کو یہ خبر مل گئی کہ میں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ہری جب اپنے گھر پہنچا تو جذبات پر قابو نہ آ سکا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا۔ ”دبے! یار ہو تو تجھ جیسا‘ تو یقین کر‘ میں مر جاتا پھر بھی را اور پریم کا نام میری زبان پر نہ آتا‘ مگر تو نے تھانے آنے کی ہمت کر لی اس کے لئے میں.....“

مے آگے آنسوؤں نے اسے بولنے نہ دیا۔

میں نے بھی ہری کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تو ہمارا نام نہیں لے گا‘ رنجھ پر تھانے میں جو ظلم ہو رہے تھے‘ وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے۔“

ہری کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ”ہاں یار‘ لوں نے دن میں تارے دکھا دیے۔“ پھر آنسو پونچھ کر بولا۔ ”دبے! میں قسم کھاتا ہوں کہ تو اگر کبھی بہت میں ہو گا تو ہری بھی اپنی جان کی پروا کئے بغیر تیرے ساتھ ہی کھڑا ہوگا۔ اگر تو کے تو میں آج ہی ت تیرے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دوں۔“

میں نے اسے سمجھایا اور گفتگو کا موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ”ہری! ابھی تک چوری کا شبہ ہم سے نہیں ہوا اس لئے ہوشیار رہنا‘ کوئی غلطی نہ ہو۔“

پھر میں گھر آ گیا تو دیکھا سوہن سنگھ بھی تھانے سے واپس آ چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی مایا کو اور خشونت میری ہی باتیں کر رہا تھا۔ میری ہمت پر سب خوش تھے۔

غلطی سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ اسی روز رات کو میں نے اپنے دشمنوں کا دھیان کیا۔ اس سے

میرا مقصد ان کا رد عمل معلوم کرنا تھا۔ گویا کہ رہا تھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ زیور کی چوری میں وجہ کا بھی ہاتھ ہے۔“ گویا کہ علاوہ اس کے بقیہ بھائی بھی میرے خلاف ذرا اگل رہے تھے۔

☆=====☆

دوسرے دن جب سورج ڈھل رہا تھا تو خلاف توقع مجھ پر اور خشونت پر اچانک پانچ آدمی ٹوٹ پڑے۔ ہم دونوں کھیتوں پر تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھل پاتے دشمن پہلا وار کر چکے تھے۔ گویا نے چار بد معاشوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھلا تھا، کسی کے ہاتھ میں برہمی۔ میرے پاس وہی ٹانگا دی ہوئی ڈانگ تھی، لیکن خشونت کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں دشمنوں کو جواب دینے کے لئے ان پر ٹوٹ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے دو آدمیوں کو میں نے گرا لیا۔ میری ڈانگ میں لگی ہوئی برہمی سے ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اسی وقت میرے پیروں میں بھی بھلا لگا۔ میں نے مز کر بھالے والے کو بھی برہمی ماری اور نیچے گرا دیا۔ خشونت کے ہاتھ ایک بانس لگ گیا تھا۔ وہ اسی کو گھما رہا تھا۔ معاً دور کھڑا ہوا گویا، خشونت پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ میں نے گویا کو بڑستے دیکھ کر للکارا۔ ”مرد ہے تو میرے سامنے آ۔ ہتھیار لے کر نیتے کی طرف کہاں بڑھ رہا ہے۔“

میری للکار سن کر گویا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے سے خوف جھلکے لگا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ابھی ایک آدمی تھا۔ میں اس آدمی کو راستے سے ہٹا کر جلد از جلد گویا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اتنے میں شور و غل سن کر قریبی کھیتوں سے سوہن سنگھ کے رشتے دار دوڑتے ہوئے اس طرف آئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔

انہیں آتا دیکھ کر گویا نے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کہا۔ ”بھاگو۔“ دشمنوں میں سے گویا سمیت صرف تین افراد بھاگ سکے۔ ان کے دو آدمی زخمی پڑے تھے۔ خشونت کے پیٹ اور کمر میں زخم آئے تھے۔ ہماری مدد کو آنے والے اس پر افسوس کرنے لگے کہ جلد نہ پہنچ سکے ورنہ ایک بھی دشمن بچ کر نہ لکھا۔ مجھے خشونت کی فکر تھی۔ میں نے دو آدمیوں کو بھیج کر دوا کا بندوبست کیا۔ خود میرا ایک پاؤں بھی زخمی تھا۔ ہم دونوں کے زخموں پر چٹاں باندھ دی گئیں۔ دشمن کے آدمیوں کو کیا سزا دینا چاہئے؟ اب ہم یہ سوچ رہے تھے۔

”ان دونوں کو رسی سے باندھ کر کنویں میں لٹکا دو۔“ کسی نے تجویز پیش کی۔

”بالکل ٹھیک۔“ دوسرے شخص نے تائید کی۔ ”میرا کتا رات بھر پہرا دے گا۔“

سزا ملے ہوئی تو چار آدمی، دونوں زخموں کو تھپتھپ کر کنویں کے پاس لے گئے۔ ان کے زخموں پر خون جم چکا تھا۔ ابھی انہیں باندھا ہی جا رہا تھا کہ ان میں سے ایک کو ہوش آ گیا۔ خود کو اتنے آدمیوں میں گھرا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر وہ دوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چھوڑ دو، پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔“ اس نے ہاتھ جوڑے۔ ”میرے بیوی بچے پریشان ہو جائیں گے۔ پیٹ کی خاطر ہم گویا کے ہرکادے میں آگئے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ بزدل ہمیں آگے کر کے خود بھاگ جائے گا۔ مرو کر تہ

صاحب کی قسم کھا کر کہتا ہوں، اس مرتبہ مجھے جانے دو، پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔“ اس شخص کو روتے دیکھ کر مجھے رحم آ گیا اور بولا۔ ”اسے جانے دو۔ کرائے کے آدمی کو مارنے سے کیا فائدہ۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ تیرا ساتھی بھی کیا بھئی جیسا ہے؟ یہ بھی کیا پیسوں کے لالچ میں پھنس گیا تھا؟“ یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں کہ جھوٹ یا جھگڑا کا اندازہ لگا سکوں۔

”ہاں۔ ہم دو دوسمن گیسوں کے لالچ میں کرنا سنگھ کی باتوں میں آگئے تھے۔“ میں مسکرا دیا کہ کرائے کے آدمی بہر حال قابل اعتماد نہیں ہوتے۔ دشمنوں نے ان پر بھروسہ کر کے غلطی کی تھی۔ پھر میرے ایما پر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں کرنا سنگھ اور اس کے بھائیوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ دوسرے زخمی کو بھی اس عرصے میں ہوش آ گیا تھا۔ اس وقت رات ہو چکی تھی، میں، خشونت اور آٹھ دس رشتے دار بیٹھ کر سوچنے لگے کہ آج کے اس حملے کا انتقام کس طرح لیا جائے؟

”ہمیں ان کے کھیتوں پر نہ جانا پڑے بلکہ وہ خود میاں آکر لڑیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی تدبیر سوچو تاکہ ہم سب مل کر ان پر حملہ کر سکیں۔“ ”مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟“ خشونت نے سوال کیا۔

سب سوچنے لگے۔ پھر ایک رشتے دار بولا۔ ”یہ تو بہت آسان ہے۔ تم ان کا پانی بند کر دو تو وہ خود ہی میاں لڑنے آجائیں گے۔“

یہ تجویز سب کو پسند آگئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لئے ایک ہی بڑی سی ٹالی بنی ہوئی تھی۔ ہر کھیت کے لئے وقت مقرر تھا۔ ہمارے کھیتوں کو پانی مل جانے کے بعد کرنا سنگھ کے کھیتوں کی باری آتی تھی۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ طے پایا کہ میں اور خشونت پانی روک کر بیٹھے رہیں اور باقی سب لوگ ہتھیار لے کر پاس ہی چھپ جائیں۔ جب دشمن فراد کرتے ہوئے میاں آئیں تو ان پر ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔

بات طے ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ میں اور خشونت بھی گھر آگئے۔ ہم نے گھر والوں کو اس ہنگامے کی ہوا نہ ٹگنے دی اور جلدی جلدی کھانا کھا کر اوپری منزل پر چلے گئے تاکہ آئندہ روز متوقع معرکے کے لئے صبح تازہ دم انہیں۔

وہ رات دوسرے دن کے انتظار میں گزری۔ گرمیوں کا سورج اپنے دامن میں سرخ سرخ انگارے لئے صبح کا پیغام لے کر آیا۔ دوپہر تک چلچلاتی ہوئی دھوپ اور لو کے جھکڑوں نے لوگوں کے اوسان خطا کر دیے۔ میں اور خشونت کھانا کھانے کے بعد ہی سے پانی روک کر بیٹھے تھے۔

کرنا سنگھ کے کھیتوں میں پانی پہنچنے کا وقت گزر چکا تھا، مگر اب تک ادھر خاموشی تھی۔ میں آج اپنے ساتھ ٹانگا کی دی ہوئی تلوار بھی لایا تھا۔ قریب پڑے ہوئے اناج کے ڈھیر کی آڑ میں ہمارے کئی ساتھی ہتھیاروں سے لیس چھپے بیٹھے تھے کہ دشمن کے کھیتوں میں ذرا بھی زندگی نظر آئے تو حملہ کر دیں، لیکن اب تک ادھر سناٹا ہی تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر منہ پر چھینٹے مارے اور پھر کرنا سنگھ

کے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”وجہ!“ خشونت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”وہاں تو اب تک خاموشی ہے۔“

میں نے خشونت کی بات سن کر کہا۔ ”جلدی کیا ہے ماما! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔“

کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کرتار سنگھ کے دو بھائی پچھلے نکل کر کھیت میں دوسری طرف جا رہے ہیں۔

”ان پر اثر ہو رہا ہے ماما۔“ میں بولا۔ ”مگر یہ اس طرف کیوں گئے ہیں اور کیوں نہیں آئے؟“

خشونت نے جواب دیا۔ ”وہ اکیلے ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ انہیں کرائے کے آدمیوں کا انتظار ہو گا۔ تو دیکھتا نہیں کہ وہ گھبرائے ہوئے ہیں۔“

خشونت کی بات صحیح نکلی۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے دونوں بھائی واپس آتے دکھائی دیئے۔ اب ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے انہیں دیکھ کر ایک ساتھی بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے آج ہنگامہ زور دار ہو گا۔“

”آنے دے“ ہم بھی تیار ہیں۔“ میں نے جواب دے کر ڈانگ میں لگی ہوئی برجھی نکال لی اور دل ہی دل میں بولا، چار بھائیوں میں سے آج کرتار سنگھ اور گوپال کا قصہ تو میں پاک کر ہی دوں گا۔ شکنتلا! شوہر کرتار سنگھ تو یوں بھی میرا رقیب تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ کرتار سنگھ کے کھیتوں کا پانی بند کر کے میں نے دشمنوں کو مشتعل کر دیا تھا پھر بھی ان کی خاموشی معنی خیز تھی۔ جھگڑے کے بعد مجھے اس معنی خیز خاموشی کی تفصیلات کا علم ہوا۔ جاٹ قبیلے میں دو گروہ تھے۔ سوہن سنگھ کے مخالفوں کے پاس جا کر کرتار سنگھ اور اس کے بھائیوں نے کہ تھا۔ ”حد ہو گئی جنو! وہ ہمارے کھیتوں کا پانی روکیں، پھر بھی ہم خاموش بیٹھے رہیں۔ اگر انہیں ایسا کرنے سے ابھی نہ روکا تو آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، کل تم لوگ بھی اس سے نہ بچ سکو گے۔ یہ لڑکے پورے گاؤں کو اپنے مقابلے پر کمزور سمجھتے ہیں۔ انہیں بتا دو کہ یہ ان کی نادانی ہے۔ اس وقت سوال از سے ہماری دشمنی کا نہیں، سوال ظلم اور نا انصافی کا ہے۔“

دشمنوں کی چال کامیاب رہی۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ باتیں سن کر لوگوں کے جذبات ہمارے خلاف بھڑک اٹھیں۔ اٹھ دس آدمی اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے ان کے ساتھ چلتے پر آ رہے۔

گوپال نے انہیں خالی ہاتھ چلتے دیکھ کر کہا۔ ”وہاں خالی ہاتھ جانے میں خطرہ ہے۔ وجہ اس خشونت بات بات پر ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ پرسوں ہی ہمارے ملازموں کو انہوں نے بلا کسی وجہ کے اتارا کہ ان میں سے کوئی ہمارے کھیتوں پر کام کرنے نہیں آ سکا۔ آخر اس گاؤں میں یہ بد معاشریاں کب تک چلیں گی۔ کیا پانی صرف وجہ کے باپ کی ملکیت ہے؟ پانی پر کیا انہی لوگوں کا حق ہے؟“

لوگوں نے یہ بات سنی تو اپنے ہتھیار اٹھا لئے اور کرتار سنگھ کے ساتھ اس کے کھیتوں کی طرف چل پڑے۔

میرے ساتھیوں میں سے چھ آچکے تھے، مگر چار ساتھی پولیس کے ڈر سے گول ہو گئے تھے۔ میں نے دشمنوں کی ٹولی کو دور سے آتے دیکھا تو خشونت سے بولا۔ ”ماما! آج تو یہ بت سے حامیوں کو لے کر آ رہا ہے۔ عیار کرتار سنگھ نے کوئی چال ضرور چلی ہے ورنہ اس کے ساتھ اتنے آدمی نہ ہوتے۔“

”یہ خیال رکھنا وجہ کہ ہمارا نشانہ کرتار سنگھ اور اس کے بھائی ہیں۔“ خشونت نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں ماما! میں نے تائید میں سر بلایا۔

اتنی دیر میں وہ لوگ قریب آ گئے۔ گوپال سب سے آگے تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔ ”وجہ! تو نے ہمارے کھیتوں کا پانی کیوں بند کیا ہے؟“

جواب میں خشونت نے چلو میں پانی بھرا اور سامنے والوں پر اچھال دیا۔

گوپال نے جھنجھلا کر اپنے حامیوں کی طرف دیکھا اور جذبات کو بھڑکانے کے لئے غصے سے بولا۔ ”دیکھا آپ لوگوں نے ان حرام زادوں کو۔“

گوپال کا جملہ سن کر ٹولی میں سے ایک آدمی میرے قریب آ کے کہنے لگا۔ ”دیکھ لڑکے، اس پانی پر ہم سب کا حق ہے۔ یہ شرارت تجھے بت مٹھی پڑے گی۔“

اس آدمی کی بات سنتے ہی خشونت نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور بولا۔ ”مٹھی سستی بعد میں کرنا چاہا! جن کی حمایت کرنے آئے ہو پہلے ان سے پوچھو کہ کل یہ ہمارے کھیتوں پر کس سے لڑنے آئے تھے؟“

کرتار سنگھ کے سب سے چھوٹے بھائی آنند نے مجھے اور خشونت کو شاید تنہا سمجھ کر کہا۔ ”تو ہی پوچھ اپنے بھانجے سے کہ یہ ہمارے گھر میں کس لئے گھسا تھا اور پھر بھائی.....“

میں نے آنند کی بات کاٹ دی اور کڑک کر بولا۔ ”خبردار جو تو نے اپنی بھابی کا نام لیا، دو ٹکڑے کر دوں گا۔“

”مار ڈالو ان حرامی پلوں کو۔“ کرتار سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

یہ سنتے ہی دو تین آدمی آگے بڑھے۔ اسی وقت ہمارے ساتھی اناج کے ڈھیر کی آڑ سے نکل آئے۔ کرتار سنگھ کے آدمی رک گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ خشونت نے مجھ سے کہا۔ ”یہی وقت ہے وجہ! دشمن غافل ہے، پہل تم کرو۔“

میں نے خشونت کی بات سنی اور ڈانگ اٹھا کر سامنے والے شخص کے سر پر گھمادی۔ وہ شخص وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک شخص کا گرتا تھا کہ شور مچاتے ہوئے لوگ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ خشونت کی ٹانگیں ان چاروں بھائیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بھاگ رہے تھے۔ کرتار سنگھ اور آنند دائیں طرف، گھنٹیاں اور گوپال بائیں طرف بھاگے جا رہے تھے۔ غالباً پہلے ہی سے ان کا منصوبہ یہ تھا کہ مجھے اور خشونت کو دوسروں سے لڑوا دیا جائے اور چاروں فرار ہو جائیں۔

انہیں بھاگتے دیکھ کر میں نے زور سے کہا۔ ”دیکھنا ماما! دشمن بھاگنے نہ پائیں۔ تم ان دونوں کو سنبھالو، میں ادھر کرتار سنگھ کی طرف دوڑتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں، کرتار سنگھ اور آنند کی جانب لپکا۔

کرنا سگھ نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔

”حرام زادے۔“ کرنا سگھ چیخا۔ ”جلدی بھاگ۔ وہ تیرا باپ پیچھے آ رہا ہے۔“ کرنا سگھ اپنے بھائی آئندہ سے مخاطب تھا۔

میں نگاہیں جمائے ان دونوں کا پیچھا کر رہا تھا کہ میرا پاؤں ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پاؤں میں موج آ گئی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کر ان دونوں کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔ اس وقت تک وہ دونوں کافی دور نکل چکے تھے۔

جب میں واپس کھیتوں کی طرف آیا تو دیکھا کہ آدھے گھنٹے کی لڑائی میں پانچ جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ گھنٹیاں اور گوبال بھی خشونت کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔ میں ابھی وہاں گم صم کھڑا تھا کہ پولیس جب کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی برچی کو ڈانگ میں چھپا لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ پولیس کو اطلاع ہمارے دشمنوں ہی نے دی تھی۔ مجھے خشونت بھی نظر نہیں آئی۔ اس بات کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ خشونت نے بھی پولیس کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ زخمی کر لئے تھے اور بے ہوش بن کر زمین پر گر گیا تھا۔

پولیس نے کھیتوں سے پانچ لاشیں اکٹھا کیں۔ سات زخمیوں کو ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ پولیس والے گھنٹیاں، گوبال، خشونت اور مجھ کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ کرنا سگھ اور آئندہ پہلے سے تھانے میں موجود تھے۔ گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر مرنے والے کے گھر سے مین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھانے میں کرنا سگھ اور آئندہ نے بیان دیا کہ میں نے ان کا جینا دوسر کر دیا ہے۔ میں ہر وقت انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتا ہوں۔ تھانیدار نے ان دونوں کے بیانات سے یہ مطلب نکالا کہ جھگڑے کے وقت میں موقعہ واردات پر موجود نہیں تھا۔ اس نے مجھے جھوٹا دیا۔ خشونت، گھنٹیاں، گوبال اور دوسرے دو آدمیوں کو اس نے حوالات میں بند کر دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ تھانیدار نے میرے معاملے میں جانبداری کا ثبوت دیا تھا۔ چلتے ہوئے میں نے خشونت سے سرگوشی کی۔ تھانیدار پر کسی ایک پارٹی کے ساتھ جانبداری کا الزام نہ آئے اس لئے کرنا سگھ اور آئندہ کو بھی اس نے جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت تک میں وہیں تھا۔

کرنا سگھ نے تھانیدار کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑ گڑانے لگا۔ ”صاحب! ہمیں جان کا خطرہ ہے۔ ہماری حفاظت کے لئے پولیس والوں کو ساتھ بھیج دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ وجہ..... یہ..... بھی ہمارے ساتھ ہی تھانے سے نکلے گا۔ کیا پتا راستے میں ہمیں..... ہم پر حملہ کر دے۔“

اس عیار نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہی ارادہ تھا۔ خشونت سے میں نے یہی سرگوشی کی تھی۔ کرنا سگھ کی حالت دیکھ کر تھانیدار زور سے ہنسا۔ پھر بولا۔ ”تم دو آدمی ہو کر اس اکیلے چھو کرے سے ڈرتے ہو۔“

اب بھی کرنا سگھ کی حالت غیر تھی۔ وہ پھر گڑ گڑایا۔

”آ..... آپ جانتے ہیں صاحب کہ یہ چھو کرنا بہت خطرناک ہے۔ ابھی اپنے ماما سے کان میں

کچھ کہہ رہا تھا۔“

تھانیدار نے آخر ان دونوں بھائیوں کے ساتھ دو پولیس والوں کو بھیج دیا۔ میری آرزو دل میں ہی رہ گئی ورنہ کرنا سگھ کو تو ضرور ٹھنڈا کر دیتا۔

تھانے سے نکل کر میں سیدھا ہری کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”تیرے گھر سے آ رہا ہوں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے بڑی فکر تھی۔ پولیس نے تجھے کیسے چھوڑ دیا؟“

”پولیس یہ سمجھی کہ میں اس لڑائی میں شامل نہیں تھا، مگر انہوں نے ماما کو پکڑ لیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اس جھگڑے میں دوسرے پانچ آدمی مارے گئے۔“ میں نے بتایا۔ ”ہری! ذرا اس کیس کو ختم ہونے دے، پھر دیکھنا میں ان چاروں کا کیسے صفایا کرتا ہوں۔“

”لیکن ہری، تو نے اس لڑائی میں مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟ مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہے گا۔ آئندہ کبھی مجھے ایسے موقعوں پر نہ بھولنا۔“ ہری نے کہا۔

”وقت آنے دے، دیکھ لیں گے۔“ میں بولا۔ ”یہ بتا ہری، کہیں سے کچھ رقم کا بندوبست ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ تجھے تو معلوم ہے کہ اب پولیس اور عدالت کے چکر میں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پڑے گی۔“

”وجہ! ابھی ہم نے کچھ دن پہلے جو چوری کی تھی، پولیس اسی کے سلسلے میں مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے اس لئے رقم کا کوئی اور طریقہ سوچنا ہوں۔ ایسے میں کہیں اور ہاتھ مارنا قطعی مناسب نہیں ہے۔ تو گھر جا، میں کل صبح تیرے پاس آؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“

میں، ہری سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو مایاکور دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سوہن سگھ، تھانیدار کا شکریہ ادا کرتے تھانے گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تھانیدار نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ سوہن سگھ تھانے سے لوٹ کر آیا تو وہ بھی رقم کی طرف سے گرمند تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ دو ایک روز میں رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔ خشونت کے لئے اچھے سے اچھا وکیل کرو۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ پھر بھی وہ امر تر جانے کو تیار ہو گیا۔

شوہر کے جاتے ہی مایاکور مجھے سمجھانے لگی۔ یہ دوسرے دن صبح کا ذکر ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ ”وجہ! اب اس دشمنی کا انجام دیکھنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جائیے! آج گردوارے جا کر دعا مانگوں گی کہ کرو، دلوں میں محبت پیدا کر دو۔“ پھر وہ گردوارے چلی گئی۔

کچھ دیر میں جب مایاکور گردوارے سے لوٹی تو مجھ سے بولی۔ ”شکنتلا مجھے گردوارے میں ملی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے رومال میں بندھی ہوئی کچھ چیزیں میری طرف بڑھا دیں۔

”شکنتلا نے تجھے یہ بھجوایا ہے۔“

شکنتلا کا نام سن کر میں چونک اٹھا اور رومال لے کر فوراً چھت پر چلا گیا۔ رومال کی گرہ کھولتے ہی میں حیران رہ گیا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک خط پر پڑی۔ میں وہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر بلی حیرت ہوئی کہ وہ خط شکنتلا نے میرے نام لکھا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی حیرانی کا سبب تھی کہ شکنتلا

پڑھ لکھ سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ شکلتا کا خط پڑھا اور اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے مجھے دشمنوں کے ارادوں سے باخبر کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عشق کے تقاضے بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ میرے دشمنوں کی نہیں میری وفادار تھی، میری محبوبہ تھی۔

شکلتا نے خط میں لکھا تھا۔ ”وہ! برا نہ مانا۔ میں تمہارا دیا ہوا تحفہ واپس بھیج رہی ہوں۔ اس وقت انگوٹھی اور کنکین بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لو۔ وقت آئے گا تو میں اس سے بھی قیمتی تحفہ لے لوں گی۔“ پھر میں خط کی بقیہ عبارت پڑھنے لگا جس سے معلوم ہوا کہ شکلتا کو میری ضرورت کا کس طرح ہوا چلا۔ اس نے پوری تفصیل لکھ دی تھی۔

بات یہ تھی کہ جس رات ہنگامہ ہوا، اس رات شکلتا نے اپنے شوہر اور دو پور آئند کی باتیں سن لی تھیں۔ کرتار سنگھ کہہ رہا تھا۔ ”روپا چاہے کتنا ہی خرچ ہو آئند، گوپال اور گھنشیام کو ہمیں چھڑوا ہی لینا ہے۔ مزہ تو جب آئے گا کہ خشونت کو پانچ سال جیل میں سڑنا پڑے گا۔ وجہ کے باپ کے پاس دو نیچے زمین اور مکان کے سوا اور کیا ہے۔“

آئند اپنے بھائی کی بات کو سنی آن سنی کر کے بولا۔ ”اب میں چھت پر اکیلا نہیں سوؤں گا۔ میرا ہنر بھی تم دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ ہی کرے میں گلوں۔“

کرتار سنگھ نے اس پر ایک تجویز پیش کی۔ ”ایسا کریں گے کہ میں اور تو کمرے میں سو جائیں گے۔ تیری بھالی الگ سو جا کر رہے گی۔“

شکلتا نے شوہر کے منہ سے ایسی بزدلی کی بات سنی تو اس کا دل نفرت سے بھر گیا۔ کرتار سنگھ اذر کرے میں آیا اور شکلتا سے کہا۔ ”میرے اور آئند کے بستر کمرے میں لگا دینا۔“

”اور مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟“ شکلتا حیران ہو کر بولی۔

”کیوں، تجھے اکیلے سونے میں کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے تمہارے بغیر نیند کیسے آئے گی؟“ شکلتا نے اسے آتو بنایا۔

”اب آتی جا رہی ہے تو راستے پر۔“ کرتار سنگھ خوش ہو گیا، پھر بولا۔ ”کچھ دن کی بات ہے، پھر ہم لوگ ساتھ ہوں گے۔“

”کل صبح سنت بابا کے درشن کو جاؤں گی۔ مجھے تھوڑے سے پھول منگوا دینا تاکہ بابا کو ہار پہنا کر اپنے پرپی کے لئے دعا مانگ سکوں۔“

یوں شکلتا نے گردوارے جانے کا موقع نکال لیا۔ ابھی میں اسی کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نیچے سے ہری کی آواز سنائی دی۔ میں نیچے آ گیا اور دیکھا کہ ہری کے پاس ایک پوٹلی ہے۔ ہری نے پوٹلی مجھے دے دی۔

”یہ کیا ہے ہری؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مسکراتے لگا۔ میں نے خود ہی پوٹلی کھول کر دیکھی۔ یہ وہی زیورات تھیں جو چوری کی رات ہری کے حصے میں آئے تھے۔ میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر ہری بول اٹھا۔ ”دیکھو وجہ، کچھ بولنا مت۔“

ابھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان زیورات سے کچھ نہ کچھ تو کام چل ہی جائے گا۔“

”مگر میں تیرا احسان کس طرح اتاروں گا؟“ میں تذبذب میں پڑ گیا۔

”تو اسے احسان سمجھتا ہے وجہ! پھر تو یاری کچھ نہ ہوئی۔ تو مجھے تھانے سے چھڑانے آیا تھا تو احسان ہی کرنے آیا ہو گا۔“

”بات یہ ہے، ہری کہ ابھی تیرے حصے کے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر میں گھر کی اوپری منزل کے کمرے سے انگوٹھی اور کنکین لے آیا اور پھر ہری سے بولا۔ ”یہ لے، انہیں بیچ کر مجھے پیسے لاوے۔ ہے زرا جان جو حکم کا کام، لیکن چوری کا مال خریدنے والے قابل اعتماد سناؤں سے ڈبی واقف ہو گا۔ ہے نا! اور ہاں گاؤں سے کم از کم پانچ میل دور جا کر اس مال کا سودا کرنا۔ کوشش یہ کرنا کہ سارے تیرے سامنے ہی زیور دکھا ڈالے۔“

میری بات سن کر ہری مسکرایا اور بولا۔ ”تجھے یہ سب سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو میرے اگلے ہاتھ کا کام ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ہری نے سر سے پگڑی کھولی، اپنے اور میرے زیورات اس میں باندھے، پھر شام سے پہلے آنے کا وعدہ کر کے چل دیا۔

مقدمہ سوا مہینے تک چلتا رہا۔ فریقین انصاف کے پلڑے اپنی اپنی طرف جھکانے کے لئے پورا پورا زور لگاتے ہوئے تھے۔ وجہ کا نانا بھی اپنے تمام تعلقات اور پرانے مراسم استعمال کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پیسا بھی پانی کی طرح بہتا رہا۔ آخر کار وہی ہوا جو سوہن سنگھ اور میں چاہتا تھا۔ قتل کے الزام سے خشونت کو بری کر دیا گیا، لیکن گوپال اور گھنشیام بھی ساتھ ہی بری ہوئے اس لئے کہ پولیس کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی۔

قتل کے جو معنی شائد تھے، وہ سب کے سب خود اس بلوے میں شریک تھے۔ پھر یہ کہ قتل ہونے والے کسی ایک گھریا خاندان کے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس لئے یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس نے کس کو مارا۔ جب کہ مرنے والوں سے نہ وجہ کی کوئی دشمنی تھی نہ کرتار سنگھ کی۔ اس خونیں ڈرامے کو ایک بلوے کی شکل دے دی گئی۔ اتنا بڑا ہنگامہ کرنے کے الزام میں خشونت کو سوا سال، گھنشیام اور گوپال کو نو مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔

قتل کا مقدمہ تو ختم ہو گیا، مگر خشونت کی سزا سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ دونوں دشمنوں کو خشونت سے کم سزا ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گھنشیام اور گوپال بری ہو گئے تو میں عدالت سے باہر نکلتے ہی حساب چکا دوں گا، مگر اس غیر متوقع فیصلے نے میری ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دوران خون بڑھ گیا۔ بار بار مجھے اپنی جتنی صفات کا خیال آتا۔ اگر وہ مجھ سے نہ جھمن جاتیں تو یہ سارا قصہ چند لمحوں کا تھا۔

پھر میں نے سوچا، قدرت کو اگر نو مہینے انتظار کرانا مقصود ہے تو یہی سسی۔ چاروں بھائیوں کو میں نے ایک ساتھ ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میری محبوبہ شکلتا پر اس کا بوڑھا اور ناکارہ شوہر کرتار سنگھ جو ظلم ڈھا رہا تھا، اسے سوچ سوچ کر

میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ اسی بے چینی کے عالم میں وجہ کے نانا کی بھیجی ہوئی گھوڑی مانک کوئی نے تیار کیا اور اس پر سوار ہو کر ایڑ لگا دی۔ مانک آن کی آن میں ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ وجہ کے جسم سے مانوس تھی۔ اس کے ایک ایک اشارے پر عمل کرتی تھی۔ مجھے یہ لال تھا کہ میں ایک جن زاد ہو کر آدم زادوں کے جسوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کئی بار مجھے یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ کسی آدم زاد کے جسم سے نکل کر میں کسی دوسرے آدم زاد کا جسم اپنا بے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کسی آدم زاد کا جہ چھوڑ کر میں ایک ناقابل بیان کرب و اذیت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایسا اس وقت سے ہوا تھا جب میں بھوانی دیوی کا جاپ کیا تھا۔ یہ سزا جانے کب تک مجھے بھگتنا تھی۔

وہ دوسرا وقت تھا مگر اس روز گرمی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میری گھوڑی کے ساتھ ساتھ بادل بھی دوڑ رہے تھے۔ بادل اور میں، ہم دونوں ہی اپنی منزل سے بیگانہ تھے۔ ہم بے غم تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

مانک دوڑتی رہی۔ اب مجھے ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ پیڑ اور پودے جیسے بارڈر کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھے۔ زمین کی دھول اڑا کر بادلوں سے ہم کنار ہونے کو بے چین تھی۔ دھول اڑتی تو پیڑ بھی جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگتے۔ موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ ایسے میں مجھے اپنی محبوبہ شکنتلا یاد آگئی۔ اس کے قرب کا ایک ایک زاویہ میری آنکھوں میں گھونسنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے میں دل ٹھہر جائے گا۔ میں نے تیزی سے مانک کی لگام کھینچی اور اسے واپس مولا لیا۔ تیز رفتار گھوڑی رکتے رکتے بھی کچھ فاصلہ طے کر گئی تھی۔

میں نے مانک کی پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ”چل، گھر واپس چل۔“ گھوڑی نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ابھی میں کچھ ہی فاصلہ طے کر سکا تھا کہ بادل ٹوٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ مانک سر جھکائے بھاگی جا رہی تھی۔ میں اپنی شکنتلا کی یاد گم بارش سے شرابور ہو رہا تھا۔ تازہ ہوا میں اب پیاسی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک شامل ہو گئی تھی۔ موسم کی پہلی بارش ہو اور پنجاب کے دیسات خاموش رہیں، ناممکنات میں سے ہے۔ سب بارش انتظار کرتے ہیں۔ بارش ہونے کی دیر تھی، ننگ و مڑنگ بچے گلیوں میں شور مچاتے بارش کے مزہ اڑانے نکل آتے۔

سہاگین چھتوں پر جا کر پڑوسنوں سے باتیں کرتے ہوئے برسات کا لطف لے رہی تھیں۔ گھر پہنچاؤ میں نے لباس تبدیل کیا اور ادھر ہی منزل پر اپنے کمرے میں بچے بستر لیٹ گیا۔ بھیکے موسم نے جیسے میرے انگ انگ میں آگ سی لگا دی تھی۔ میں نے بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر شکنتلا کا چہرہ اب میرے سامنے تھا۔

شکنتلا اس وقت بھی اپنے گھر کی چار دیواری میں قید تھی۔ کھلے صحن کو آج صبح ڈھانپ دیا گیا تھا چھت پر جانے والے زینے کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شکنتلا کا شوہر کرنا سنگھ شراب پینے کا شوقین بھی تھا۔ ایسے موسم میں تو اور بھی بے نوشی کا لطف آتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے ہم عمروں -

مانگ شراب نوشی میں مصروف ہو گا۔ پھر مجھے شکنتلا کے سب سے چھوٹے دیور آند کا خیال آیا۔ اس کی لطف سے بھی میں فکر مند تھا۔ شکنتلا کے لئے آند کی آنکھوں میں کئی بار میں نے ہوس کے سائے ٹاپتے دیکھے تھے۔ آند کا دھیان آتے ہی اس کا چہرہ میرے سامنے آگیا اور میں چونک اٹھا۔ آند مجھے اپنے گھر کے سامنے رکتا نظر آیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گھر کے دروازے پر تالا ہوا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔

شکنتلا باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی چولہا پھونک رہی تھی۔ آند نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بڑے ہلچلے لمحے میں بولا۔ ”کیوں بھائی، کیا ہو رہا ہے؟“

”کیا تو اور تیرا بھائی آج جلدی گھر لوٹ آئے؟“ شکنتلا نے پوچھا۔ وہ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ کرنا سنگھ بھی آند کے ساتھ گھر آیا ہو گا۔

”بھائی تو اس بھیکے موسم کا مزہ لینے دوستوں کے ساتھ کہیں دارو پی رہا ہو گا، مگر مجھے تمہارا خیال آ گیا بھائی۔ اس لئے گھر چلا آیا۔“ آند بولا۔ ”تم بھی کیا ہو بھائی۔ ہر وقت چولہا پکلی کرتی رہتی ہو۔ ذرا دیکھو تو گھاؤں کی عورتیں چھتوں پر بارش کے مزے لوٹ رہی ہیں اور تم رسوئی (بادرچی خانہ) میں گھسی بیٹھی ہو۔“

یہ سن کر شکنتلا نے آند کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ شاید آند کے چہرے سے اس کے دل میں چھپے ارادوں کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

چند لمحے رک کر آند پھر محبت بھرے لمحے میں بولا۔ ”مگر اس میں تمہارا بھی کیا قصور بھائی۔ گھر میں ہر طرف تو تالے پڑے ہیں۔ پھر تم کیا کر سکتی ہو۔ ٹھہرو، میں ابھی تمہارے لئے چھت پر جانے والے زینے کے دروازے کا تالا کھولے دیتا ہوں۔“

پھر آند نے جو کہا تھا وہی کیا۔ اس نے زینے کے دروازے کا تالا کھول دیا تھا۔

”بھائی! تم جلدی سے چھت پر جا کر نما لو۔“ آند نے زور سے کہا۔ ”ورنہ بارش کا زور ٹوٹ جائے گا۔ بھائی آگیا تو تمہیں آواز دے کر نیچے بلا لوں گا۔“

میں نے بند آنکھوں سے شکنتلا کو زینہ چڑھتے دیکھا۔ بارش خوب ہو رہی تھی۔ وہ بارش میں نہانے لگی۔

شکنتلا کو ابھی چھت پر زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نیچے سے آند کی آواز آئی۔ ”بھائی! جلدی سے نیچے آؤ۔“

اس عرصے میں آند نے بھیکے ہوئے کپڑے اتار دیئے تھے اب اس کے جسم پر صرف چھوٹا سا ایک ٹکڑا تھا۔

آند کی آواز سن کر شکنتلا شاید یہی سمجھی کہ اس کا شوہر کرنا سنگھ بھی گھر واپس آ گیا ہے۔ اس کے بھیکے کپڑے جسم سے چٹے ہوئے تھے، اس طرح کہ لباس اور بے لباسی میں فرق نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے نیچے اتر آئی اور بھیکے ہوئے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اس وقت میں نے آند

لے آگے بڑھا ہی تھا کہ ٹکٹلا نے اس کے پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس سے ہاتھ سے جلتی ہوئی لکڑی چھوٹ گئی۔ ٹکٹلا نے جلدی جلدی منہ پر بندھی ہوئی چادر کھولی۔

میں نے اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میرا خیال تھا کہ آئندہ دستک سن کر یہ سمجھے گا، اس کا بھائی کرنا سنگھ آگیا ہے۔ پھر دی دروازہ کھولے گا، مگر جب ٹکٹلا نے دروازہ کھولا تو میں مایوس ہو گیا۔ لمحے بھر کو اس کی اور میری نظریں ملیں اور پھر میں تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر آئندہ دروازہ کھولتا تو میں اسے ٹھنڈا کر دیتا کہ میرا یہی ارادہ تھا۔ ٹکٹلا کی آبرو بہر حال بچ گئی تھی۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔ آئندہ اب دوبارہ اسے قابو میں نہیں کر سکتا تھا۔ میں پھر بھی ٹکٹلا کی طرف سے ناظم نہیں رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک بار پھر اس کا دھیان کیا۔

اس مرتبہ وہ مجھے باورچی خانے میں نظر آئی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے شوہر کرنا سنگھ کو بھی دیکھا۔ وہ گھروٹ آیا تھا۔

”تالا کس نے کھولا؟“ کرنا سنگھ نے غصے میں ٹکٹلا سے پوچھا۔

”تمہارے بھائی نے۔“ ٹکٹلا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”وہ اتنی جلدی گھر کیسے آگیا؟“

”اسی سے پوچھ لو۔“

پھر میں نے کرنا سنگھ کو اندر کمرے میں جاتے دیکھا۔ وہاں آئندہ دونوں ہانوں سے پیٹ پکڑے چارپائی پر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرنا سنگھ کچھ پوچھتا، آئندہ نے خود ہی اپنی صانائی پیش کی۔ ”پیٹ میں بڑے زور کا درد ہو رہا تھا اس لئے چلا آیا، ابھی ابھی آیا ہوں۔“

اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی کہ ٹکٹلا کا شوہر گھر واپس آ چکا تھا۔ میں نے اسی لئے آنکھیں کھول دیں۔ آئندہ کے الفاظ اب بھی میرے ذہن پر ضرر میں لگا رہے تھے۔ میرے اوپر اتنا بڑا الزام لگا کر آئندہ کا زندہ رہنا، میرے لئے بہت بڑی گالی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ ٹکٹلا جب بھی میرے سامنے آتی، میں اپنا سارا غصہ بھول جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرا وجود صرف محبت ہی محبت ہے۔ نفرت جانے کہاں چھپ جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ ٹکٹلا نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور اس سے میری نظریں ملی تھیں، نفرت و انتقام کے جذبات سرد ہو گئے تھے ورنہ میں اپنی محبوبہ کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے والے کو زندہ نہ چھوڑتا۔

اپنی اس کمزوری کا خود مجھے بھی احساس ہو چکا تھا کہ میں، ٹکٹلا کے سامنے موم کی طرح پگھل جاتا ہوں۔ جب بھی ایسا ہوتا میں خود کو اپنے اندر بہت تنہا محسوس کرتا۔ اس وقت بھی میرا یہی کیفیت تھی۔ میں گھر سے نکل گیا اور گاؤں کی گلیوں میں یونہی بے مقصد گھومنے لگا۔ اسی دوران مجھے ہری مل گیا۔

”یارا! میں تجھی کو تلاش کر رہا تھا۔“ ہری مجھ سے بولا۔ ”آج موسم کی پہلی بارش ہوئی ہے۔ ایسی سلونی شام پیئے بغیر گزارنا ظلم ہے۔ چل، گتے میں چلتے ہیں۔“

میرے جسم کی بھی اس وقت یہی طلب تھی۔ سو میں راضی ہو گیا۔

کی آنکھوں میں انگارے سے دیکھتے دیکھے۔ ٹکٹلا کو اس حالت میں دیکھ کر یقیناً آئندہ کی ہوس جاگ اٹھی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ ٹکٹلا کے کمرے میں گھس گیا۔ اس سے پہلے وہ باورچی خانے میں گیا تھا۔

ٹکٹلا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اب آئندہ اس کے سامنے تھا۔ آئندہ کی آنکھوں میں ہوس کے شعلے ناچ رہے تھے۔ آئندہ نے بڑی پھرتی سے ٹکٹلا کو پکڑ کر اس کے منہ پر چادر باندھ دی۔ ٹکٹلا نے اپنے منہ پر بندھی ہوئی چادر کھولنے کے لئے ہاتھ اٹھائے، مگر اسی وقت آئندہ نے لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا۔ ”آج تو میری نہ ہوئی تو تجھے زندہ جلا دوں گا۔“

آئندہ باورچی خانے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لیا تھا جو زمین پر پڑی تھی۔ اس نے جھک کر وہ لکڑی اٹھالی۔

ٹکٹلا غصے کے مارے کاپٹے لگی۔ اسے غالباً یہ توقع نہیں تھی کہ اس کا دیور یہاں تک گر سکتا ہے۔ اس کا منہ چادر سے بندھا ہوا تھا اور جلتی ہوئی لکڑی جسم سے بہت قریب تھی۔ ٹکٹلا کی آنکھوں میں نیچے غصے کے ساتھ ہی خوف کے سائے بھی نظر آئے۔

آئندہ نے ٹکٹلا کے غصے کو محسوس کر لیا اور بڑے واہیات لہجے میں کہنے لگا۔ ”ہائے بیگیا بدن اور یہ غصہ۔ آج تو تو اور غضب ڈھارہی ہے۔“

ابھی آئندہ کی بات ختم ہوئی تھی کہ ٹکٹلا نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا، مگر وہ ہوشیار تھا۔ اس نے ٹکٹلا کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔

”آج تیرا زور نہیں چلے دوں گا۔“ آئندہ بولا۔ ”ترساتی کیوں ہے؟ مان جا..... دل کی آگ بجھا دے۔“ یہ کہتے ہی آئندہ نے ٹکٹلا کو اپنی طرف کھینچا۔ ٹکٹلا نے زور لگا کر آئندہ کو دھکا دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

اب میرے لئے یہ مناظر ناقابل برداشت ہو گئے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ کوئی میری موجودگی میں زبردستی ٹکٹلا کو بے آبرو کر دیتا۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے برابر والی چھت پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ تیزی کے ساتھ میں ٹکٹلا کے کمرے تک پہنچا جس کا دروازہ بند تھا۔ اسی وقت میری سماعت سے آئندہ کی آواز نکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس وقت ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہاں کہہ دے۔ اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لئے بس دو گھڑی کے لئے آنکھیں بند کر لے۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ تو راضی ہے۔ پھر میں تیرا منہ کھول دوں گا۔ دیکھ مجھ سے زیادہ خڑے نہ دکھا..... انگارے میں سر نہ ہلا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے بھالی کہ وجہ تجھ کو خراب کر چکا ہے۔ پھر بھی میں اس میں تیرا قصور نہیں سمجھتا۔ آخر بوڑھے اور جوان کی کیسے جھگڑا سکتی ہے۔ تین سال شادی کو ہو چکے، مگر تو ماں نہیں بن سکی۔ مجھے تجھ سے صرف ایک شکایت ہے کہ مجھ جیسا مرد جب گھر میں موجود تھا تو تجھے وجہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔“

میں نے کمرے کے اندر موجود ٹکٹلا کا تصور کیا کہ دیکھوں وہ کس حال میں ہے؟ کہیں آئندہ نے اس پر قابو تو نہیں پالیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے ٹکٹلا نظر آگئی۔ آئندہ اسے اپنی ہانوں میں بھرنے کے

پیتے ہوئے بھی میں شکنتلا کے دھیان میں گم تھا۔ ہری نے میرے کھوئے کھوئے پن کو محسوس کر لیا اور کہا۔ ”یار دے! تو میرا بگڑی دوست ہے۔ تیرا چپ رہتا مجھے پریشان کر رہا ہے۔ جو بھی بات ہو مجھے بتا دے۔ میں تیرے لئے جان بھی دینے کو تیار ہوں۔“

میں نے ہری کی بات کا مختصر سا جواب دیا۔ ”ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے جس کا ذکر جائے۔“ پھر سامنے لگے ہوئے ایک پوسٹر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس پوسٹر میں ایک جوان فوجی وردی پہنے بدوق ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”فوج میں بھرتی کھلی ہے۔“

ہری نے مجھے ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں دیکھ رہا ہے دیوار پر لگے ہوئے اس پوسٹر کو؟ کیا فوجی بننے کا ارادہ ہے؟ یاد ہے ایک مرتبہ انکپٹر متانے بھی تجھے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا۔“ ہری نے یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر پوسٹر پر نظریں جمادیں اور بولا۔ ”ویسے یہ وردی تجھ پر بچنے کی ہمت اور فوجی رعب دار لگے گا۔“

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا اور پوسٹر کو دیکھ کر کہا۔ ”مجھے وردی سے نہیں، بدوق سے دلچسپی ہے۔“ پھر یوں ہی جھوٹ بول دیا۔ ”مجھے بدوق چلانا اب تک نہیں آیا۔“ پھر کچھ دیر کے بعد ہری کے ساتھ میں اس دسویں شراب خانے سے اٹھ آیا۔ پوسٹر میں بھرتی کے لئے اہلہ فوجی چھاؤنی کا پتا لکھا تھا۔ وہ پوسٹر دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور ہی انوکھا خیال آیا تھا۔ ہری اپنے گھر چلا گیا اور میں نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔

دبے کی ماں مایا کو رکھانے کے لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کھانے کو کہا تو میں بولا۔ ”میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا ماں، تو کھالے۔“

پھر میں اوپری منزل پر چلا آیا۔ کپڑے بدلے بغیر ہی میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ خاصی بارش ہو جانے کے باوجود آسمان اب بھی ابر آلود تھا۔ بادل ہوا سے انگلیاں کر رہے تھے۔ تیز ہوا چلتی تو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگتے لیکن ہوا ہر جگہ انہیں چھیننے لگی جاتی۔

میں بہت دیر تک یہ آنکھ پھولی دیکھتا رہا، پھر آنکھیں موند کر کرٹ لے لی۔ اب اندھیرا کچھ اور بدھ گیا تھا۔ برسات کی رات میں جھینگڑوں کی آوازیں عجیب سے تسلسل کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ مٹا میں چونک اٹھا۔ اس وقت میں، اپنے رقیب آئندہ کی بارے میں آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا کہ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

آئندہ کے چہرے پر مجھے تکلیف کے آثار نظر آئے۔ تکلیف کے سبب ہی یقیناً وہ سو نہیں سکا تھا۔ مجھے اس تکلیف کی وجہ معلوم تھی۔ شکنتلا نے اس کے پیٹ پر بڑی زور کی لات ماری تھی۔ وہ اس وقت بھی وہ کہہ رہا تھا۔ کہ تیرا شکنتلا اس کے برابر ہی سونے کے لئے لیٹا تھا۔ مگر کراہنے کی وجہ سے بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔

”آئندہ! آخر تیرا شکنتلا بول ہی اٹھا۔ اگر تیرے پیٹ میں درد ہے تو اٹھ کر جنگل ہو آ۔“

بڑے بھائی کی بات سن کر آئندہ کے چہرے سے خوف جھٹکنے لگا۔ خوف کی وجہ باہر کا سنائی ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس نے کراتار سنگھ کی طرف سے کرٹ لے لی۔ جیسے سونا چاہتا ہو، لیکن چند ہی لمحوں بعد اس کے منہ سے پھر زوردار کراہ نکل گئی۔ اس نے تکیہ اپنے پیٹ کے نیچے دیا، مگر کراہے بغیر نہ رہ سکا۔ کراتار سنگھ نے پہلے پیار سے پھر سختی سے ڈانٹا۔ ”جب اتنی ہی تکلیف ہے تو پھر کتنا کیوں نہیں دیتا۔“

ڈانٹ کھا کر آئندہ کو اٹھنا ہی پڑا اور بولا۔ ”میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ پھر اس نے ایک ہاتھ میں لوٹا اٹھالیا۔

”آئندہ! لائین اور ڈانگ بھی لے لے تاکہ کچھ میں پھسل و سل نہ جائے۔“ کراتار سنگھ نے اندر سے کڑی لگائی۔

انتقام! انتقام! کوئی میرے اندر جیسے چیخ اٹھا۔ آئندہ کو ٹھکانے لگانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ میں نے جھپٹتے ہی چارپائی کے پاس رکھی ہوئی اپنی مخصوص ڈانگ اٹھائی، پھر میڑھیاں اتر کر صحن سے گزرتا ہوا لک کے اصطبل میں آ گیا۔ میں نے گھوڑی کھولی اور پھر بڑی آہستگی کے ساتھ گھر سے نکل کر اندھیرے کا نہ بن گیا۔ بڑی خاموشی سے ایک لمبا چکر کاٹ کر میں گھرے ہوئے ایک مکان کے پاس پہنچا۔ میرے رازے کے مطابق آئندہ یہاں سے آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ میں ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں چپ گیا۔ قریب ہی درخت لگے ہوئے تھے۔

آئندہ مجھے دور ہی سے آتا دکھائی دے گیا۔ اس کے ہاتھ میں چلتی ہوئی لائین تھی جس کی لو بار بار اسے بھڑک رہی تھی۔ وہ چند ہی قدم اور چلا ہو گا کہ تیز ہوا کے ایک جھونکے سے لائینیں بھج گئیں۔ می ہوئی لائین اس نے ایک قریبی بیڑ کے نیچے رکھ دی، شاید اس خیال سے کہ وہاں ہی میں لیٹا جائے گا۔ سنسان ماحول، ہوا کی سرسراہٹ، بیڑوں کے شور بچاتے پتے ساری فضا کو خوفناک بنائے ہوئے تھے۔ میں جس مکان کے کھنڈر میں چھپا بیٹھا تھا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ کچے راستے کی مٹا نے بارش کے بعد کچھڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اونچے نیچے راستے پر تھوڑا تھوڑا پانی موجود تھا۔ نڈ کے تیز چلنے سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔

آئندہ کو خبر نہیں تھی کہ وہ اپنی موت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ کھنڈر کی ایک دیوار سے چپکا ہوا ناہنی ڈانگ میں لگی ہوئی برہمی تو لے آئندہ کا خطر تھا۔ اپنی گھوڑی مانک کو میں اس کھنڈر کی دوسری طرف بیڑوں کے پیچھے باندھ آیا تھا تاکہ آئندہ کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔

جیسے جیسے آئندہ کے قدموں کی ”چمپ چمپ“ قریب آ رہی تھی، میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون نام کے جلتے ہوئے زخموں کی تپش سے کھول کر باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا جب آئندہ میری محبوبہ کو بے آہود کرنے والا تھا۔

آئندہ نے کھنڈر کی پہلی دیوار کے پاس پڑے اینٹوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھا اور میرے ہاتھ کی گرفت میں لگی برہمی پر سخت ہو گئی۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا کہ کہیں سانس کی آواز سن کر آئندہ

چوکننا نہ ہو جائے۔ رحم، ظلم، گناہ اور ثواب ان سب باتوں سے میں اس وقت بے بہرہ تھا۔ اگر مجھے پکڑا ہوا تھا تو صرف قتل، بدلہ اور انتقام۔ آئندہ اینٹوں کے ڈھیر سے اتر کر دیوار کے قریب آیا ہی تھا کہ میں نے اپنے پاؤں سے اڑنکا لگا دیا۔ آئندہ میرے پیر سے الجھ کر اس طرح گرا کہ اس کے ہاتھ سے لوٹا اور لاٹھی دونوں چھوٹ گئے۔ آئندہ شاید یہ سمجھا کہ کسی پتھر وغیرہ سے ٹھوکر لگی ہے اور اندھیرے کو گالیاں دیتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اب میں اسے مزید مہلت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں برچھی تھی۔ اس نے چیخنے کے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے تیزی سے اپنا ایک پاؤں اس کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ وہ تڑپا، مگر میں نے ایک مرتبہ پھر پاؤں پر زور دے کر اس کا منہ ایسے کچلا جیسے وہ ساپ کا منہ ہو۔ اس کے بعد میں نے دانت چس کر کہا۔ ”سائلے، حرائی، بچ، ٹوٹے اسی زبان سے کہا تھا کہ میں نے تیری بھالی کو خراب کیا ہے۔ آج میں اس زبان کو اس قابل ہی نہ چھوڑوں گا کہ پھر کوئی لفظ ادا کر سکے۔ اپنی مردانگی تو ایک کمزور عورت کو دکھا رہا تھا کہتے۔“

آئندہ نے معافی مانگنے کے لئے دونوں ہاتھ جوڑے، مگر مجھے اس پر رحم نہ آیا۔ میں نے برچھی اس کے پیٹ میں گھسیڑ دی۔ وہ تڑپا اور دونوں ہاتھوں سے برچھی پکڑ لی، مگر برچھی اپنا کام کر چکی تھی۔ میں نے ذرا سا زور لگایا اور برچھی کو جب ترچھا اڑا کر کے اوپر کھینچا تو برچھی پیٹ کو ناف سے سینے تک چیرتی ہوئی باہر آگئی۔ اسی کے ساتھ خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آئندہ آن کی آن میں ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اپنا پیر آئندہ کے منہ سے ہٹایا، کچڑ اور اینٹوں کے درمیان پڑی لاش پر نفرت سے نگاہ ڈالی۔ پھر اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔ ”اب میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تیرے بھائیوں کو بھی موت کی نیند نہ سلا دوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی خون آلود برچھی کو مقتول آئندہ کے کپڑوں سے صاف کیا، تیزی سے مانک کے پاس پہنچا اور اس پر سوار ہو گیا۔

گھوڑی کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ میں ’نانک پور سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی میں کچھ ہی دور چلا تھا کہ اچانک بارش ہونے لگی۔ میں اس لئے ناک پور سے بھاگا تھا کہ آئندہ کے قتل کا شبہ مجھی پر کیا جاتا اور پولیس مجھے گرفتار کر لیتی۔ وہ علاقہ میرے لئے نیا تھا۔ مجھے نہ راستوں کا علم تھا نہ منزل کا پتہ۔ میں بس آئندہ کے قتل کا راز فاش ہونے سے پہلے پہلے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ بارش کی وجہ سے ہر طرف قیامت خیز طوفان آیا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میرے راستے میں آ جانے والی ندی اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو ہالے جانے پر آمادہ تھی۔ یہ دیکھ کر میں ندی کے کنارے رک گیا، مگر قدم پیچھے ہٹاتا تو بھی موت کا سامنا تھا۔ سامنے بڑھنے پر بھی ندی کی طوفانی لہروں میں مجھے موت کی پرچمائیاں لہرائی نظر آرہی تھیں۔ مانک میرے حکم کی خاطر تھی۔

کڑکٹی بجلی اور موسلا دھار بارش میں آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ گھوڑی کو میں نے خدا کے بھروسے پر پانی میں اتار دیا۔ میں جتنا آگے بڑھ رہا تھا پانی کے بہاؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جیسے پانی کے تیز ریلے کہہ رہے ہوں، واپس چلا جا۔ ہم تجھے دوسرے کنارے کی بجائے دوسری دنا

میں پہنچا دیں گے۔ پھر بھی میں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ اچانک میرا ہاتھ اس تحویذ سے ٹکرایا جو ٹکٹلانے لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے جیسے میرے جسم میں ایک انجانی طاقت آگئی۔ میں نے تیز نظروں سے سامنے کے کنارے کو دیکھا۔ گھوڑی زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاک نکل رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھنے کے لئے برابر زور لگا رہی تھی۔ پانی بار بار اس کا راست روک رہا تھا۔ میں مانک کی گردن سے لپٹ گیا۔ آدھا راست طے کر لینے کے بعد میرا اور مانک کا حوصلہ پھر جواب دینے لگا۔ موت قریب سے قریب تر ہونے لگی، لیکن میں ہر قیمت پر اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتا تھا۔

پانی کے زور دار ریلوں میں تقریباً آدھے میل میں ٹکٹا رہا۔ اچانک میرا سر ایک پیڑ کی شاخ سے ٹکرایا۔ میں نے اس شاخ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سارا تلے ہی میرے ہوش بجا ہوئے تھے تو مجھے سامنے والا کنارہ بالکل ہی قریب نظر آیا۔ یہاں پانی کا بہاؤ بھی کم تھا۔ مانک بہ آسانی ندی سے نکل کر سامنے کے کنارے پر کھڑی ہو چکی تھی۔ جب میں نے زمین پر پاؤں رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے نئی زندگی ملی ہو۔ میں نے پیار سے مانک کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو اس نے بھی میرے شانوں میں گردن ڈال دی۔

میں گھوڑی پر سوار ہو کر آگے بڑھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ مجھے بہر حال رات کی زیادہ سے زیادہ سفر کر کے دور نکل جانا تھا۔ دو تین فرلانگ ہی آگے جا کر میں نے عجیب سی آواز سنی۔ ذرا غور کرنے پر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ آواز ریلوے کے انجن کی ہے۔ یہ جانتے ہی میں نے مانک کی رفتار تیز کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ قدرت میری مدد کر رہی ہے۔ ذرا آگے جا کر مجھے ایک مال گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں تیزی سے مانک کو اس کے قریب لے آیا۔

اندھیرے میں گھوڑی پر سفر کرنا خطرناک تھا۔ میں نے اپنی ڈانگ مانک کی پیٹھ پر باندھ دی اور خود مال گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اسی وقت انجن کی سبلی سنائی دی۔ میں نے مانک کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”مانک! تانا کے گھر پہنچ جانا۔“

مال گاڑی چل پڑی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مانک مخالف سمت میں خرابھاگی جا رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور پھر آنکھیں بند کر کے اپنے دھیان کی قوت آزمانے لگا۔

☆=====☆

سورج کی پہلی کرن اور لوگوں کی آوازیں سے میں چوکننا ہو گیا۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو گاڑی ابلالہ کے ریلوے یارڈ میں کھڑی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر میں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ پھر میں پولیس کی نگاہ سے چھپ کر دو دن تک روزگار کی تلاش میں گھومتا رہا۔ وہ شہر میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔

اس نئے شہر میں آ کر میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ وجہ کا جسم چھوڑ کر کسی اور آدم زاد کے جسم میں پناہ لے لوں۔ مجھے اس وقت تک یہ علم نہیں تھا کہ اب وجہ کا جسم بھی حسن علی کی طرح میرے لئے ایک قید خانہ بن چکا ہے۔

ہوا یہ کہ میں نے ایک صحت مند اور خوب صورت نوجوان کو کبھی میں بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ اپنے لباس اور رکھ کھاؤ سے وہ کسی امیر گھرانے کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا

ڈراک، ورزش اور چڑھتی جوانی نے مجھے بدل کر رکھ دیا، لیکن اندر سے میں اب بھی وہی تھا، ٹکٹا کا ماسٹر وجے۔ اس ظالم کو میں ابھی بھولا نہیں تھا اور اسی کے ناتے میں نے اس عرصے میں اپنے دھیان کی قوت کو کئی بار آزمایا تھا۔ میں اسی کی وجہ سے ٹانگ پور میں پیش آنے والے ان واقعات سے بھی آگاہ تھا جو میرے بعد وہاں رونما ہوئے تھے۔ مجھے اسی دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ وجے کے لئے اس کی ماں مایاکور نے ایک لڑکی سرونج بھی پسند کر لی تھی۔

اس رات جب میں ٹانگ پور سے فرار ہوا تھا تو آئندہ کے واپس نہ آنے سے اس کے بڑے بھائی کرہار سنگھ کو فکر ہوئی۔ اس وقت تک بارش شروع ہو چکی تھی۔ کرہار سنگھ بارش ہی میں سر پر ٹاٹ ڈال کر گھر سے نکلا اور قریب میں رہنے والے رشتے داروں کو جگایا۔ آئندہ کے بارے میں جان کر سب پریشان ہو گئے۔ تلاش کرنے پر اس کی لاش مکان کے کھنڈر سے برآمد ہو ہی گئی۔ کرہار سنگھ کی چیخوں سے سارا گاؤں ہی جاگ گیا۔ اس نے اپنے بھائی کے قتل کا الزام وجے، یعنی مجھی پر لگایا تھا۔ مایاکور اور سوہن سنگھ ہی جاگ اٹھے۔ سوہن سنگھ نے صحن میں دیکھا تو وہاں گھوڑی نہیں تھی۔ پھر اس نے اوپری منزل پر جا کے مجھے بھی نہ پایا۔ وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔

پھر پولیس آگئی۔ تھانیدار نے سوہن سنگھ سے میرے بارے میں پوچھا اور پھر سپاہیوں کو گھر کی لاش لینے اندر بھیج دیا۔

”وجے تو شام سے گھر پر نہیں ہے۔ وہ تو اپنے نانا سے ملنے دھرم گھر گیا ہے۔“ سوہن سنگھ نے تھانیدار سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

تھانیدار بولا۔ ”کرہار سنگھ کے چھوٹے بھائی آئندہ کو قتل کر دیا گیا ہے، معلوم ہے؟ اور اس خاندان سے تمہاری کئی پشتوں کی دشمنی چل رہی ہے نا؟“

اتنے میں سپاہیوں نے آکر اطلاع دی۔ ”گھر میں بڑھیا اکیلی ہے، کوئی اور نہیں ہے۔“

”سوہن سنگھ۔“ تھانیدار نے پوچھا۔ ”وجے گھوڑی لے کر گیا ہے؟“

سوہن سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آئندہ کی لاش کے قریب ہی کچڑ میں گھوڑی کے سموں کے نشان ملے ہیں۔“ تھانیدار نے گویا شاف کیا۔ پھر اس نے مڑ کر حکم دیا۔ ”چار آدمی جب لے دھرم مگر تک تعاقب کرو۔ دوسرے سپاہیوں سے کہہ دو کہ پورے گاؤں کو چھان ڈالیں اور ہاں اس ہری کی بھی اچھی طرح خبر لے لیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں، جلدی اطلاع دینا۔“ سپاہی چلے گئے تو تھانیدار نے پھر سوہن سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا بیٹا میری لڑکی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ متا صاحب صبح ہی غصے میں پھٹکے ہوئے آن دھکیں گے۔ اس روز تو متا صاحب نے تمہارے بیٹے کو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ یہ بچہ اب ہمارے ہی دل پر ایلے تھاپنے لگا ہے۔“

اسی طرح آدھا گھنٹا گزر گیا۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

معاذ جپ کی آواز سن کر سب چونک اٹھے۔ تھانیدار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”معلوم ہوتا ہے، پکڑا

اور وجے کے جسم سے نکلنے کے لئے ”جے بھوانی“ کا نعرو لگایا۔ وجے کے جسم کو شدید جھٹکا لگا، مگر میں اس سے باہر نہیں نکل سکا۔ جھٹکا لگنے سے البتہ یہ ضرور ہوا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ امیر نوجوان کی کبھی آگے نکل چکی تھی اور میں سڑک کے کنارے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ وجے کے جسم سے نکلنے کے لئے زور لگایا اور بھوانی دیوی کا نعرو بھی مارا، مگر بے سود۔ یہ میرے لئے بڑی بول ٹانگ بات تھی کہ اب میں ایک آدم زاد کے جسم کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدم زاد کے جسم میں نہیں اتر سکتا تھا۔ میں سخت پریشان ہو گیا۔ نئی صورت حال میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ جیسے تیسے تو بھوانی دیوی کا جاپ کر کے میری یہ جنتی صفت مجھے واپس ملی تھی کہ میں آدم زادوں کے جسموں پر قبضہ کر سکتا تھا اب یہ صفت بھی مجھ سے چھین گئی تھی۔

دیر تک میں اسی سڑک کے کنارے گم مسم کھڑا رہا۔ آدم زادوں سے عشق کا انجام آخر کار یہ ہوگا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک جن زاد ہونے کے باوجود کسی آدم زاد اور مجھ میں اب فرق ہی کیا رہا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ میں ایک نوجوان جسم میں تھا ورنہ تو کوئی اچیز عمر جسم بھی میرا مقدر بن سکتا تھا۔ خود کو میں نے کبھی اس سے پہلے اتنا بے بس اور مجبور محسوس نہیں کیا تھا۔ تصور کی پراسرار قوت کے بارے میں اب بھی میں پریقین نہیں رہا تھا کہ جانے وہ بھی کب چھین جاتی۔ مجھے یاد آیا کہ وجے کے جسم میں داخل ہوتے وقت بھی بڑی دقت پیش آئی تھی۔ میں آسانی سے اس کے جسم پر قبضہ نہیں کر سکا تھا۔ کئی بار کوشش کے بعد مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ میں اس وقت ایک ایسے نوجوان کے جسم میں گویا قید تھا جو ایک شخص کو قتل کر چکا تھا۔ میں قانون کی نظر میں بہر حال ایک مجرم تھا۔ مجھے اگر گرفتار کر لیا جاتا تو لازماً آئندہ کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی ہو جاتی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ پھانسی ایک آدم زاد کو نہیں ایک جن زاد علیالیش، یعنی مجھے ہوئی ہے۔ یوں وجے کے جسم میں قید ہو جانے کے سبب میں بھی مارا جاتا۔ مجھے اب اسی لئے ہر قیمت پر اپنے موجودہ جسم کو قانون کی گرفت سے بچانا تھا۔

اس سال پنجاب کے تمام دریاؤں میں سیلاب آ جانے سے تباہی مچ گئی تھی۔ سینکڑوں گاؤں ڈوب گئے تھے۔ ہر طرف انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کے ڈھیر تھے۔ بے گھر ہونے والوں کے لئے ریف کیپ کھل چکے تھے۔ ان کے لئے فنڈز جمع کئے گئے تھے، لیکن میرے لئے ان کیپوں میں آسرا لینا مناسب نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ پولیس میری تلاش میں وہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔

میں ابھی اسی فکر میں تھا کہ کیا کروں، مجھے ایک مرتبہ پھر وہی پوسٹر نظر آیا جس میں جوانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ پوسٹر میں ٹانگ پور میں دیکھ چکا تھا۔ مجھے یہی ایک آسان اور محفوظ راستہ نظر آیا اور میں چھاؤنی کی طرف چل پڑا۔

فوجی چھاؤنی میں جب مجھ سے میرا نام پوچھا گیا تو میں نے ایک فرضی نام تارا سنگھ بتا دیا۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرا گھر اور گھر کے تمام افراد سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں اور اب دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں نے اسی لئے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

خاکی چٹون، خاکی قیض اور سر پر پگڑی، میں اس لباس میں، بالکل بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ فوجی

گیا۔ آخر پچھ ہے نا۔ پولیس سے کہاں تک بھاگتا۔

لیکن سپاہیوں نے آکر اور ہی بات کی۔ ”صاحب! ہم ندی تک گئے، لیکن ندی میں تو بڑا زبردست طوفان آیا ہوا ہے۔ کوئی بھی ندی کو پار نہیں کر سکتا۔ راستے میں ایک گاڑی والے نے یہ ضرور بتایا کہ اس نے ایک گھڑسوار کو ندی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

تھانیدار حیرت سے بولا۔ ”تو کیا اس لڑکے نے ایسے طوفان میں اپنی گھوڑی ندی کے اندر اتار دی ہوگی؟ شاید اسے قانون سے بچنے کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دینا آسان لگا ہوگا۔ نادان کہیں کا۔“

ایسی باتوں سے سبوں کو سوگوار کر کے تھانیدار چلا گیا۔ سامنے والے گھر میں تڑپا دینے والے میں اب تک جاری تھے۔

میں نے وجے کے نانا کا بھی دھیان کیا۔ آدمی رات گزر چکی تھی، مگر بوڑھا حسب عادت جاگ رہا تھا۔ موسلا دھار بارش اور بادلوں کے گرجنے کی آوازوں کے درمیان اچانک بوڑھے نے دروازے پر زور سے دستک ہوتے سنی۔ ہاتھ میں لالٹین لئے وہ دروازے پر آیا، کنڈی کھولی تو سامنے گھوڑی نظر آئی۔ ”ارے مانک۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر گھوڑی کو کسی سوار کے بغیر دیکھ کر اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے گھوڑی کی زین کے ساتھ ڈانگ بھی بندھی ہوئی دیکھی۔ یہ دی ڈانگ تھی جو اس نے مجھے دی تھی۔

بوڑھے نے آگے بڑھ کر گھوڑی کے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مانک! اکیلی کیوں آئی؟ یہ ڈانگ تو وجے کی ہے۔ اسے کہاں چھوڑا؟ چل، مجھے بھی وہاں لے چل۔“ بوڑھا گھوڑی سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے گھوڑی سب کچھ سمجھتی ہے۔ گھوڑی نے دو ایک بار گردن ہلائی، لیکن جب بوڑھا اس پر سوار ہونے لگا تو وہ جلدی سے ہٹ کر گھر میں گھس گئی۔ بوڑھے کے چہرے پر الجھن دکھائی دینے لگی۔ اندر آکر اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر سے زین اتار دی، ڈانگ کو گھر میں چھپایا اور گھوڑی کو محسن میں باندھ دیا۔ اتنے میں باہر سے کسی نے پکارا۔ ”بابا! جاگ رہے ہو کیا؟“ آواز چوکیدار کی تھی۔ وہ کھلے دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

چوکیدار بولا۔ ”گھوڑی کو کسی سوار کے بغیر آتے دیکھ کر میں پیچھے پیچھے چلا آیا۔ خیر تو ہے؟“ مجھے بھی اس بات پر تعجب ہو رہا ہے۔ ”بوڑھے نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ مانک میری بیٹی کے گاؤں سے بھاگ آئی ہے۔“

”لیکن بابا! ندی میں تو سخت طوفان ہے۔ گھوڑی اکیلی تو آ ہی نہیں سکتی۔“ چوکیدار کہنے لگا۔ بوڑھے کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کا نواسا وجے ندی پا کر تے ہوئے ڈوب تو نہیں گیا؟

چوکیدار چلا گیا اور وجے کا نانا پوری رات واقعات کے تانے بانے بننے کی کوشش ہی میں غالباً جاگ

رہا۔

مجھ ہی صبح گاؤں کا پولیس افسر اور نانک پور کے تین چار پولیس والے وجے، یعنی میری تلاش میں بوڑھے نانا کے گھر آئے۔ تب بوڑھے کو تمام واقعے کا علم ہوا۔

پولیس افسر کو بوڑھے نے تنہا گھوڑی کے آنے کی بات بتا دی۔ پولیس کو اس بات پر یقین کرنا پڑا تو کچھ چوکیدار گواہ تھا۔ پولیس افسر نے جاتے ہوئے نانا سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے اب ہمیں آپ کے ڈاسے کی لاش تلاش کرنا پڑے گی۔ طوفان میں بہت سے لوگوں کے بہ جانے کی اطلاع ملی ہے۔“ ندی سے یوں تو کئی لاشیں ملیں مگر ظاہر ہے ان میں میری لاش نہیں تھی۔ پولیس کو اسی لئے میری گرفتاری کے احکام صادر کئے گئے۔

امر تسخیل کے پرنٹنڈنٹ پولیس متا کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ نانک پور کے تھانیدار کا اس نے رانفر کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وجے زندہ ہے تو اپنے گھر والوں سے ملنے ضرور آئے گا۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے وجے اور اس کے نانا کے گھر پر خفیہ پولیس کے آدمی لگا دیے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، متا کی پریشانی بڑھتی گئی۔ وجے کے اس طرح فرار ہو جانے سے پولیس کے نام کو ہانک رہا تھا۔ ایک دن نانک پور سے ایک امید افزاء پیغام آیا کہ پہلی والے پٹیل کے گھر ہونے والی چوری کے سلسلے میں ایک شخص کو چوری کے مال کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجرم کا نام پریم ہے۔ مار پیٹ کی گئی تو اس نے اپنے د ساتھیوں کے نام بھی بتائے ہیں، ایک کا نام ہری اور دوسرے کا نام وجے ہے۔ یہ تینوں اسی چوری میں ٹریک تھے۔ نشاندہی پر ہری کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب آگے مزید اقدام کئے جائیں گے۔ ہری اور وجے کے نام پڑھ کر متا پکرا گیا۔ پھر اس نے کڑیاں جوڑ لیں کہ وجے اسی لئے ہری کو چھڑانے تھانے آیا تھا اور نوٹی گواہی دی تھی۔ پھر وہ فوری طور پر امرتسر سے نانک پور روانہ ہو گیا۔

ہری کی زبان کھلوانے کے لئے کہ وجے کہاں ہے؟ متانے اس پر انتہائی تشدد کیا، مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ہری خود میرے بارے میں بے خبر تھا تو اسے کیا بتاتا۔ کافی سوچ بچار کے باوجود متا اس معے کو حل کر سکا۔

اس روز بھی میں اپنی محبوبہ شکنتلا کے دھیان میں کم تھا کہ میرے دوستوں نے مجھے پکارا۔ ”نارا! آئے تارا سنگھ۔“

میرے فوری دوست جانتے تھے کہ اکثر میں اسی طرح خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔ میرا دوست وہی سنگھ میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔ ”نارا! یار ہم کب سے تجھے آوازیں دے رہے ہیں، آج تو نے پہلی بار بددق چلائی ہے، اس لئے دوستوں کو پارٹی دینا ہوگی۔“

مومن ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ رکھویر اور شکر بھی آ گئے۔ رکھویر بولا۔ ”یار، تو ہم سے بھی کئے نکل گیا۔“

انہیں علم نہیں تھا کہ بددق اور رانفل تو ایک عرصے سے میرے لئے کھلونے کی حیثیت رکھتے

تھے۔

ہی جائے گا اور یوں سوہن سنگھ میری خیریت کے ساتھ ساتھ بات کی تہہ تک پہنچ جائے گا۔ پولیس کی طرف سے بھی میں پوری طرح چوکنا تھا۔ اسی سبب ہری کو خط لکھنے کے بعد میں 'ٹانک پور گاؤں کی طرف سے غافل نہیں رہا۔

یہ وہ دن تھا کہ جب میرے اندازے کے مطابق ہری کو لکھا جانے والا خط ٹانک پور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے تصور کی قوت کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت مجھے پولیس انچارج متا کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ متا کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ سوہن نے ہری کا تصور کرنے سے پہلے متا ہی کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ متا 'ٹانک پور کے راؤنڈ پر آیا ہوا تھا' وہ اس وقت ٹانک پور تھانے کے لان میں تھانیدار کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ پوسٹ مین تھانے کی ڈاک دینے کے لئے آیا۔ ڈاکے کو دیکھ کر تھانے اے مخاطب کیا۔ "سوہن سنگھ کی ڈاک بھی کبھی آتی ہے یا نہیں؟"

"نہیں صاحب! آتی تو آپ کو نہ بتاتا۔" ڈاکیا بولا۔ پھر ذرا رک کر اس نے کہا۔ "لیکن صاحب! آج ایک عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ ہری کے نام خط آیا ہے۔ جس پر فوج کی مہر ہے۔ مجھے تو یاد نہیں کہ ہری کے نام اس سے پہلے کبھی کوئی خط آیا ہو۔"

ڈاکے سے یہ سنتے ہی متا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈاکے سے وہ لفافہ لے لیا جو میں نے ہری کو بھیجا تھا۔ پھر وہ اندر کمرے کی طرف بڑھا۔ جاتے جاتے اس نے ڈاکے سے کہا۔ "ذرا ٹھہرو" میں ابھی آتا ہوں۔"

اندر پہنچ کر متا نے احتیاط سے لفافہ کھولا، اس طرح کہ لفافے کو دوبارہ چپکا کر بند کیا جاسکے۔ میرے خط کے مضمون پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ متا حقیقت تک پہنچ گیا ہے۔ وہ یقیناً سمجھ گیا ہے کہ ہری کو خط میں نے لکھا ہے۔ بہر حال اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں اور لفافے کو دوبارہ چپکا دیا۔

کمرے سے باہر آ کر متا نے ڈاکے کو مخاطب کیا۔ "اس میں کیا ہوگا؟ جاؤ اسے ہری کو دے دو۔" ڈاکیا لفافہ لے کر چلا گیا۔

"فورا کسی کو ہری پر نگاہ رکھنے کے لئے بھیج دو۔" متا نے تھانیدار کو حکم دیا۔ "اگر ہری خط لے کر وجے کے باپ سوہن سنگھ کے پاس جائے تو سمجھ لینا کہ آئندہ کا قاتل بہت جلد گرفتار ہو جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔"

امر تر ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس متا کے اقدامات جاننے کے بعد میں نے اپنے دوست ہری کا دھیان کیا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا ڈاکے سے ہنس کر کہہ رہا تھا "عبدل چاچا! آج اس گھر کے دروازے پر کیسے آگئے؟ میرے گھر پر تو پولیس وارنٹ لے کر آتی ہے" ڈاک تو کبھی نہیں آتی۔"

"ہاں بھائی، مگر میں آج تمہارا خط لے کر آیا ہوں۔" ڈاکے عبدل نے میرا بھیجا ہوا لفافہ ہری کے

چار ماہ اور گزر گئے۔ میں اب حوالدار بن گیا تھا۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ میں بہت جلد بیچر بھی بن جاؤں گا۔ سبھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ وہ میرے نشانے کے بھی معترف تھے۔ ایک مرتبہ کرم ہوشیار سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "تارا سنگھ! اگر تم اسی طرح محنت سے سیکھتے رہے تو پانچ سال میں میرے عہدے تک پہنچ جاؤ گے۔"

مجھے کرم یا جنرل بننے کی تمنا نہیں تھی۔ میرے سامنے تو صرف تین دشمنوں کے چہرے تھے جنہیں میں ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک میرا رقیب، یعنی میری محبوبہ کا شوہر کرم سنگھ تھا اور دوسرے کے بھائی جنہوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ گھنٹیاں اور گویاں کی رہائی میں اب صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ ان کی سزا پوری ہونے والی تھی۔

ہر اتوار کے روز فوج کے جوان اپنے رشتے داروں اور احباب کو خطوط لکھتے۔ جواب آنے پر وہ شوق سے خطوط پڑھتے اور دوستوں کو بھی سناتے۔ ایک میں ہی ایسا تھا جس نے اتنے عرصے میں کبھی کسی کوئی خط نہیں لکھا۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ وجے کے والدین کو اپنی خیریت سے آگاہ کر دوں۔ وہ بہر حال ایک جوان بیٹے کے ماں باپ تھے اور مجھے اپنا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ میری اچانک گمشدگی ظاہر ہے ان کے لئے شدید صدمے کا سبب ہوگی۔ میں انہیں خط اس لئے نہ لکھتا کہ مجھے علم تھا، ان کی گھرائی ہو رہی ہے۔ پولیس کو علم ہو جاتا کہ میں نے انہیں خط لکھا ہے اور یہ بھی کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں۔ بہت سوز و گداز کے بعد میں نے سوہن سے ہری کے نام خط لکھوایا۔ اس سے خط لکھوانے کی وجہ یہ تھی کہ میرا رائٹنگ کسی کی نظر میں نہ آئے۔

جب میں نے سوہن سے خط لکھنے کو کہا تو خودی وضاحت کر دی۔ "سوہن! دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار تو ہے نہیں، بس بچپن کا ایک دوست ہے جو اکثر یاد آتا ہے۔ اسے خط لکھ کر اپنی ترقی کی خبر دینے کی جی چاہتا ہے۔"

سوہن سر ہلا کر کہنے لگا۔ "ضرور، بالکل لکھواؤ۔" میں بولنے لگا اور سوہن لکھنے لگا۔ میں نے ہری کو خط لکھوایا۔ "ہری، میرے دوست! تجھے یہ جلا کر یقیناً حیرت ہوگی کہ میں فوج میں ملازم ہو گیا ہوں۔ تو شاید اب تک مجھے بھول گیا ہو، لیکن مجھے سب کچھ یاد ہے۔ جب بھی میں نانا کے گاؤں سے آتا تھا تو ہم ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم گاؤں کے ویران کنویں، جاتے اور بموت پرست کی باتیں کرتے۔ کچھ یاد آیا؟ ہاں تو میں یہاں حوالدار بن گیا ہوں اور تھوڑے عرصے میں شاید میجر بھی بن جاؤں گا۔ وہاں موجود دوستوں کے بارے میں لکھتا۔ تیرا جواب ملنے پر ہم جھپٹی لے کر تھوڑے دن کے لئے آؤں گا۔ خط کا جواب جلد دینا۔ تیرا یار! تارا سنگھ۔"

خط پوسٹ کر دیا گیا۔ ہری کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ چھ ماہ کی سزا بھگت کر جیل سے رہا ہو چکا تھا۔ اسی دوران اسی کی بوڑھی ماں بھی مر چکی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ہری پڑھا لکھا نہیں اور وہ میرا خط پڑھوانے وجے کے باپ سوہن سنگھ کے پاس

ہاتھ میں دے دیا۔

”چاچا! غلطی تو نہیں ہو رہی؟ اچھی طرح دیکھ تو لیا ہے، کسی اور کا تو خط نہیں ہے؟ مجھے تو نہ خط لکھنا آتا ہے نہ پڑھنا۔ مجھے کون خط لکھے گا؟“

”مگر یہ خط تیرا ہی ہے بیٹے! اس گاؤں میں اور کون ہری ہے۔“ عبدل نے کہا اور چلا گیا۔

ہری نے لفافے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر اسے ادھر ادھر پلٹا۔ اس کے باوجود کہ اسے پڑھنا نہیں آتا تھا، لفافہ کھول لیا۔ عبارت پر نظر ڈال کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ ”یہ خط کس کا ہو سکتا ہے؟ مجھے کون خط لکھے گا؟..... ہاں! ہاں شاید یہ وجہ کا خط ہو، لیکن یہ خط کس سے پڑھاؤں؟“ اس کے بعد وہی ہوا جو میرا قیاس تھا۔ ہری فوراً سوہن سنگھ کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ اس سے بے خبر تھا کہ ایک آدمی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ہری، سوہن سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔ سوہن سنگھ گھر کے صحن میں بیٹھا تھا۔

”چاچا جی! یہ خط تو پڑھ دو۔ معلوم نہیں مجھے یہ خط کس نے لکھ دیا ہے۔“ ہری نے آگے بڑھ کر

خط سوہن سنگھ کے ہاتھ میں دے دیا۔

سوہن سنگھ نے ہری کو اپنے قریب چارپائی پر بٹھالیا اور خط کھولا۔ پھر مجھے وجہ کی ماں مایا کو نظر آئی۔ اس نے ہری کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ آٹھ ہی مہینے میں وجہ کی ماں بدل سی گئی تھی۔ اس کی کمر، شانے، سر اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گزرے ہوئے دنوں کے زخم اور آنے والے دنوں کے ممکنہ اندیشوں کا بوجھ نہ اٹھا سکتی ہو۔ مجھے اس عورت پر بہت ترس آیا۔

پورا خط پڑھ کر سوہن سنگھ بے چین دکھائی دینے لگا۔ اس نے خط ایک بار پھر پڑھا۔ ہری قریب ہی بیٹھا اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ہری بھی اضطراب کا شکار ہو رہا تھا۔ سوہن سنگھ اب تک چپ تھا۔ معاً سوہن سنگھ کی نگاہ اس کھڑکی کی طرف اٹھی جو گھر کے باہر کھلتی تھی۔ اس نے ہری سے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ”اٹھ کر کھڑکی بند کر دے۔“

ہری نے سوہن سنگھ کے کہنے پر عمل کیا اور دوبارہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ہری کو بے چین دیکھ کر سوہن سنگھ نے دھیمی آواز میں اسے خط سنایا۔ پھر وہ ہری کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ہری کے چہرے پر حیرانی تھی۔ شاید وہ کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ پیشانی پر اپنی انگلی رکھ کر بولا۔ ”چاچا جی! مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا کہ بچپن میں میرا کوئی دوست تارا سنگھ بھی تھا۔ یہ کہاں سے میرا دوست نکل آیا..... چلو پھوڑو، جانے کس کا ہو گا یہ خط۔ میں تو سمجھا تھا وجہ نے لکھا ہو گا۔“

”ارے عقل کے دشمن، یہ اسی کا تو خط ہے۔“ سوہن سنگھ مسکرائے لگا۔

سوہن سنگھ کی بات سن کر ہری خوشی سے اچھل پڑا اور زور سے بولا۔ ”کس کا؟..... وجہ کا

خط ہے یہ؟“

تیزی کے ساتھ سوہن سنگھ نے ہری کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”ارے پگے، آہستہ بول، کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔“ پھر وہ خود بھی دھیمی آواز میں بولا۔ ”وجہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے،

خبر تو اچھی ہے، مگر تجھے یہ خط لاتے کسی اور نے تو نہیں دیکھا؟“

ہری نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تو سیدھا بیٹن لایا ہوں۔ آخر مجھے وجہ نے یاد کر ہی لیا۔ چاچا جی! ایک بار پھر پڑھ کر سنا دو۔ پہلی دفعہ تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا کہ کیا لکھا ہے۔“ ہری نے بڑی محنت کے ساتھ میرا خط دوبارہ شانے کی فرمائش کر دی۔

”اچھا ابھی سناتا ہوں، ذرا ٹھہر۔“ سوہن سنگھ نے ہری سے یہ کہہ کر اپنی بیوی مایا کو کو آواز دی۔ ”وجہ کی ماں! ذرا یہاں تو آنا۔“ جب مایا کو آگئی تو سوہن سنگھ نے اسے خط دکھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ خط آیا ہے، ذرا غور سے سننا۔“ وہ خط پڑھنے لگا۔ اس مرتبہ خط پڑھتے پڑھتے اس کی آواز بھرا گئی۔

وجہ کی ماں زار و قطار رو رہی تھی۔ ہری کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ گاؤں کی اس ان پڑھ بڑھیا نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ خط اس کے بیٹے نے لکھا ہے۔ تینوں توڑی دیر تک خاموش رہے۔ پورے آٹھ مہینے بعد بیٹے کی خیریت ملی تھی اس لئے ماں باپ، دونوں ہی کے چروں پر خوشی رقص کر رہی تھی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ایک خطرہ بھی وجہ پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔

”چاچا جی! تمہی میری طرف سے جواب لکھ دو۔“ ہری کی آواز نے سکوت توڑا۔ ”لکھ دو کہ میں بھی فوج میں بھرتی ہونے تیرے پاس آ رہا ہوں۔“

”اتنی بے قراری مت دکھا ہری، ہم لوگوں کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔“ وجہ کے باپ نے کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ میرے گھر پر پولیس کی ہر وقت نگاہ رہتی ہے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ تجھے کسی نے یہاں آتے نہ دیکھ لیا ہو۔“ سوہن سنگھ نے ہری کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

ہری کو میں نے سوہن سنگھ کی بات پر چونکتے دیکھا۔ شاید اسے صورت حال کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر کھڑکی کھول کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ کھڑکی کو آہستہ سے دوبارہ بند کر کے واپس ہوا تو اس کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔

”چاچا جی! تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ ہری قریب آ کر دھیمی آواز میں سوہن سنگھ سے بولا۔ ”اب مجھے یاد آیا ہے کہ جب تمہارے کہنے پر میں نے کھڑکی بند کی تھی تو ایک شخص قریب ہی کھڑا ہوا تھا جس پر میں نے دھیان نہیں دیا۔ اب بھی وہی شخص کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا پیچھا کیا گیا ہے۔ کو تو ابھی جا کر اس کی گردن دبا دوں تاکہ.....“

”تجھے تو بات بے بات لڑائی کی سوجھتی ہے، کبھی دماغ سے بھی کام لے لیا کہ۔“ سوہن سنگھ یہ کہہ کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

وجہ کی ماں مایا کو اب تک خاموش تھی۔ اس نے آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میری ماں تو بیٹے کو وہیں رہنے دو جہاں وہ ہے۔ اس کا منہ دیکھنے کو نہ ملے گا تو نہ سہی، لیکن اب اسے اس کچھڑے میں لانے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم لوگوں نے اسے انتقام کی راہ پر نہ ڈالا ہوتا تو میرا

بادر بیٹا ضرور کوئی بڑا افسری بنتا۔ اب بھگوان نے راستہ دکھایا ہے تو مجھ پر رحم کرو۔ اسے اس راستے سے واپس نہ بلانا۔" یہ کہہ کر وہ روئے گئی۔

سوہن سنگھ اٹھ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔ "خط کو میں نے جلا دیا ہے۔ ہری! تو بھی بھول جا کہ تجھے کبھی کوئی خط ملتا تھا۔"

ہری بے چین سا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "وہے کا پتا تو لکھ لیا ہوتا چاہی۔"

"اس کا پتا تو میرے دل پر نقش ہو گیا ہے ہری۔" سوہن سنگھ نے جذبات سے بھرپور آواز میں جواب دیا۔ "اور ہاں ہری! تجھ سے کوئی کچھ پوچھتے تو بتا دیتا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو چاہی! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے جیل میں کم ظلم سے ہیں لیکن ایک لفظ جو منہ سے نکلا ہو۔"

سوہن سنگھ نے ہری کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہے نے لکھا ہے کہ دوستوں کا حال لکھنا۔ تو شاید اس کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ اس نے گھنٹیاں اور گوپال کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ اب سمجھا کچھ کہ نہیں۔" سوہن سنگھ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

ہری چونک اٹھا۔ "کمال ہے، وہے نے اتنے پراسرار انداز میں خط لکھا ہے۔"

"سنو ہری! تم اگر زیادہ دیر یہاں رہے تو پولیس کو شک ہو جائے گا اس لئے تمہارا جانا ہی مناسب ہے۔ تم جاؤ۔" سوہن سنگھ نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو چاہی! میں چلتا ہوں۔" ہری یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

ہری چلا گیا تو سوہن سنگھ نے اپنی بیوی لیاگور کو مخاطب کیا۔ "میں کل تمہارے باپ کے پاس دھرم مگر جا کر یہ خوش خبری سناؤں گا۔ ہولی کا تہوار سر پر ہے تم بھی ساتھ چلی چلا۔ ہمارے اس وقت وہاں جانے سے کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

شوہر کی بات سن کر وہے کی ماں بولی۔ "میں اس وقت تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی جب تک وہے کا منہ نہیں دیکھ لیتی۔ تم باپ ہو، تمہیں کیا خبر کہ جس ماں کا جوان بیٹا اس سے دور ہو تو ماں کے دل میں روز ہی ہولی جلتی ہے۔"

وہے کے ماں باپ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مجھے متا کی فکر ہوئی کہ وہ اب حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے بعد کیا قدم اٹھاتا ہے۔ میں نے متا کا دھیان کیا اور مجھے اس کے روعلم کا علم ہوا۔ اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ ہری، سوہن سنگھ سے ملا ہے۔ اسی کی روشنی میں اس نے ساری کڑیاں جوڑ لی تھیں۔ متا نے اسی روز انبالہ چھاؤنی کی سکھ رجسٹر کو تار بھیجا کہ متا سنگھ نامی حوالدار پر نظر رکھی جائے۔ ہم ایک قاتل کی تلاش میں ہیں اور بہت جلد ضروری کاغذات لے کر چھاؤنی پہنچ جائیں گے۔ تار پر "ہاپ سیکرٹ" کی مہر تھی۔

خطرہ اب کھل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ میری محفوظ پناہ گاہ اب میرے لئے محفوظ نہیں رہی تھی۔ مجھے اب جلد از جلد وہاں سے فرار ہونا تھا۔

میں نے دانستہ فوج میں ایسے دوست منتخب کئے تھے جو معاشرے سے غیر مطمئن اور آمادہ بغاوت تھے۔ موہن، باپ سے بھٹکا کر کے فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ شکر محبت میں ناکام ہو کر چھاؤنی آیا تھا اور رگھو دیر کے باپ کی زمین، ایک زمیندار نے ہتھیالی تھی۔ ہم چاروں کی دوستی، ہمت اور ذہانت پوری سکھ رجسٹر میں مشہور تھی۔

میں جس مقصد سے فوج میں بھرتی ہوا تھا، مجھے اس میں کامیابی ہوئی تھی۔ میں پولیس کی گرفت سے بچا رہا تھا، لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ ہری کو خط لکھتا میرے لئے اس حد تک خطرناک ثابت ہو گا، یہ بات میرے دہم و دگان میں بھی نہیں تھی۔ ایک نہ ایک دن مجھے فوج سے فرار ہونا ہی تھا، مگر اپنے دل کی بات میں نے دوستوں سے نہیں کہی تھی۔ جب پانی سر تک پہنچ گیا تو مجھے زبان کھولنا ہی پڑی۔

میری تجویز سن کر دوستوں نے پوچھا کہ فوج سے فرار ہو کر ہم کریں گے کیا؟

"پہلے تو مجھے اپنا ایک پرانا حساب چکانا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

رگھو دیر میری اس بات کو مذاق سمجھ کر بولا۔ "تجھے کس کا حساب چکانا ہے؟ حیرے اپنے تو سیلاب کی نذر ہو گئے۔ کیا ان کا انتقام بھگوان سے لے گا؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے رگھو دیر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بھگوان سے میری دشمنی نہیں ہے۔ بھگوان کا تو احسان مند ہوں۔ اگر اس رات سیلاب نہ آتا تو میں آج شاید جیل میں ہوتا۔ آج میں تم دوستوں کو پوری حقیقت بتاتا ہوں۔ دوستو! تم لوگ مجھے تمہارا سنگھ کہتے ہو، لیکن میرا اصل نام وہے ہے اور مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ میرے ماں، باپ، نانا، ماموں سب زندہ ہیں۔ کبھی میرے بڑے بھائی بھی تھے۔ میں اپنے دوستوں کو اعتماد میں لینے کی خاطر درحقیقت وہے کے متعلق بتا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہی اور مظلوم بن کر دوسروں کی ہمدردیاں بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں نے اسی لئے اپنی آواز میں دروشال کر لیا اور قدرے توقف سے کہنے لگا۔ "آج اگر میرے بھائی زندہ ہوتے تو تمہارا گھر ملاہوں کی جھانجوں اور بھتیجیوں کے شور سے گونج رہا ہوتا، لیکن میرے دونوں بڑے بھائی، باپ دادا کے نظام کا قرض وصول کرنے میں کام آ گئے۔ ایک بھائی کو دشمنوں نے چھپ کر پیچھے سے گولی مار دی، دوسرے کو پولیس نے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا اور میں آج تک ان دونوں کے زخموں کو دل سے لگائے زندہ ہوں۔"

میری باتیں سن کر تینوں دوست رنجیدہ ہو گئے۔ پھر شکر بولا۔ "تو اب حساب چکانے میں کس بات کا انتظار ہے تمہارا سنگھ؟"

"تمہارا سنگھ نہیں، وہے سنگھ کو، وہے۔" میں نے شکر کو یاد دہانی کرائی۔

"وہے! دشمن کہتے ہیں؟"

"تین زندہ ہیں، مگر ان میں سے دو ابھی جیل میں ہیں۔ بہر حال اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایک دشمن جو باہر ہے، اسے تو میں ٹھکانے لگا ہی سکتا ہوں۔"

یہ سن کر شکر کہنے لگا۔ "وہے! اب تم اکیلے نہیں جا سکتے۔ ہم چاروں ساتھ ہی رہیں گے، جنہیں

گے تو ساتھ ساتھ اور مرس گے تو ایک ساتھ۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کرنا کیا ہے؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

مجھے اپنے پر خلوص دوستوں سے یہی توقع بھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”دوستو! میں بھی تم سے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کرتا ہوں۔ مرتے دم تک میں اپنا عہد نبھاؤں گا۔ سب سے پہلے میں اپنے دشمنوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم قانون سے بغاوت کریں گے، اس قانون سے بغاوت جو مظلوم کو ظلم سے نہیں بچا سکتا، جو حق دار کو اس کا حق دلانے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ ہم انہیں لوٹیں گے جو غریبوں کو لوٹتے ہیں، مزدوروں اور کسانوں کے خون پسینے کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔“

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد اپنے دوستوں کو میں راہ پر لے آیا۔ میرے اندر ٹھاکر بلونت سنگھ جیسے ایک بار پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اس کے سوا پولیس سے بچنے کی میرے پاس کوئی اور راہ بھی تو نہیں تھی۔ میری سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ میں وجہ کا جسم نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”ہمیں یہ بھی منظور ہے۔“ انہوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

اس کے ہم فرار کی تیاریاں کرتے گئے۔ ہم میں سے ہر ایک نے ایک ایک راکفل اور زیادہ سے زیادہ کارٹوس ساتھ لے لئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم ایک جیپ میں بیٹھے ہوئے ملٹری کیمپ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔

☆=====☆

رات کے اندھیرے میں جیپ تیز رفتاری سے فاصلوں کو سمیٹ رہی تھی۔ موہن ایشترنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ جیپ کی منزل ٹانک پور تھی، وجہ کا آبائی گاؤں ٹانک پور۔ میرے اندازے کے مطابق ایس پی متا کو آج ہی رات انبالہ چھوڑنی پڑے گی جانا چاہئے تھا اور میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے تصور کی پراسرار قوت آزمائی۔ دوسرے ہی لمحے متا مجھے نظر آ گیا۔ وہ کرمل ہوشیار سنگھ کے دفتر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”میں پولیس سپرنٹنڈنٹ متا ہوں۔ میرا ٹیلی گرام آپ کو مل گیا ہوگا۔“

”ٹیلی گرام؟“ کب بھیجا تھا آپ نے؟ میں نے آپ کا کوئی ٹیلی گرام نہیں دیکھا۔ ”کرمل کا لہجہ ساٹ تھا۔

متا کا چہرہ اتر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کرمل سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں کرمل صاحب! آپ کو میرا کوئی تار نہیں ملا؟ آج آج ہی صبح تو میں نے آپ کو تار بھیجا تھا۔ حیرت ہے کہ آپ کو“

”میں چھٹی پر تھا۔“ کرمل بول اٹھا۔ ”ہولی ہے نا۔ اس وقت ہم کچھ دوست فلم کے آخری شو سے واپس آئے ہیں۔ بہر حال میں ابھی ڈاک دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کرمل ڈاک کی ٹرے دیکھنے لگا۔ پھر اسے تار مل گیا۔ وہ متا کی طرف مڑا۔ ”آپ نے کیا کوئی ضروری پیغام بھیجا تھا؟“ بات کرتے ہوئے اس نے

لفافہ کھولا اور تار کا مضمون پڑھنے لگا۔ پھر طویل سانس لے کر کہا۔ ”تو آپ کو ہمارے حوالدار تارا سنگھ پر شبہ ہے؟“ یہ بات کرمل نے کچھ اس انداز میں کہی جیسے اسے متا سے اتفاق نہ ہو۔

”کرمل صاحب!“ متا بولا۔ ”ہم کئی مہینے سے اس مجرم کی تلاش میں ہیں۔ ایک خط اس کے دوست کے نام سنگھ رجنت سے پہنچا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ یہاں ہے۔ اس کا اصل نام بھی تارا سنگھ نہیں ہے۔“

کرمل ہوشیار سنگھ نے متا کی باتیں سنیں اور ذرا سا سوچ کر اس کی بے قراری کی پروا کئے بغیر کہنے لگا۔ ”مسٹر متا! آپ کے پاس اس کا کوئی فوٹو ہو تو دکھائیے۔ میں شناخت کر کے بتا دوں گا کہ آپ کا شبہ درست ہے یا نہیں؟“

”سر! اس کا فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے، لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ مجھے اس کے سامنے لے جائیں، پھر دیکھ لیجئے گا کہ قاتل کا چہرہ خود بولنے لگے گا۔“

”ٹھیک ہے، آپ اصرار کرتے ہیں تو آئیے، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ تارا سنگھ قاتل ہو سکتا ہے۔“ کرمل یہ کہتا ہوا کرسی سے اٹھا۔

پھر ہم چاروں دوستوں کے فرار کا راز کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

”آئی ایم سوری مسٹر متا۔“ کرمل ہوشیار سنگھ بولا۔ ”اب وہ آپ کا ہی نہیں فوج کا بھی مجرم ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع“

اسی وقت شکر نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا سو گئے وجے؟“

شکر کی آواز کے ساتھ ہی میرے دھیان کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جاگ رہا ہوں۔“

”آنکھیں بند دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید تمہاری آنکھ لگ گئی ہے۔“ شکر نے کہا۔

رات کے دوسرے پہر جیپ، ٹانک پور کی حدود میں داخل ہوئی اور میں چوکنہا ہو گیا۔ ہولی کی اجلی رات تھی۔ دن بھر تک کھیل کھیل کر تھکنے کے بعد گاؤں والے نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے تھے۔ اپنے دشمن اور رقیب کو تارا سنگھ کو ٹھکانے لگانے سے قبل میں، وجے کی ماں مایاکور سے ملا۔ سوہن سنگھ، دھرم نگر گیا ہوا تھا۔ مایاکور گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے مجھے اپنا بیٹا وجے سمجھ کر گلے سے لگا لیا۔

”اگر تو بھگوان کو مانتا ہے بیٹا تو میری ایک بات مان لے۔“ مایاکور مجھ سے بولی۔ ”اب برائی کے راستے پر مت جا، تو اس فوجی لباس میں کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ تجھے کیا خبر کہ ہر ماں چاہتی ہے، اس کا بیٹا اچھے آدمی کی حیثیت سے نام پیدا کرے۔ پرانے راستوں کو بھول جا۔“

”اب دیر ہو چکی ہے ماں۔ تجھے پتا ہے کہ اگر میں پولیس کے ہاتھ آ گیا تو مجھے چھانسی دے دی جائے گی۔ پھر یہ کہ اب میں اکیلا بھی نہیں۔ میرے یہ تینوں دوست بھی فوج چھوڑ کر میرے ساتھ آئے ہیں۔ میں تو تمہیں دیکھنے اور اپنی صورت دکھانے آیا ہوں دوبارہ کب ملاقات ہوگی، کسے خبر۔“

میری بات سن کر شاید مایاکور کو بھی خیال آ گیا کہ میں اکیلا نہیں۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے

بلند کر کے اشارہ کیا اور لبلیباں دبا دی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے گولیاں دشمنوں کے سینوں میں اتر گئیں۔ ان کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

ہم چاروں دوست فوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر لوگ جاگ نکلے تھے۔ کمرٹیاں اور دروازے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

راستے میں گاؤں سے نکلے ہوئے ہم ہری کے گھر کے پاس رکے، لیکن وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اسی وقت کسی نے دور سے پوچھا۔ ”ارے بھی یہ گولیاں چلنے کی آواز کیسی تھی؟“

”بھئی ہم لوگ شکار کے لئے نکلے ہیں۔“ موہن نے جواب دیا اور جیب آگے بڑھادی۔ پھر غالباً یہی بات گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ مطمئن ہو کر سو گئے۔ جب میں پہلی بار تانک پور سے اتر رہا تھا تو ندی میں زبردست طوفان تھا، لیکن آج اس میں پھرتے۔ ندی کو پار کر کے جیب جب لے نکلی تو ایک شخص یکایک سامنے آ کر مرتے مرتے بچا۔ وہ جیب سے ٹکرا کر دس پندرہ فٹ دور جاگرا۔ ہانے وہیں سے گالی دے کر کہا۔ ”تمہاری..... اندھے ہو کیا؟“

گالی سننے ہی میں چونک اٹھا۔ وہ آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ پھر بھی فوری طور پر مجھے کچھ یاد آسکا۔ میں نے جیب رکوالی اور اتر اس کے شخص کے قریب پہنچا جواب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے بے پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ارے ہری، تُو!“

”ہاں میں!“ ہری نے مجھے یہ کہہ کر سینے سے لگا لیا۔ میں نے اسے زور سے بھیجا تو کہنے لگا۔ ”اب میرے جسم میں فوج کا زور بھی آگیا ہے۔“

”نہیں ہری! یہ کسی فوج کا زور نہیں، ایک ڈاکو کا زور ہے۔“ میں نے کہا۔

”ڈاکو؟“ ہری حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ ابھی ابھی دشمنوں کا مصفایا کر کے آ رہا ہوں۔ چلو بیٹھ جاؤ جیب میں ابھی ہمیں اور بہت سی بات کرنی ہیں۔“ جب ہری جیب میں بیٹھ گیا تو میں نے موہن سے کہا۔ ”تُو نے اسے ٹکرا کر اچھا کیا۔ مجھے تلاش کر رہے تھے، وہ ہری یہی ہے۔“ پھر میں نے ہری کو بتایا۔ ”میں نے تجھے جو خط لکھا تھا، اس میں اس کی مٹا کو میرا پتہ لکھا تھا اس لئے ہمیں فوج سے فرار ہونا پڑا۔ ہاں یہ بتا ہری کہ اس وقت تُو کہاں آ رہا ہے؟“

”میں دھرم نگر گیا تھا، تیرے باپ کو خبردار کرنے کے لئے۔“ ہری نے جواب دیا۔

”کس بات سے خبردار کرنے؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”گھنشیام اور گوپال نے ان کا پتا کانٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ شام کو بنواری نے نشے میں میرے سامنے دروازہ اگل دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ آج ہی رات باپ کو قتل نہ کر دیں۔ چنانچہ میں فوراً دھرم نگر روانہ ہوا۔“ ہری نے تفصیل سے بتایا۔

میں نے اس کی پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ”قدرت مجھ پر کتنی مہربان ہے کہ اس نے مجھے تجھ جیسے دوست دیے ہیں۔“ پھر میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کا ہری سے تعارف کرایا۔ ”یہ میری ٹولی کے ساتھی ہیں۔“

اور پھر باورچی خانے سے گاجر کا طوطہ لے آئی۔ پھر اس نے ہمارے لئے لسی بنائی اور گلاسوں میں لے آئی۔ اب خاصا وقت ہو گیا تھا اس لئے میں نے باتوں باتوں میں گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔

”وہ بے چاری ہمیشہ تیری خیریت پوچھتی رہتی ہے۔ ہولی منانے وہ اپنے بیکے بیکے گئی ہے۔ اس کامیابی بھی ساتھ گیا ہے۔“

مایاکور کی بات سن کر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ پھر بھی میں سنبھل کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اس وقت برابر کے گھر میں کوئی نہیں؟“

میرے سوال پر مایاکور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی بات مجھ سے چھپا رہی ہو۔ پھر بڑی مشکل سے اس نے زبان کھولی۔ معلوم ہوا کہ نیک چلنی کے سبب تنوار سے پہلے ایک ماہ قبل گھنشیام اور گوپال کو جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اپنے گھر میں موجود تھے۔ اس دوران کرناٹک کے رشتے کی ایک بیوہ چچی اپنے بیٹے بنواری کے ساتھ وہاں آ کر رہنے لگی تھی۔ چچی اور اس کا جوان بیٹا بنواری بھی گھر میں تھے۔

مایاکور یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس لئے جھجک رہی تھی کہ کہیں میں، ان دونوں بھائیوں کو قتل نہ کر دوں۔ میں نے اسی لئے اسے جھوٹی تسلی دی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر مجھے اطمینان کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میرے اندازے کے مطابق دونوں بھائیوں اور بنواری کو گھر کی چھت ہی پر سونا چاہئے تھا۔

”میری چند چیزیں اوپر کمرے میں ہیں، وہ لے لوں ماں۔“ یہ بمانہ بنا کر میں اوپری منزل پر آ گیا۔ میں نے سامنے والے مکان کی چھت پر تین آدمیوں کو سوتے دیکھا۔ نیچے تین دوست اور چھت پر تین دشمن۔ میں نے فیصلہ کیا اور نیچے آ گیا۔

نیچے آ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے تینوں دوست بے چین ہیں۔ انہیں شاید یہ خدشہ تھا کہ باہر کھڑی ہوئی فوجی جیب کو کوئی دیکھ نہ لے۔ صبح سے پہلے ہمیں کافی دور نکل جانا تھا۔ وہ تینوں بیٹھک میں تھے۔ انہیں میں نے صورت حال سے آگاہ کر دیا اور آخر میں کہا۔ ”تم تینوں سامنے والے مکان کے پچھواڑے چھپ جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“

تینوں دوست چلے گئے تو میں اندر والے کمرے میں پہنچا کہ مایاکور سے آخری بار مل لوں۔ اس نے مجھے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ میں گھر سے باہر آیا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔

میرے پہنچنے ہی گفتگو کے گھر کے پچھلے حصے سے میں اور تینوں دوست چھت پر چڑھ گئے۔

گھنشیام، گوپال اور بنواری کمری نیند میں تھے۔ تینوں دشمنوں کو ابدی نیند سلا کر جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے تینوں دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ ان تینوں کو دشمنوں پر ایک ساتھ فائر کرنا ہے۔ ہر چند کہ وہ میرے دوست تھے، مگر میرے نزدیک یہ ضروری تھا کہ قانون سے بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے سر ایک ایک قتل کا الزام ضرور ہو تاکہ کوئی دغا نہ کر سکے۔ میں نے اسی لئے اس وقت غیروں کے ہاتھوں بھی اپنے دشمنوں کی موت منظور کر لی تھی۔

شکر، موہن اور رگھو دیر نے اپنی اپنی رائفلوں کی ٹائیس دشمنوں کے سینوں پر رکھ دیں۔ میں نے

ہری میری بات سنتے ہی بگڑ گیا اور بولا۔ ”اس کا مطلب ہے تو مجھے اپنی ٹولی سے الگ رکھنا ہے؟ لیکن سن لے کہ اب میں اس جیب سے نہیں اتروں گا۔ تیری ٹولی میں شامل ہونے کی جو فیس ہاں دے۔“

”بس ایک قتل۔“ میری بجائے شکر نے جواب دیا۔

”بس..... وہ تو اگر تم لوگ نہ ملتے تو بھی ایک قتل کرنے والا تھا۔“ ہری یہ کہہ کر زور ہٹا۔

”کس کا قتل؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”پریم کا۔“ ہری نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے ڈر کر فرار ہو گیا تھا، مگر کئی دن کی تلاش کے بعد میں نے اس کا پتا لگا ہی لیا۔ جو بیس گھنٹے کے اندر اندر میں تمہاری فیس ادا کر دوں گا۔“

ہری سے باتیں ہوتی رہیں اور دھرم مگر آگیا۔ میں نے ہری کے کہنے پر جیب کو وجہ کے بتا کر گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک چڑ کے نیچے رکوایا۔ نانا کے گھر تک ہری نے خود ہی موہن کی رہنمائی تھی ورنہ میں تو پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا۔

”میں ابھی نانا اور باپو سے مل کر آتا ہوں۔“ میں نے جیب سے اترتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم لوگ چونکا رہنا۔“

میرے ساتھ ہی ہری بھی جیب سے اتر گیا اور بولا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں وجہ۔“

”چلو!“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھا۔

ہری نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں ہری۔“ ہری نے جواب دیا۔

نانا نے دروازہ کھولا۔ ہری کے ساتھ مجھے فوجی لباس میں دیکھ کر بوڑھے کی نظرس بھی دھوکا آ گئیں۔ اس نے فوراً پیٹھ پھیر لی اور قدرے ناگواری سے کہنے لگا۔ ”پولیس کے آدمی کو لے کر آدم رات کے وقت کیسے آنا ہوا ہری؟“ رات ہونے کے سبب وہ بوڑھا پولیس اور فوج کی وردی میں تیز تیز کر سکا تھا۔

میں نے ہری کو آنکھ سے اشارہ کیا، مقصد محض شرارت تھا۔ ہری نے میرا اشارہ پا کر کہا۔ ”نانا کی پولیس کا آدمی نہیں، فوج کا افسر ہے۔ وجہ فوج سے فرار ہو گیا ہے۔ یہ اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ نانا کو پور میں بھی اس نے وجہ کو ڈھونڈا، مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا۔“

میری نظر دروازے کے قریب ہی کھڑے ہوئے سوہن سنگھ پر پڑی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ ”ان کو تلاشی لینے دو۔ وجہ یہاں نہیں آیا۔“

”وجہ یہاں آیا ہے۔“ ہری زور دے کر کہنے لگا۔ ”میں نے اسے اپنی آنکھوں سے یہاں آتا دیکھا ہے۔“

بوڑھے نانا کے چہرے سے شدید غصہ جھلکنے لگا اور وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ ”کینے، دہری چال چل ہاں

ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ زیادہ مذاق اب منگنا پڑ جائے گا۔ فوراً ہی میں، نانا اور ہری کے درمیان آگیا اور بولا۔ ”نانا! خفا ہونے کی کیا بات ہے، وجہ واقعی یہاں آیا ہے۔ یہ دیکھو، وجہ تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہے۔“

”کیا؟“ نانا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ وہ یقیناً مجھے میری آواز سے پہچان گیا تھا۔

میں اور ہری، نانا کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئے۔ ہری نے دروازہ بند کر دیا۔ سوہن سنگھ بھی لپک کر قریب آگیا۔

”نانا! میں تین دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آیا ہوں۔“ میں نے فخریہ لہجے میں نانا کو بتایا۔

نانا نے مزید گرجوٹی کے اظہار کی خاطر مجھے سینے سے لگا کر دبایا اور پھر میری پیشانی چوم کر کہا۔ ”شباباش بیٹے، شاباش۔ تو نے سارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔“

”نہیں نانا! بڑا ابھی باقی رہ گیا ہے۔ تین میں تیسرا تو اس کے چچا کا بیٹا بنواری تھا۔ بڑا گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے۔“ میں بولا۔

نانا کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ بے مزہ ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”اس حرام زادے کو بھی آج ہی باہر جانا تھا۔ ارے اس شادی شدہ کو تو پہلے مارنا چاہئے ورنہ کہیں اس کے گھر بیٹا پیدا ہو گیا تو ہمیں اس کے جوان ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس طرح انتقام کا حساب باقی رہ جائے گا۔“

بوڑھے کا خدشہ غلط تھا، مگر میں اس کا نواسہ ہونے کے ناطے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسی وقت سوہن سنگھ نے مجھے مخاطب کیا اور میں اس آزمائش سے بچ گیا کہ بوڑھے کی بات کے جواب میں کچھ کہتا۔ سوہن سنگھ نے مجھ سے کہا۔ ”اپنی ماں سے مل آئے بیٹا؟“

”ہاں باپو۔“ یہ کہہ کر میں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ ”اس وقت تو میں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ فوج سے فرار ہونے والے تین ساتھی اور ہیں۔ ہری بھی ہمارے گردہ میں شامل ہو گیا ہے۔ آج سے ہم قانون کے باغی بن رہے ہیں۔“

میں نے بوڑھے نانا کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھے دعا دی۔ ”جانبے! بھگوان تجھے ہمیشہ فتح مند کرے، لیکن میری ایک بات اور یاد رکھنا، غریب آدمی کو کبھی تنگ نہ کرنا اور امیر پر رحم نہ کرنا۔“ ہری اور میں مڑ کر دروازے تک پہنچے تو بوڑھے کی آواز پھر سنائی دی۔ ”ٹھہرنا! گھوڑی اور ڈانگ بھی لیتے جانا۔“ کچھ ہی دیر بعد گھوڑی کی لگام میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔ ”آج سے مانگ تیری ہے۔ اس کی وفاداری پر بھروسہ کرنا۔“

جب یہ باتیں ہوئیں، رات کے دو بج رہے تھے۔ بوڑھے نانا اور سوہن سنگھ سے رخصت ہو کر ہم باپچوں دوست کہیں کے کہیں نکل گئے۔

جیب ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے گھوڑی بھی اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ مجھے کافی

ہوشیار رہو۔ میں دوسرے تک پہنچ رہا ہوں۔ اس وقت صبح ہی صبح پولیس کا وہی دستہ ٹانک پور پہنچا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ متا کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں انبالہ جھاڑی میں ہوں تو اس نے کامیابی کے نشے میں سوہن سنگھ اور دھرم گمر میں وجے کے نانا کے گھروں سے گمرانی ختم کرا دی۔ مجھے اسی لئے وجے کے گھر جا کر کامیابی سے واپسی کا موقع بھی مل گیا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ختم کر دیا۔

ٹانک پور کے تھانیدار کو امر ترسے آنے والے پولیس کے دستے نے جگایا اور ایس پی متا کا پیغام دیا۔ وہ فوراً ہی تیار ہو کر تھانے سے نکلا۔ اس کے ساتھ پولیس والے بھی تھے۔

تھانیدار سیدھا وجے کے گھر پہنچا۔ وہاں خاموشی طاری تھی۔ دستک دینے پر بھی جب خاصی دیر دروازہ نہیں کھلا تو تھانیدار کے حکم پر ایک سپاہی اندر کود گیا اور کھڑی کھول دی۔ دروازے کے قریب ہی مایاکور بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی پیشانی کے ایک حصے پر خون جما ہوا تھا۔ زمین پر بھی خون کا دھبہ پڑا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ تھانیدار اسے ہوش میں لانے کے لئے اندر پانی لینے گیا تو ایک کونے میں اس نے چار گلاس رکھے دیکھے۔ گلاسوں کے کناروں پر لمبی کے جھاگ اب تک نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ جلدی سے پانی لے کر باہر آ گیا۔

مایاکور کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو اسے کچھ کچھ ہوش آیا۔ وہ کچھ بڑبڑائی، آنکھیں ذرا کھلیں، لیکن فوراً ہی پھر بند ہو گئیں۔ اسی حالت میں مایاکور نے برابر بیٹھے ہوئے تھانیدار کا ہاتھ تھاما اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وجے! میں تجھے نہیں جانے دوں گی بیٹے۔“

مایاکور کے یہ الفاظ سن کر تھانیدار کے لئے یہ سمجھ لینا بہر حال مشکل نہیں تھا کہ رات کو وجے وہاں ضرور آیا ہوگا۔ اسی کے جانے کے غم سے بڑھیا پر بے ہوشی طاری ہوئی ہوگی۔ تھانیدار کے ساتھ امر ترسے آنے والا ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ تھانیدار اس سے مخاطب ہوا۔ ”وجے آکر چلا گیا انسپکٹر۔“

”وہ اپنا دار کر گیا اور تم لوگ سو تے رہ گئے۔“ انسپکٹر نے خفا ہو کر کہا۔ تھانیدار شرمندہ نظر آنے لگا۔ انسپکٹر غصے سے مزید بولا۔ ”اب کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، سامنے والے گھر میں معلوم کرو کہ اندر کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں؟“

انسپکٹر کا حکم سن کر تھانیدار نے کرتار سنگھ کے دروازے پر دستک دی۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں ملا تو تھانیدار مردہ سی آواز میں پکارا۔ ”کرتار سنگھ گھر پر ہے؟ دروازہ کھولو۔“ پھر وہ بار بار دروازے پر دستک دینے لگا۔

کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا کا چہرہ نظر آیا جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کرتار سنگھ کی چچی ہے۔

”گھر میں کوئی مرد ہو تو اسے فوراً جگاؤ۔“ تھانیدار نے بارعب آواز میں کہا۔

”کرتار تو اپنی بیوی کے ساتھ سسرال گیا ہے، گھنٹیاں، گوپال اور میرا بیٹا چھت پر سو رہے ہیں۔“ چچی نے بتایا۔

عرسے کے بعد ٹانک پر سواری کا موقع ملا تھا اس لئے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ سارے کام آسانی سے انجام پاتے جا رہے تھے۔ ہری تو مل گیا تھا مگر مجھے اس کا افسوس ضرور تھا کہ ٹکلتلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ اپنے رقیب کرتار سنگھ کے زندہ بچ جانے پر بھی میں اداس تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ٹکلتلا سے ملاقات نہ ہونا ایک طرح سے میرے حق میں بہتری ہوا تھا کیوں کہ میں ٹکلتلا کے سامنے شاید کسی کو قتل نہ کر سکتا۔ جس عورت نے میری خاطر بے شمار ظلم سے، جس نے اپنا وجود مجھے سوہن دیا، کیا میں اس کے سہاگ کو اجاڑ سکتا تھا۔ اور کیا میرے ساتھی کرتار سنگھ کو زندہ چھوڑ جانے پر رضامند ہوتے۔ اپنے ساتھیوں کو اب تک میں نے ٹکلتلا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر وجے کا نانا بھی کرتار سنگھ کو زندہ چھوڑنے پر ناراض ہوتا۔ یہی ساری باتیں اس وقت میرے ذہن میں چکر ا رہی تھیں۔ اسی وقت ہری نے مخاطب کیا اور پریم کے بارے میں بتانے لگا۔

ہولی پر پریم کی خالہ، ٹانک پور آئی تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کو خالہ نے سنت گڑھ میں پریم کے لئے پسند کیا تھا۔ اب وہ بہن اور بہنوئی کو دکھانے کے لئے لڑکی کو ساتھ لائی تھی۔ ہری کو بھی اس کا پتا چل گیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہری جس کی تلاش میں ہے، وہ سنت گڑھ میں اپنے خالو کا ہوٹل چلا کر مزے کر رہا ہے۔ ہری نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مفتی ہونے سے پہلے پریم کو ختم کر دے گا۔ ایسے میں اس کی ملاقات مجھ سے ہو گئی۔

جیب تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ ہری نے موہن سے پوچھا۔ ”سنت گڑھ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟“

”سنت گڑھ تو دوسری طرف ہے۔ کیوں وہاں کیا کام ہے؟“

”میرا شکار پریم وہیں ہے۔ اگر یہ کام کر لیا تو سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔“ ہری نے جواب دیا۔

”یار! اب ذرا آرام کی بات کر۔“ شکر نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”جیب میں بیٹھے بیٹھے اب تو جم بھی دیکھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر سوئیں گے، تھوڑا نشہ پانی کریں گے، ایک آدھ مرغی کھائیں گے، پھر دوسرے کام کی بات ہوگی۔“

پھر ہم سب ایک گاؤں میں پہنچ گئے جہاں رات کا بقیہ حصہ گردوارے سے ملحق ایک سرائے میں گزرا۔

صبح ہی صبح اپنے ساتھیوں سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ٹانک پور کا خیال آیا جہاں گزشتہ رات تین افراد کا قتل ہوا تھا۔ میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں پولیس کا کیا رد عمل ہے۔ ٹانک پور سے دور رہنے کے باوجود میں اپنے دھیان کی پراسرار قوت کے ذریعے سب کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ پولیس کہیں وجے کی ماں مایاکور کو پریشان نہ کرے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ٹانک پور تھانے کا تصور کیا۔ پھر مجھے جو معلوم کرنا تھا، پتا چل گیا۔

ایس پی متا نے انبالہ جھاڑی سے امر ترس پولیس کو اطلاع دی کہ مجرم، فوج سے بھی فرار ہو گیا ہے۔ مسلح پولیس کے ایک دستے کو فوراً ٹانک پور روانہ کیا جائے۔ مجرم رانٹلیں اور جیب لے کر بھاگے ہیں۔

”ارے ماں، جو بھی ہو اسے جلدی حاضر کرو۔“

بڑھیا گھبرا کر پوچھنے لگی۔ ”ان سے کوئی قصور ہو گیا ہے کیا؟“

اس وقت تک انسپکٹر بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑھیا کو یوں گھورا کہ وہ جواب سننے کے لئے نہ رک سکی اور جلدی سے چھت کی میڑھیاں چڑھنے لگی۔ انسپکٹر اور تھانیدار نیچے کھڑے تھے۔ ذرا ہی دیر میں ایک دل دوزخ سنائی دی۔ بڑھ رو رو کر بین کئے جا رہی تھی۔ ”ارے میں لٹ گئی۔ کسی نے میرے بیٹے اور دونوں بھتیجیوں کو مار ڈالا۔“

بڑھیا کے بین سن کر انسپکٹر اور تھانیدار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر لپک کر میڑھیاں چڑھ گئے۔ چھت پر تین لاشیں پڑی تھیں۔ گھنشیام اور گوپال رات کو ہوئی کے رنگ برنگ کپڑے پہن کر ہی سو گئے تھے، مگر اس وقت ان سارے رنگوں میں خون کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ زمین پر بھی خون جم گیا تھا۔ گھنشیام کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ گوپال کا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ منظر ہلا دینے والا تھا۔ بڑھیا اپنے بیٹے بنواری کی لاش سے ایسے لپٹ گئی تھی جیسے اس طرح بنواری ابدی نیند سے جاگ جائے گا۔

ذرا سی دیر میں گاؤں بھر کے لوگ جمع ہو گئے۔ سبھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس کس کو قتل کیا گیا ہے۔ سب کو پتا تھا کہ اگر وجہ زندہ ہے تو وہ واپس آئے گا اور قیامت بپا کر دے گا۔ لوگ یہی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وجہ کہاں سے آیا؟ اس کے ساتھ اور کون تھا؟ اس بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ وجہ کو پتا چل گیا کہ کتنا سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ سسرال گیا ہے تو وہ اس کا بھی وہیں کام تمام کر دے گا۔

ایک شخص نے سپاہیوں کو دیکھ کر طنز کیا۔ ”یہ لوگ تو ہمیشہ کام پورا ہو جانے کے بعد ہی تماشا دیکھنے آتے ہیں۔“

پانچ آدمیوں کو بلا کر تھانیدار نے مشیر نامہ تیار کیا۔ چچی کو چار پانچ عورتوں نے پکڑ کر ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ وہ اب اچھی بین کر کے سر پیٹ رہی تھی۔

انسپکٹر نے دو پولیس والوں کو امر تر روانہ کر دیا تاکہ ایس پی متا کو تفصیلی رپورٹ دی جاسکے اور وہ ٹانک پور آ جائے۔ چار چھ پولیس والوں کو قاتلوں کا پیچھا کرنے اور سراغ لگانے کے لئے بھیجا گیا۔ دو پولیس والوں کو دھرم گھر روانہ کیا گیا تاکہ وجہ کے تانا سے کوئی اطلاع مل سکے تو لے آئیں۔

تینوں لاشوں کو نیچے لاکر محن میں رکھا گیا۔ اب مزید کارروائی کے لئے ان لاشوں کا ہسپتال لے جانا باقی تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کتنا سنگھ، گھنٹلا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ لوگ کیوں جمع ہیں؟“ کتنا سنگھ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ذرا دل کو مضبوط رکھنا کتنا سنگھ۔ بڑا افسوس ناک واقعہ ہو گیا ہے۔“ کسی نے جواب دیا۔

کتنا سنگھ بوکھلایا ہوا سا اپنے گھر میں داخل ہوا۔ دلہیز پر قدم رکھتے ہی وہ ٹھک کر رک گیا۔ اس

کی نظرس محن میں تین لاشوں پر جمی ہوئی تھیں جنہیں سفید چادروں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گھنٹلا کے ہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر گاؤں والوں نے لاشوں کے چروں سے ادریں ہٹا دیں۔ کتنا سنگھ مردہ بھائیوں کی صورتیں دیکھ کر دوڑا اور چارپائیوں کے پاس بیٹھ کر ان کے روتے ہوئے ہاتھ پھیرتے ہوئے دہائیں مار مار کر رونے لگا۔

گھنٹلا اندر جا کر چچی سے لپٹ کر رونے لگی۔ پہلے تو چچی نے اسے سینے سے لگا کر بین کئے، پھر دھکا دے کر دور ہٹا دیا اور بولی۔ ”ڈھونگ رہنے دے۔ تجھے پتا ہو گیا تھا کہ وجہ نہ کام کرنے کے لئے آئے۔ جانے سے پہلے تو اس کی ماں سے ملنے گئی۔ تو اسی لئے اپنے میاں کو بچانے کے لئے اسے میکے لے گئی۔ بچ۔ حرافہ۔ کیتا۔“

گھنٹلا حیران حیران سی نظروں سے چچی کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ دنیا یہ گالیاں اور الزام اس کے لئے ناقابل برداشت ہوں گے۔ وہ دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کتنا سنگھ بھی اس کے پیچھے لپکا اور اسے روٹی کی طرح دھنکے لگا۔

اپنی محبوبہ کو رقیب کے ہاتھوں پٹنے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں آپ ہی آپ اسے برا بھلا کہنے لگا۔

”ارے وجہ، تو یہ کسے گالیاں بک رہا ہے خواب میں میرے بار۔“ میری سماعت سے ہری کی آواز لڑائی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی کے ساتھ میرے دھیان کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا جس نے میرا خون کھولا دیا تھا۔

ہری کے علاوہ میرے تینوں فوجی دوست بھی جاگ چکے تھے۔ آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے وہ مجھے بدن میں سمجھتے تھے اور جگایا نہیں تھا۔ پھر جب میں غصے میں بڑبڑانے لگا تو ہری نے مجھے مخاطب کر ہی لیا۔

”ج ہو چکی تھی اور میرے دوست کو پیٹ پوجا کی فکر تھی۔“

فکر نے مرغی کی فرمائش کی۔ رگھو دیر نے کہا۔ ”میں اس گاؤں میں پہلے بھی آچکا ہوں یہاں ایک دیوی کا مندر بھی ہے۔ عقیدت مند اس کی منت مانتے ہیں اور منت پوری ہونے پر بکرے کی جینٹ لٹاتے ہیں۔ وجہ کی بھی آج منت پوری ہوئی ہے۔ اس نے اپنے دشمنوں کو گھنٹلا کر دیا ہے۔ کیا خیال ہے؟“ آن دیوی کے پرشاد سے پیٹ نہ بھرا جائے؟“ یہ کہہ کر رگھو دیر ہم سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ تجویز سبھی کو پسند آئی۔ طے یہ ہوا کہ ہری، مندر میں جائے۔ فوج سے فرار ہوتے وقت جو ٹانھ ستر روپے سب لے کر چلے تھے، وہ موجود تھے۔ آنے والے دن کس طرح گزریں گے؟ اس کی فکر کہیں سے کسی کو نہیں تھی۔ اس زمانے میں خاصا موٹا تازہ بکرا بچتیس تیس روپے میں آ جاتا تھا۔ ہری کو دلپے دے دیئے گئے۔

ہری گھوڑی پر روانہ ہو گیا۔ ہم چاروں ساتھیوں نے آئندہ کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ”سب سے پہلے تو ہمیں اس فوجی جیپ سے جان چھڑانی چاہئے۔ جیپ کی جگہ اب ہمیں چار

”بھئی میں تو اپنے باپ سے لڑ کر آیا ہوں۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔“ موہن نے اس طرح کہا جیسے اسے سخت افسوس ہو کہ اس کی کسی سے عداوت نہیں۔

”یار! یہاں تو تمہیں ہی جھکنا ہوگا۔“ میں نے گویا فیصلہ منادیا۔

اتنے میں ہری مندر سے لوٹ آیا اور ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بکری کا سر تو دیوی کے قدموں میں ڈال آیا تھا، مگر باقی کچرا ساتھ لے کر آیا تھا۔

رگھویر نے فوراً بکری کو پکانے کا بندوبست کیا۔ ضروری سامان ہری ساتھ ہی لایا تھا۔ واپسی میں اس نے شراب کی کچھ بوتلیں بھی خرید لی تھیں تاکہ دوبارہ نہ جانا پڑے۔ اب ہری کو میں نے دوسرا کام بتایا۔ ”ہمیں اس جپ کو چھٹی دینی ہے، لیکن نہ ہم اسے کہیں راستے میں چھوڑیں گے، نہ ہی کسی کو مفت دیں گے۔ سنت گڑھ جانے کے لئے دوسری گاڑی درکار ہے۔ اب کوئی ترکیب سوچو۔ دیے مجھے معلوم ہے تمہارا دماغ زیادہ کام نہیں کرتا۔“

یہ سن کر ہری نے اپنی پیشانی پر ایک مکا مارا اور بولا۔ ”مجھے تمہارے اس طعنے سے بچنے کے لئے کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ ذرا کھلی ہوا میں جا کر چکر لگاتا ہوں، شاید کوئی ترکیب آجائے دماغ میں۔“ یہ کہہ کر ہری ہنستا ہوا چلا گیا۔

ہری جب واپس آیا تو میں اور میرے تینوں فوجی ساتھی نما دھو کر تیار ہو چکے تھے۔ فوجی لباس بھی ہمارے لئے خطرے کی علامت ہی تھا، مگر ہم نے اسے مزید ایک روز استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فوری طور پر کہیں سے دوسرے لباس کا بندوبست کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔

ہری نے آتے ہی کہا۔ ”وہج! اب میرا دماغ کچھ کچھ کام کرنے لگا ہے۔ گاؤں میں ایک سردار جی موٹر سائیکل کا کام کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس سے جپ کے بدلے میں وہ گاڑی نہ لے لی جائے۔“

میں ہنس کر بولا۔ ”ہری! تو نے ترکیب تو اچھی سوچی ہے، لیکن اس طرح گاڑی بدلنا آسان تو نہیں۔ فوجی گاڑی کون لے گا؟ اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو اگلے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر بھی تو نے جگہ ڈھونڈی ہے تو میں بھی کوئی راستہ نکالوں گا۔ کھانا کھا کر نکلتے ہیں۔“

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب ہم سرائے سے نکلے تو سورج سر پر آچکا تھا۔ ہلکی گرم ہوا گرمیوں کی آمد آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ہری گھوڑی پر سب سے آگے روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے چلتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ ہم تمہارے پیچھے چل رہے ہیں۔ سردار جی کے گیراج کے پاس ہم جپ روک لیں تو بھی تم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہنا۔“

گیراج کے قریب پہنچ کر میں نے جپ رکوائی اور موہن سے سرگوشی کر کے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ”کیا حال ہے سردار جی؟“

”آئیے سرکار، آئیے۔“ سردار جی نے ہمیں گاہک سمجھ کر ہمارا استقبال کیا۔

”ایک ٹھیکانہ پر ڈول چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے گیراج کے کونے میں کھڑی فورڈ کار میں نے دیکھ لی۔

گھوڑوں کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ ہری کو پریم کے قتل کا جو فریضہ انجام دینا ہے، وہ آج شام تک ادا ہو جانا چاہئے۔ اس کے بعد رات ہم کسی جنگل میں بسر کریں گے۔ ہری کے لئے ایک راکفل کا بندوبست بھی کرنا ضروری ہے۔ پریم کے قتل کرنے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر راندر کہیں نہ کہیں ہمیں ڈاکا بھی ڈالنا چاہئے تاکہ پولیس کو اوپر تلے کئی جھٹکے محسوس ہوں۔ ”میں پولیس سے معرکہ آرائی کے معاملے میں ”پرانا پانی“ تھا، ظاہر ہے یہ بات میرے ساتھیوں کو پتا نہیں تھی۔ میں اسی لئے اپنے گزشتہ تجربات کی روشنی میں پلاننگ کر رہا تھا۔ مجھ سے ہتر پولیس والوں کی نفسیات کو اور کون سمجھتا۔ میرے ساتھی تو اس معاملے میں قطعی نا تجربہ کار تھے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولا۔ ”ڈاکا ڈالنے سے ہمیں بھی کار تو س خریدنے کے لئے پیسے مل جائیں گے۔ پولیس پر اس ڈاکے کا الگ رعب پڑے گا۔ کسی ایک مقام پر ہم بارہ گھنٹے سے زیادہ فی الحال نہیں رکھیں گے۔ ہر جگہ ہمیں ایسے آدمیوں کو تلاش کرنا ہوگا جو آہرا دے سکیں۔ اگر کسی کو دھمکی دینے یا ڈرانے سے کام نکل جائے تو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی بے وفائی کرے یا پولیس کا پیارا بننے کی کوشش کرے تو اسے ڈھیر کرنے میں دیر نہیں لگانی۔ بس اتنا یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ پولیس ہماری دشمن، مادر ہمارے شکار اور غریب عوام ہمارے دوست ہیں۔“ میں نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کے چروں کا جائزہ لیا، پھر کہا۔

”کسی کو کوئی اعتراض؟“

”ہمیں منظور ہے۔“ سب یک زبان ہو کر بولے۔

پھر رگھویر بولا۔ ”میرے باپ کی زمین چھیننے والے جاگیردار سے بھی انتقام لینے کے بارے میں سوچنا ہے۔“

”رگھویر! اب وہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔ وہ ہماری پوری ٹولی کا شکار ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، اس کی بھی ہم اچھی طرح خبر لیں گے۔“

شکر کہنے لگا۔ ”میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، اس کے باپ نے کہیں اور اس کی شادی کر دی۔ مجھے اس کا بہت صدمہ ہے۔“

شکر کی بات سن کر مجھے شکستہ یاد آگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کل یہی سوال میرے سامنے بھی آ سکتا ہے۔ جو اصول بنایا جائے گا اس پر مجھے بھی عمل کرنا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ ”شکر! یہ ایک نازک سا جذباتی مسئلہ ہے۔ کسی عورت سے سب بردستی کرنا نا انسانی ہے۔ ہم قانون کی کھل کر خلاف ورزی کریں گے، لیکن قدرت کے قوانین کا ہمیں پاس رکھنا ہوگا ورنہ ہم راہ سے ہٹک جائیں گے اور زیادہ عرصے اپنی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکیں گے۔“ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود شکر مجھے مطمئن نظر نہیں آیا تو بولا۔ ”ہاں اگر وہ لڑکی اپنے شوہر سے ناخوش ہو اور اب بھی تم سے پیار کرتی ہو تو میں خود جا کر اسے اپنے ساتھ لاؤں گا۔“

میری بات سن کر شکر کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ یقیناً اسے اپنی محبت پر بھروسہ ہوگا۔

اب میں موہن سے مخاطب ہوا۔ ”موہن! تمہیں کچھ نہیں کہنا؟“

سردار جی نے فوراً اپنے لڑکے کو ایک گیلن پٹرول جیب میں ڈالنے کا حکم دیا۔ میں اتنی دیر میں قریب سے کار کا معائنہ کر چکا تھا۔

”سردار جی! اس گاؤں میں کیا ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس موٹر گاڑیاں ہیں؟“ میں نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں سرکار! گاؤں میں یہ ایک ہی گاڑی ہے، لیکن یہ بھی اب جاری ہے۔ جاگیردار صاحب نے اسے دو سال پہلے خریدا تھا، مگر اب ان کی حالت پتلی ہو گئی ہے اس لئے بیچنے کو کہتے ہیں۔ یہاں کیوں کہ اکثر مالدار یا تری آتے رہتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے، کوئی گاہک مل جائے گا۔“ سردار جی نے تفصیل سے جواب دیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں گاڑی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ غالباً اسی خیال سے اس نے گاڑی کی تعریف شروع کر دی۔ ”ایک دم چالو ہے۔ تیس میل دیتی ہے۔ دو سال میں ایک مرتبہ بھی مرمت کی ضرورت نہیں پڑی۔ انجن کا تو جواب ہی نہیں۔“

”پھر تو گاڑی واقعی اچھی ہے۔ ہمارے کرنل صاحب بھی آج کل کسی اچھی گاڑی کی تلاش میں ہیں۔ میں ان سے بات کروں گا۔“ میں نے سردار جی کو دانہ ڈالا۔

سردار جی خوش ہو گیا۔ اس نے لڑکے کو چار گلاس لسی لائے کو کہا۔ میں نے موہن کو بلا کر گاڑی کا انجن وغیرہ چیک کرنے کی ہدایت دی۔

”اگر آپ کے کرنل صاحب یہاں نہ آسکیں تو میں گاڑی آپ کہیں تو وہاں لے آؤں گا۔“ سردار جی نے سودا پکا کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔

”نہیں، فی الحال تو وہ چھٹی پر ہیں اور سنت گڑھ میں ہیں، خود آکر دیکھ لیں گے۔“ میں بولا۔ ”ہم انہی سے ملنے کے لئے جا رہے ہیں۔ میں بات کر لوں گا، لیکن گاڑی کے دام مناسب ہونے چاہئیں۔“ اسے پھینتے دیکھ کر میں نے ڈور کو مزید ڈھیل دی۔

”ارے سرکار، یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ اپنے کو تو سو پچاس روپے دلالی مل جائے، بہت ہے۔ ہم تو بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کے فائدے کی سوچتے ہیں۔“

سردار جی نے کہا اور پھر ہم سب کو لسی کے گلاس تھما دیئے جو لڑکے کے پاس آ رہا تھا۔ لسی پینے کے بعد پٹرول کے پیسے دے کر ہم چاروں جیب میں سوار ہو گئے۔ موہن جیب کو اشارت کر رہا تھا کہ میں نے ایک نوکیلی سلاخ ٹائز میں لگا دی۔ جیب ذرا ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا سننے ہی سردار جی دوڑا دوڑا آیا۔

”مصیبت ہو گئی سردار جی۔“ میں نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

”کوئی بات نہیں، میں ابھی پیچھے لگائے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سردار جی وہیل کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اسی وقت سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بول اٹھا۔ ”لیکن ہمیں فوراً کرنل صاحب کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اگر ہم دیر سے پہنچے تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔“

سردار جی نے ذرا دیر کچھ سوچا، پھر خوش ہو کر کہا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ فورڈ کار لے

ہے۔ اس طرح کرنل صاحب کو گاڑی بھی دکھا سکیں گے اور اس میں سڑکر کے آپ کو گاڑی کی حالت بھی بتا چل جائے گا۔“

سردار آخر زیر دام آ ہی گیا۔ میں نے چہرے سے اپنی دلی کیفیات کا اظہار نہ ہونے دیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، بات تو صحیح ہے۔ اگر کرنل صاحب کو یہ گاڑی پسند آگئی تو ہم انہیں اسی گاڑی میں ساتھ لے آئیں گے تاکہ سودا ہونے کی صورت میں فوری ادائیگی بھی ہو جائے۔“

سردار جی نے لڑکے کو گاڑی صاف کرنے کا حکم دیا اور اس میں دو گیلن پٹرول بھی ڈلوادیا۔ پھر اس نے جالی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تک آپ واپس آئیں گے، جیب ایک دم ریڈی ہوگی۔ مجھے پوری امید ہے کہ کرنل صاحب کو گاڑی پسند آ جائے گی۔“

فوجی جیب اس کار سے بہر حال منگنی تھی اس لئے سردار جی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہم جیب کے بدلے وہ کار لے آئیں گے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے بات بن جائے گی۔ اگر سردار جی کو وہ کار پہنچی نہ ہوتی تو میں کوئی اور راستہ نکالتا۔

ہم چاروں دوست کھلی فورڈ میں بیٹھ گئے اور اسے اشارت کر دیا۔ فورڈ کو بھی موہن ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

ہری گھوڑی پر آگے جا رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ جب کار، گھوڑی کے پاس پہنچی تو میں نے ہری سے مذاق کیا۔ ”اوتے مسافر، سنت گڑھ کا راستہ کون سا ہے؟“

ہری گھوڑی سے کود کر نیچے آ گیا اور بولا۔ ”یار! تو تو دنیا کے تمام راستوں سے واقف ہے، آخر سردار جی سے گاڑی لے ہی آیا۔“

اب میں مانک پر سوار ہو گیا اور کہا۔ ”گاڑی کے بدلے اسے جیب ہم دے آئے ہیں۔ شام تک بے چارہ بڑی لگن سے ہمارا انتظار کرے گا۔ پھر وہ جائے اور اس کا کام۔“

اس کے بعد کار آگے بڑھ گئی۔ سنت گڑھ آ گیا تو میں نے گھوڑی ہری کے حوالے کر دی۔ راستے میں، میں نے پریم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

”جا ہری، چھپ کر معلوم کر کے آ کہ پریم ہوٹل میں ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کس جگہ بیٹھا ہے؟“ میں نے ہری کو مخاطب کیا۔

ہری گیا اور ذرا ہی دیر میں واپس آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ”وجہ! وہ ہوٹل میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں بولا۔ ”تو مجھے دور سے وہ ہوٹل دکھا کر واپس آ جا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح ہوٹل سے باہر نکالتا ہوں۔ آگے کا کام تم لوگوں کو کرنا ہے۔“ پھر میں نے اپنے منصوبے کی تفصیل سے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔

ہری نے خوش ہو کر کہا۔ ”یار وجہ! تیرا دماغ بھی کمال ہے۔ اس میں ترکیبوں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔“

میرے ایما پر ہری مجھے ہوٹل تک چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ میرے ہاتھ میں ڈانگ تھی۔ میں کاؤنٹر پر

”ہاں میں، تیری موت۔“ ہری نے رانقل کی ٹالی اس کے سینے پر رکھ دی۔ یہ رانقل قریب بیٹھے ہوئے موہن کی تھی۔

اسی وقت موہن نے کار روک لی اور پریم گڑگڑانے لگا۔ ”ہری! مجھے معاف کر دے۔ میں تیرا غلام نہ کر رہوں گا۔“

”مجھے غلام کی ضرورت نہیں، دوست کی ضرورت ہے اور تو ہمارا بے وفا دوست ثابت ہوا ہے۔“ ہری نے جواب دیا۔ ”نقداری کا انجام تجھے ابھی مل جائے گا۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں ہری کار ہی میں گولی مار کر پریم کو ٹھنڈا نہ کر دے، اسے مخاطب کیا۔

”نہیں ہری! اسے کار سے اترنے دو۔“

پریم شاید میری بات کا کچھ اور ہی مطلب سمجھا اور راستے ملتے ہی کار سے اتر کر ایک طرف بھاگا۔ شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی جان بخش دی ہے۔ پریم کے قتل کی ذمہ داری مجھ نہیں، ہری پر تھی۔ میں نے اسی لئے اپنی گھوڑی اور ڈانگ اس کے حوالے کر دی۔

”ہری! اسے زیادہ اذیت مت دیجو۔“ میں نے اس وقت کہا جب ہری گھوڑی پر سوار ہو رہا تھا۔

ہری نے اقرار میں گردن ہلا کر گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ پریم زیادہ دور نہیں جاسکا تھا کہ ہری گھوڑی اڑاتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ہری نے گھوڑی کی لگام کھینچی اور گھوڑی اپنی اگلی دو ٹانگیں اونچی کر کے لگ گئی۔ ہری نے برہمی لگی ڈانگ بلند کی اور آن کی آن میں برہمی پریم کے شانے کو چھیدتی ہوئی نکل پڑی۔ وہ وہیں پیٹ کے بل گر گیا۔ ہری گھوڑی سے کودا اور لات مار کر پریم کو سیدھا کیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے پریم کے پیٹ میں برہمی گھونپ دی اور جب برہمی نکالی تو خون کا زبردست فوارہ سا بلند ہوا۔

اس وقت تک ہم بھی کار آگے بڑھا کر وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ ہری نے برہمی کو مٹی لگا کر صاف یا اور پھر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔

چند ہی لمحے بعد ہماری کار اور گھوڑی تیزی سے منزل طے کر رہے تھے۔ ذرا آگے جا کر میں نے بل پولیس والے کو آتے دیکھا تو کار رکوا لی اور پولیس والے کو مخاطب کیا۔ ”ارے او! یہ راستہ کس طرف جاتا ہے؟“

پولیس والا ہمارے جسموں پر فوجی وردی دیکھ کر مرعوب سا نظر آنے لگا۔ اس نے بتایا۔ ”صاحب! وڈا آگے جا کر یہ راستہ دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ ایک راستہ جنگل کی طرف جاتا ہے، دوسرا ٹانگ پور طرف۔“

میں نے یہ سننے کے بعد کہا۔ ”اچھا اب میری بات غور سے سنو۔ یہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے ایک لاش پڑی ہے۔ ہمارے بہادر ساتھی ہری نے پریم کو قتل کیا ہے۔ اس وقت وہ مل والے کو اس کے لپٹے کے قتل کی اطلاع دے رہا ہے، پھر امرتسر پولیس کے ایس پی متا کو اطلاع دینا کہ وجہ کی ٹولی نے ٹیس گھنٹے میں یہ پوچھا قتل کیا ہے۔ اگر متا کو زندگی پیاری ہو تو پنجاب چھوڑ کر چلا جائے ورنہ گالیاں اور

بیٹھے پریم کی نظر بچا کر ہوٹل میں داخل ہو گیا اور ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میری پشت پریم کی طرف تھی۔ نے دیکھا، پریم کے برابر ایک اندھا بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پریم کا خالو ہوگا۔

لٹی پینے کے بعد میں تھڑے (کاؤنٹر) پر گیا اور پانچ روپے کا نوٹ رکھا۔ پریم نے میری طرف رخ بغیر کہا۔ ”ارے بھائی! ابھی تو دکان داری کہاں ہوئی ہے۔ کھلے پیسے دو۔“ یہ کہہ کر اس نے نظر اٹھائی مجھے دیکھتے ہی جیسے اس کے ہوش اڑ گئے۔

پریم کی حالت دیکھ کر پہلے تو میں ہنسا، پھر اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر فرار کی راہ ڈھونڈ رہا ہو۔ میرے ہاتھ میں برہمی والی ڈانگ دیکھ کر وہ لرز رہا تھا۔ میں بھی جان بوجھ کر فاصلے پر کھڑا تھا تاکہ پریم کو بھاگنے کا راستہ مل جائے۔ دوسرے ہی لمحے پریم تھڑے سے کود کر بھاگنے لگا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ پریم ہوٹل سے نکلے ہی دو فوجیوں سے ٹکرایا۔ انہوں نے پریم کو روکا مجھے دیکھ کر ایک فوجی نے میری طرف رانقل تان لی۔ میں رک گیا۔

پریم نے فوراً کہا۔ ”بچائیے..... مجھے بچائیے۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔“ وہ میرے ہی ساتھی فخر اور رگھویر سے فریاد کر رہا تھا۔

”ہمت دیکھو ہیں مارنے والے۔“ فخر بولا اور مجھے برا بھلا کہنے لگا۔

رگھویر نے پریم کو کار میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”چل بیٹھ جا، ہم تجھے تیرے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ کار لے کر وہ ہوٹل کے قریب ہی آگئے تھے۔

پریم کے کار میں بیٹھتے ہی موہن نے کار آگے بڑھا دی۔ ہری موہن کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ پچ ایک طرف رگھویر اور دوسری طرف فخر اور درمیان میں پریم تھا۔ میں گھوڑی پر کار کے پیچھے ہی چلا رہا تھا۔ دوسرا ہو گئی تھی اور اس لئے سڑک پر زیادہ لوگ نہ تھے، جو تھے بھی تو ان کی سمجھ میں بات آ۔ سے پہلے ہی کار اور گھوڑی ان کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ میں کار کے بالکل پیچھے پیچھے گھوڑی دو رہا تھا۔

مجھے پیچھے آتے دیکھ کر پریم تقریباً چیخ کر بولا۔ ”فوجی بھائیو! وہ..... وہ دیکھو۔ میرا تعاقب کر رہے، وہ مجھے..... مجھے اس سے بچالینا۔“

آگے بیٹھے ہوئے موہن نے کہا۔ ”کوئی پرانی دشمنی معلوم ہوتی ہے۔ ٹھہرو! ہم ابھی گاڑی روک فیصلہ کئے دیجے ہیں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ پریم زور سے بولا۔ ”اس بد معاش اور اس کے ایک دوست کی باتوں میں کر میں پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی، لیکن وہ یہاں تک آپہنچا۔ یہ نامزد جو گھوڑی بیٹھا پیچھا کر رہا ہے کسی کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔“

پریم کے منہ سے آخری الفاظ نکلے ہی میں نے دیکھا کہ ہری نے مرکز ایک زوردار تھپڑ اس منہ پر جڑ دیا اور چیخا۔ ”کتے! تو نامزد کسے کہہ رہا ہے۔“

”ہری..... ہری۔ تہ..... تہ۔“ پریم ہلکا کر رہ گیا۔

گولیاں کھانے کے لئے تیار رہے۔

پولیس والے کے پاس صرف ایک لاشی تھی۔ ہم سب مسلح تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑکیا پھر چند ہی لمبے بعد وہ آنکھیں بند کر کے گاؤں کی طرف اس طرح بھاگا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا۔ سپاہی کی اس حرکت پر ہم بھی کو ہنسی آگئی۔

”چلو! گاڑی دوڑا دو۔ آج کی رات ہم جنگل میں بسر کریں گے۔“ میں نے موہن سے کہا۔
کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی اس دوراہے پر آگئی، سپاہی نے جس کی نشاندہی کی تھی۔ موہن نے گاڑی کو جنگل کے راستے پر ڈال دیا۔

اس وقت دن ڈھل چکا تھا جب ہم جنگل میں داخل ہوئے۔ دونوں طرف اکی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر گاڑی سے آگے ہری ”ٹانک“ پر سوار اڑا جا رہا تھا۔ ہم کافی دیر اور کافی دور تک جنگل میں بڑھتے رہے۔ جب اندھیرا ہو گیا تو ہم رک گئے۔ ہم نے ہری کو گھوڑی پر بیٹھ کر کہ آس پاس کوئی آبادی ہو تو اس کا ہانکا کر جلد واپس آئے۔ باقی دوست سستانے لگے۔

کچھ دیر میں ہری لوٹ آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آتے ہی اس نے خبر دی کہ یہاں سے تھوڑی دور بنجاروں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور اس وقت وہ آگ جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ ہری کی بات سنتے ہی میں بول اٹھا۔ ”بہت اچھی خبر لائے ہو تم۔ آج کی رات کھانے پر ہم انہی بنجاروں کے مہمان بنیں گے۔“

پھر ہم لوگ کار میں سوار ہو کر ہری کے ساتھ بنجاروں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں شکر کی مرغی کھانے کی خواہش بھی آسانی سے پوری ہو گئی تھی۔ فوج میں کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا سکھ، سبھی گوشت خور تھے۔ اکا دکا ہی کوئی کٹر قسم کا ہندو گوشت نہیں کھاتا تھا اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ شراب اذر گوشت خوری ہم بھی دوستوں کی عادت تھی۔

جب کھانا ختم ہوا تو بنجاروں نے ناچ گانے کی محفل جمادی۔ ہم لوگوں کے علاوہ صرف بنجاروں کے قافلے میں عورتیں اور بچے ملا کر ساٹھ افراد بنتے تھے۔ یہ محفل رات گئے تک جی رہی۔ اس کے بعد ہم سب دوست بنجاروں کے فراہم کردہ بستر پر جا کر ایسے سوئے کہ پانچ چھ گھنٹے بعد آنکھ کھلی۔ آرام کر کے ہم اب پہلے سے زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ہم نے بنجاروں کے سردار کو بلایا۔

سردار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”مہمان نوازی کا شکریہ! مگر جاتے جاتے ہم تمہیں ایک حقیقت بتائے دیتے ہیں۔ ہمارا تعلق فوج سے نہیں ہے، ہاں پہلے ہم فوجی ضرور تھے، مگر اب ڈاکو ہیں۔“

میری بات سن کر سردار چونکا، پھر بڑے سادہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”یارو! اگر پہلے یہ پتا چل جاتا کہ تم فوج میں ڈاکو ہو تو اس سے زیادہ خاطر کرتا۔“

”خیر پھر کبھی ملاقات ہونے پر کسر نکال لینا، فی الحال یہ بتاؤ کہ یہاں کہیں سواری کے اچھے گھوڑے مل سکتے ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

سردار نے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس چند ہیں، لیکن وہ تمہارے کام نہیں آئیں گے اگر لے جانا چاہو تو خوشی سے لے جاؤ۔ وہی گھوڑوں کی بات تو جنگل پار کر کے تمہیں چھوٹا سا ایک جنگل نظر آئے گا۔ اس کا مالک کبھی کبھی آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آتا ہے۔ اسے گھوڑے پالنے کا شوق ہے۔ وہاں پر گھوڑے ہیں بھی اچھے۔ اب تک ان پر ہماری نظر تھی، مگر تمہیں ہم سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ تم ان گھوڑوں کو لے جا سکتے ہو۔“ اس کے بعد سردار ہم سب سے باری باری گلے ملا اور بولا۔ ”تم لوگ ڈاکے ڈالتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہو گے اس لئے ہماری ملاقات کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔ کبھی بھی تم ہمارے مہمان بننے میں خطرہ محسوس نہ کرنا۔ ہم تم پر کبھی آنچ نہیں آنے دیں گے۔“ ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لئے کار میں بیٹھ گئے۔ ہری نے گھوڑی کی باگ تھام لی۔

موہن نے ابھی کار اشارت کی ہی تھی کہ سردار نے آواز دے کر ہمیں روکا اور کہا۔ ”دوستو! اس جنگل میں نوکروں کے علاوہ زمیندار کے پالتو شکار کتے بھی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیں گے۔ ان کی طرف سے خبردار رہنا۔“

مجھے بوڑھے سردار کی بات سن کر اس کی دوستی پر اعتماد سا ہو گیا۔ میں نے اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”بھلا! کتوں وغیرہ کی کوئی پرواہ ہمیں نہیں ہے کیونکہ ہم زمیندار کو ہوشیار کر کے اس سے گھوڑے چھینیں گے، چوری نہیں کریں گے۔“

”شباباش جوانو! بہادری اسی کا نام ہے۔“ سردار نے ہماری دلیری کی داد دی۔

ہم وہاں سے دار نہ ہو گئے۔ اب دن نکل آیا تھا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ دہر اور رات کا کھانا سردار نے ہمارے ساتھ باندھ دیا تھا۔ جنگل سے نکل کر زمیندار کے جنگلے پر دھادا بولنا رات ہی کو زیادہ مناسب تھا۔ ہم نے اسی لئے وہ دن جنگل ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

میرے لئے اس طرح کی زندگی کوئی نئی نہیں تھی۔ برسوں میں نے یونہی بھٹکتے ہوئے گزارے تھے۔ وہ جنگل خامے وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور وہاں پھل دار درخت بھی تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو ایک جگہ چھوڑ کر جنگل کا جائزہ لینے نکل گیا۔

بعض جگہ تو وہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ دن پر بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ جنگل کے ایک ایسے ہی حصے سے گزرتے ہوئے اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے مجھے آواز دی ہو۔

”اے علیالیش! آ جا کہ ہم تیرا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ اس مرتبہ وہ ہماری اور گونج دار آواز واضح طور پر دائیں جانب سے سنائی دی۔

میرے سارے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی۔ وہ کون تھا جو میری حقیقت سے واقف تھا؟ میرے ذہن میں آنڈھیاں سی چلنے لگیں۔

”اے بھگ جانے والے! خوفزدہ نہ ہو اور ہمارے پاس چلا آ۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی انجانی کشش دائیں جانب کشاں کشاں لے جا رہی ہو۔ اس طرف اتنے گھنے درخت تھے کہ تقریباً اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے دو چراغ سے روشن نظر آئے

اور میں ان کی طرف کھنچا چلا گیا۔

میں جنہیں دو روشن چراغ سمجھا تھا، وہ دو آنکھیں تھیں۔ وہی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دھبہ رہی تھیں۔ میں نے وہ چہرہ دیکھا تو لرز کے رہ گیا۔ وہ فقیر میرے لئے اجنبی نہیں تھا جو زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

”آگیا چڑیا کے۔“ فقیر کے لمبے میں میرے لئے تسخّر تھا۔

یہ وہی مجذوب فقیر تھا جو برسوں پہلے مجھے ملتان میں شیخ بزاز الدین زکریا کے مقبرے پر ملا تھا۔ میرے ذہن میں برسوں پہلے کا اندوہناک واقعہ تازہ ہو گیا۔

میں ملتان میں ایک حکیم نبراس الدین کے جسم پر قابض تھا۔ ایک روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ملتان میں جن بزرگان دین کے مقابر ہیں، میں ان کی زیارت کروں۔ ابھی میں مقبرے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ میری پشت پر ایک ڈھیلا آکر لگا۔ میں غصے میں تیزی سے مڑا تو کچھ ہی فاصلے پر اسی فقیر کو دیکھا جو چہرے سے کوئی مجذوب لگتا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں مجھے ڈھیلے نظر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور پھر ڈھیلا کھینچ مارا۔ یہ ڈھیلا میرے سر پر لگا۔

”بھاگ لے یہاں سے چڑیا کے۔“ فقیر ہستے ہستے ایک دم جیسے خفا ہو کر غرایا۔ ”تجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں۔“

”کیوں! تو شہر کو توال لگا ہوا ہے۔“ میں اس کی طرف لپکا، اسی کے ساتھ اسے برا بھلا بھی کہا۔

”کہہ دیا تجھ سے کہ چلا جا یہاں سے ورنہ ایسی سزا دوں گا.....“ فقیر کا جملہ پورا نہ ہوسکا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی تھی۔

غصے کے سبب میں بے قابو ہو گیا تھا۔ فقیر کی گردن دباتے ہوئے اچانک مجھے جھٹکا سا لگا اور پھر زندگی میں پہلی بار مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ حکیم نبراس الدین کے جسم میں میرا دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر میں نے فقیر کی گردن چھوڑ دی۔

”اب اس جسم کو بھی چھوڑ دے گستاخ ورنہ اسی کے اندر گھٹ کے مر جائے گا۔“ فقیر نے مجھے نفرت و خدات سے مخاطب کیا۔

فقیر اگر مجھے ایسا کرنے کو نہ بھی کہتا تو اب حکیم کے جسم میں میرا مزید ٹھہرنا، ممکن نہیں تھا۔ سو میں، حکیم کے جسم سے باہر آ گیا۔ اسی وقت مجھے فقیر کے ہاتھ میں بول کی ایک خاردار شاخ نظر آئی۔ میرا وجود اب ناپید تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وہ فقیر مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور وہ مجھے کانٹوں بھری شاخ سے مارنے لگا۔ میرے وجود میں خنجر سے اتر گئے۔ میں اس کی مار سے بچنے کے لئے مقبرے کی طرف بھاگا، لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سامنے ہی مجھے ایک مرد اور عورت نظر آئے جن کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس فقیر کی نظروں سے چھپنے کے لئے میں، بچے کے جسم میں اتر گیا۔

ایک مرتبہ پھر فقیر زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ”بس اب تو قید ہو گیا۔ اس قید خانے سے تیرا نکلتا بہت محال ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جا مگر تو گستاخی پر اتر آیا اور نہ گیا“ سو اب سز بھگت

..... لمبی سزا۔ تیری صفات میں نے تجھ سے چھین لیں۔“

پھر وہی ہوا جو فقیر نے کہا تھا۔ میں اس بچے حسن کے جسم میں قید ہو گیا۔ کوشش کے باوجود میں اس کے جسم سے نہ نکل سکا۔

”یاد آگیا تجھے سب کچھ۔“ فقیر نے اس طرح کہا جیسے وہ میرا ذہن پڑھ لینے پر قادر ہو۔ ”پھر یہ ہوا کہ تو بھگت کر سفلی طاقتوں کا غلام بن گیا اور یہ بھول گیا کہ تو اہل ایمان میں سے ہے۔ تجھے سزا دی گئی تھی، لمبی سزا، نافرمانی کی سزا۔ کیا تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سزا کبھی پوری نہیں ہوگی اور تجھے بدی کی راہ پر ہی چلنے دیا جائے گا۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ تیرا ایمان اتنا کمزور ہوگا۔ سن کہ تیری سزا کی مدت ختم ہوئی، مگر اب تجھے بے تکلیف نہیں چھوڑا جائے گا۔ کچھ سمجھا چڑیا کے۔“

”ہاں اے اللہ کے نیک بندے۔ میں غلطی پر تھا۔“ میں فوراً بول اٹھا۔

”تو پھر توبہ کر اور کلمہ پڑھ۔“ اس نے مجھے تاکید کی۔

میں نے فوراً اس کے حکم پر عمل کیا۔

”سن کہ ہم نے تیری تمام تر جناتی صفات جو چھین لی تھیں، واپس کر دیں، لیکن تو اپنے گزشتہ اعمال کے سبب اب صاحب اختیار نہیں رہا۔ تیری صفات اللہ کے حکم سے جب دوبارہ عمل ہونا چاہیں گی، ہوں گی اور جب خدا کو ایسا منظور نہ ہوگا تو بے بس ہو جائے گا اور کچھ نہ کر پائے گا۔“ فقیر بولا، پھر کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا اور کہا۔ ”اے علیالیش! اللہ کے حکم سے اس آدم زاد کے جسم سے نکل اور پھر اسی میں داخل ہو جا۔“

اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود سے کوئی گرفت ہٹ گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں، وجے کے جسم سے باہر آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ وجے مرا نہیں، زندہ تھا۔ فقیر کے حکم سے میں پھر بے ہوش وجے کے جسم میں اتر گیا۔

پھر جب مجھے وجے کے جسم میں قرار آیا تو دیکھا، فقیر غائب ہو چکا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے اپنی جناتی صفات واپس مل جانے پر کتنی خوش تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ افسوس بھی تھا کہ میں پورے طور پر اپنی مرضی کے مطابق ان جناتی صفات کو بروئے کار لانے کا اہل نہیں رہا تھا۔

میں کچھ دیر تک کم مسم سا اسی جگہ کھڑا رہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک الٹا کھا خیال آیا۔ جناتی صفات واپس مل جانے کے بعد اب کوئی مسئلہ میرے لئے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ میں ایک بار پھر وجے کے جسم سے باہر نکل آیا اور اس پر گہری بے ہوشی طاری کر دی۔ اب وجے اسی وقت ہوش میں آتا، جب میں ہاتھتا۔ یہ طور احتیاط میں نے وجے کے جسم کو خشک چوں میں چھپا دیا۔ کھلی فضا میں آزادی سے پرواز کرتے ہوئے مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی۔

جلد ہی میں اس جنگل سے نکل کر زمیندار کے جنگل تک پہنچ گیا۔ جنگل کا جائزہ لینے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ امطلبل میں مجھے اعلیٰ نسل کے چھ سات گھوڑے بندھے نظر آئے۔ مجھے صرف چار گھوڑوں کی ضرورت تھی۔ میں نے گھوڑے پسند کر لئے، مگر فوری طور پر گھوڑوں کو نہیں کھولا۔ اس جنگل کے ایک

کمرے میں مجھے تجوری نظر آگئی تھی۔ زمیندار اس وقت بیٹکے پر نہیں تھا۔ بیٹکے میں صرف تین ملازم تھے۔ بقیہ ملازموں کو شاید زمیندار اپنے ساتھ شکار پر لے گیا تھا۔

جس کمرے میں تجوری تھی، وہ باہر سے مشعل تھا۔ میں نے اس میں تالا لگا رہنے دیا اور کمرے میں پہنچ گیا۔ تجوری کا قفل ایک ہی جھٹکے میں کھل گیا۔ میں نے تجوری صاف کرنے میں دیر نہیں کی۔ اسی کے ساتھ مجھے کپڑوں کی فکر ہوئی۔ مختلف سائز کے مردانہ لباس میں نے ایک سوٹ کیس میں بھر لئے اور کمرے سے نکل آیا۔ کمرے کے دروازے پر بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ یہ اپنے انداز کی انوکھی ڈکیتی تھی۔ احتیاطاً میں نے ملازموں پر بے ہوشی طاری کر دی اور پھر گھوڑے کھول کر جنگل کی راہ لی۔ بہت جلد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں وجہ کے بے ہوش جسم کو چھپا گیا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں ایک بار پھر وجہ کے جسم میں اتر گیا۔ اب میرے پاس چار تندرست و توانا گھوڑے اور ایک سوٹ کیس تھا۔ میں نے گھوڑوں کو دیہی نیم تاریکی میں باندھ دیا اور سوٹ کیس بھی چھپا دیا جس میں کپڑے اور ہزاروں روپے تھے۔

میں ابھی وہاں سے کچھ ہی دور چلا تھا کہ شکر اور رگھویر کو اسی طرف آتے دیکھا۔
”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ قریب آکر بولے۔ ”تمہیں اتنی دیر ہو گئی لوٹنے میں تو ہم فکر مند ہو گئے۔ ہری اور موہن تمہاری تلاش میں دوسری طرف گئے ہیں۔“

”میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں یا رو کہ جنگل میں کھو جاؤ۔“ میں اطمینان سے بولا۔ ”ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ تم لوگ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”پھر بتاؤ ناکہ کہاں گئے تھے؟“ شکر نے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔
”ڈاکا ڈالنے گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اس وقت ڈاکا ڈالنے گئے تھے، دن میں؟“ رگھویر ناقابل یقین لہجے میں بولا۔

”ہاں یار! ڈاکے کا مال میں نے ایک جگہ جنگل میں چھپا دیا ہے۔“
”لگتا ہے کہ اس کا داغ چل گیا ہے۔“ رگھویر نے شکر کی طرف دیکھا۔
”ہماری بھی تو زیادہ پڑ رہی ہے نا۔“ یہ کہہ کر شکر ہنس پڑا۔
”ٹھیک ہے، ابھی کچھ دیر بعد جب ڈاکے کا مال دیکھو گے تو پتا چل جائے گا کہ کس کا داغ چل گیا ہے۔ میرا یا تم دونوں کا۔“

”اگر تم ج کمرہ رہے ہو تو ہمیں اس جگہ لے چلوں جہاں ڈاکے کا مال چھپایا ہے۔“
”ہری اور موہن بھی ساتھ ہوں گے تو ادھر چلوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بھی مل گئے۔ شکر نے جب ان سے ڈاکے کا ذکر کیا تو بھی وہ ہنسنے لگا۔
”اچھے اچھے خواب دیکھنے میں کوئی برائی نہیں۔“ موہن نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”بس آدمی کو ذرا دن اور رات کا خیال رکھنا چاہئے۔“

”تو تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو۔“ میں نے مصنوعی حقکی کا اظہار کیا۔ ”تم لوگوں کی خاطر میں نے دن دہاڑے جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈاکا ڈالا اور تم ہی میرا مذاق اڑا رہے ہو بولو، کیا تمہیں گھوڑوں کی ضرورت نہیں؟ کیا تمہیں اس فوجی وردی کی بجائے سادہ لباس نہیں چاہئے؟ کیا روپے نہیں چاہئیں خرچے کے لئے؟“

”چاہئے تو بہت کچھ، مگر خواب میں نہیں۔“ شکر نے چوٹ کی۔
”اچھا تو پھر چلو میرے ساتھ۔“ میں سخت لہجے میں بولا۔ ”خواب اور حقیقت کا فرق ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

وہ سب میرے ساتھ ہوئے۔ پھر جب میں انہیں اس جگہ لے کر پہنچا جہاں گھوڑے باندھ کر گیا تھا تو وہ حیران رہ گئے۔

”یہ یہ گھوڑے تم کہاں سے لے آئے؟“ شکر نے حیران ہو کر سوال کیا۔
”اسی زمیندار کے بیٹکے سے جس کا پتا بخاروں کے سردار نے بتایا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک بیڑ کی آڑ میں رکھا ہوا سوٹ کیس بھی اٹھالیا اور بولا۔ ”اس میں ہم سب کے لئے کپڑے اور روپے ہیں۔“
”لیکن یہ یہ سب ہوا کیسے؟ اور تم نے ہمیں پہلے سے کچھ کیوں نہیں بتایا؟“ رگھویر نے پوچھا۔

”اگر بتا دیتا تو تم لوگ مجھے کبھی اکیلا نہ جانے دیتے۔“ میں نے جواب دیا۔
”مگر وجہ، تجھے کچھ ہو جاتا پھر؟“ اس مرتبہ ہری بول اٹھا۔

پھر بڑی مشکل سے میں اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر سکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ زمیندار اپنے ملازموں کو لے کر شکار کھیلنے گیا اور خوش قسمتی سے بیٹکے پر صرف ایک چوکیدار تھا جسے بے ہوش کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

اس کے بعد موہن کار میں اور ہری گھوڑی پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں کو وہ کار جنگل سے کہیں دور جھوڑنا تھی۔ پولیس کو پکڑ میں ڈالنے کے لئے میں نے موہن سے کہا تھا کہ اس کار کو وہ سرائے والے گاؤں میں سردارسی کے حوالے ہی کر آئے کہ کرنل صاحب کو کار پسند نہیں آئی۔

”اور اس نے جیب ساتھ کر دی تو؟“ ہری نے اعتراض کیا۔
”اس سے کہنا کہ ہم کل صبح جیب آکر لے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کبھی اپنی کھوپڑی بھی استعمال کر لیا کرو۔“

ہری اور موہن دوپہر کا کھانا کھا کر گئے تھے اور شام کو لوٹے۔ وہ اپنا کام کر آئے تھے۔ فوجی وردیاں ہم نے کسی آڑے وقت کے لئے استعمال کر رکھ لیں اور لباس تبدیل کر لئے۔

اپنے منصوبے کے تحت میں نے بے درپے کئی وارداتیں کیں جنہوں نے امر ترسملی کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیا۔ سارے علاقے میں میری دھماک بیٹھ گئی تھی۔ ایس پی متا کو بھی یقیناً اب یہ احساس ہو چکا تھا کہ جس کام وہ اتنا آسان سمجھا تھا، وہ اتنا آسان نہیں۔ اس لئے وہ دم دگمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ

اپنے رقبہ اور دشمن کرتار سنگھ کی طرف سے بھی میں اس عرصے میں غافل نہیں رہا۔ کرتار سنگھ اپنی زندگی سے یاموس ہو چکا تھا۔ برابر کے تین جوان بھائیوں کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتا کہ کسی دن میں بھی زندگی کی بازی ہار جاؤں گا۔ میرے خوف سے اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ دن میں بھی گھر سے باہر جاتے ہوئے اسے موت کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جان کے خوف نے ہر کام سے اس کا جی اچاٹ کر دیا۔ آخر اس نے اپنے کھیت ٹھیکے پر دے دیئے تاکہ آمدنی کا ذریعہ برقرار رہے۔ بیٹھے بیٹھے پیسا آنا شروع ہوا تو اسے نئے نئے فحشل سوتھے۔ گاؤں کے چند جوار یوں سے اس کا یار نہ ہو گیا۔ ان میں سے تین لفٹے تھے۔ وہ سب روزانہ دوپہر میں کرتار سنگھ کے گھر آکر جم جاتے اور شراب نوشی کرتے ہوئے تاش سے دل بہلایا کرتے۔ بڑی بڑی بازیاں جیتیں، ٹھٹھول ہوتے۔ میری محبوبہ گلشنیا یہ سب کچھ بڑی بے بسی سے دیکھتی۔ اس کا گھر آوارہ گردوں کا اڈا بن گیا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کرتار سنگھ کے یہ نئے دوست آتے جاتے گلشنیا پر بھی میلی نگاہ ڈالتے اور اکثر ان کے ٹھٹھول میں پھت پر گونجتے قہقروں کے درمیان گلشنیا اپنا نام بھی سنتی۔ کئی دفعہ اس نے ان آوارہ گردوں کے طعنے بھی سنے تھے۔

وہ کرتار سنگھ سے کہتے، یار کرتار! گھر میں حسن کی دیوی ہے، اچھی خاصی بندھی ہوئی آمدنی آتی ہے، لیکن گھر کے وارث کا اب تک پتا نہیں۔ گلشنیا کو کبھی کبھی پانی یا لسی کے گلاس دینے یا خالی گلاس واپس لینے اور جانا پڑتا تو چوہدری کا بیٹا منوہر اسے ایسے گھورتا جیسے آنکھوں کے راستے کچا ہی اپنے اندر اتار لے گا۔ کبھی کبھی وہ گلشنیا کو دیکھتے ہی کسی پھر اور گھٹایا کر لے گا کوئی ٹکڑا بھی منگوائے گا تاکہ شاید گلشنیا اس طرح متوجہ ہو جائے۔ ایک بار گلشنیا سے گلاس لینے ہوئے اس نے گلشنیا کی انگلی دبا دی۔ بس اس دن کے بعد سے گلشنیا اوپر جانے سے کترانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے میل ہی میل بھرا ہوا ہے۔ وہ اب کرتار سنگھ کی چچی کو اوپر بیجھنے لگی۔ منوہر بھی کچھ حالات کو جان گیا۔ اس نے بڑی چالاکی سے کام لے کر اب چچی پر پانسا پھینکا۔ ایک مرتبہ گلشنیا نے بھی منوہر اور چچی کو کھٹھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اس کے بعد اکثر چچی اور منوہر میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ منوہر ہر حال میں گلشنیا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔

ہر چند کہ مجھے گلشنیا پر پورا بھروسہ تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ منوہر کو کسی صورت اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی، پھر بھی یہ صورت حال میرے لئے تشویش کا سبب تھی۔ اب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی تھا۔ میری نظر میں اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جو شخص ان تمام باتوں کا ذمہ دار تھا، یعنی کرتار سنگھ، میں اسی کو ٹھکانے لگا دیتا۔ نہ ہوتا بائس نہ بھتی بائسری۔ پھر گلشنیا کا کیا ہوتا؟ یہ سوال اور اس سے متعلق دوسرے سوالات مجھے پریشان کر دیتے۔ میں جو زندگی گزار رہا تھا، آج میرا تو کل وہاں، کیا ایسے میں گلشنیا کو اپنے ساتھ رکھ لیتا؟ کیا گلشنیا میرے ساتھ در بہ در بھٹکنے پر آمادہ ہو جاتی؟ اگر میری خاطر وہ آمادہ ہو بھی جاتی تو کیا یہ زندگی اس کے لئے آسان ہوتی؟

ابھی میں کسی نتیجے پر یا فیصلے تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ خود میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔

میں اتنے کم عرصے میں طوفان بن کر چھا جاؤں گا۔ میں اور میرے ساتھی کسی بھی وقت اچانک کہیں نمودار ہوتے اور واردات کر کے اس طرح غائب ہو جاتے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ جب پولیس جائے واردات پر پہنچتی تو کوئی بیان یا گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا حتیٰ کہ لئے والا تک یہی کہتا۔ ”چھوڑیے صاحب، جانے دیجئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کوئی بات ہوئی اور وہ دوبارہ آ گیا تو جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔“

میں نے پہلا بڑا ڈاکا اپنے ساتھی رگھویر کے باپ کی زمین بھتیا لینے والے زمیندار کے ہاں ڈالا۔ دوپہر کے وقت میں نے آرام کرتے ہوئے زمیندار کو جگایا اور رگھویر کے باپ کی زمین کے کاغذات نکلائے جو زمین گردی رکھنے کے سلسلے میں زمیندار نے بنائے تھے۔ میں نے ان کاغذات کو اسی وقت وہیں جلا دیا۔ پھر مڑ کر زمیندار کو دیکھا تو وہ منہ زور اور مغرور زمیندار کانپتے ہوئے بولا۔ ”دبے جی! اب کے معاف کر دو، پھر کبھی رگھویر کے باپ کی زمین پر قدم بھی رکھوں تو دوبار کا سمجھنا۔“ یہ سن کر میں نے زمیندار کی پھولی ہوئی توند پر رانقل کی نال رکھ دی اور کہا۔ ”لیکن تو نے اب تک اس غریب کو جو اذیتیں دیں، ان کا کیا ہو گا؟“

”اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا مائی باپ۔“ زمیندار بری طرح کانپ رہا تھا۔ ”نہیں، اس طرح سودا نہیں چٹ سکتا۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”تو نے ایک غریب کو قرض دے کر اور سود لگا لگا کر اس کی زمین بھتیائی تھی۔ اتنے سال تک اس زمین پر جو فصل ہوئی تو اسے کھاتا رہا اور اپنی تجوری بھرتا رہا۔ اس کمائی کو میں بھی سود کے ساتھ وصول کرنا چاہتا ہوں اور سن کہ یہ سود کسی ساہوکار کا نہیں، ایک ڈاکو کا سود ہے؟“ میں نے یہ کہہ کر زمیندار سے تجوری کھلوائی۔ تجوری سے میں نے بہت سا نقد روپیا اور زیورات کا ایک بڑا بکس نکال لیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو لے کر میں ذرا سی دیر میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

پولیس ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک سمت سے دوسری سمت تک میرے گردہ کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ایس بی متا کا حکم تھا کہ اگر مجھ سے کہیں سامنا ہو جائے تو مار دینا یا مر جانا۔ اس کے ساتھ ساتھ متا کو یہ بھی انتظار تھا کہ جب میں ٹانگ پور آؤں تو مجھے گھیر لیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ میں کبھی نہ کبھی ضرور اپنے ماں باپ سے ملنے گھر آؤں گا۔ اپنے قصور کی پراسرار قوت کے ذریعے میں ایس بی متا پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

جتنی صفات واپس مل جانے کے بعد سوائے ایک مرتبہ کے جب بھی میں نے تھا کہیں ڈاکا ڈالنے کی غرض سے دبے کا جسم چھوڑنا چاہا تو اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری سماعت میں ایسے مواقع، مجذوب کے الفاظ گونجتے رہتے۔ ”اب تجھے بے تکلیف نہیں چھوڑا جائے گا.....“ تو اب اپنے مرکز اعمال کے سبب صاحب اختیار نہیں رہا۔

اب میں، دبے کے جسم میں رہتا یا کسی اور آدم زاد کے جسم میں، بات ایک ہی تھی۔ سو، فی الحال میں نے دبے کے جسم ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

میں گردش روز و شب میں سوای اوم پرکاش کو تو بالکل بھول ہی گیا تھا جو شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے مجھے راہ راست سے بھٹکا کر بھوانی دیوی کا داس بنا دیا تھا، لیکن اب مجذوب فقیر کے ایما پر میں صدق دل سے توبہ کر چکا تھا۔

ہوا یہ کہ ایک رات میں سو رہا تھا، مجھے اچانک تھکن کا احساس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ سوای اوم پرکاش میرے سینے پر ایک پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آہنی ترشول (تین ٹوکوں والا ایک طرح کا بھالا) تھا۔ ترشول اس نے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے مجھ پر حملہ کرنے والا ہو۔ پھر میں نے اس کے موٹے موٹے کالے ہونٹ ہلکے دیکھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا بھول گیا کہ تُو بھوانی دیوی کا داس ہے؟ بول تو نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا؟ تجھے خبر ہے کہ اس کی کتنی بڑی سزا ہے۔ اگر تجھے اپنا جیون پیارا ہے تو بول بھوانی دیوی کی ہے۔“ اس کے لہجے میں حکم تھا۔

اس شیطان سے بچنے کی خاطر میں نے وجہ کے جسم کو چھوڑنا چاہا، لیکن اپنی کوشش میں ناکام رہا تو گھبرا گیا۔

سوای نے کریمہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”بھانگنا چاہتا ہے تو سن کہ تیری شکتی میرے سامنے کام نہیں کرے گی۔ اب بھی سے ہے، بھوانی کی ہے بول دے ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے ترشول میری گردن پر رکھ دیا۔ ”بول بھوانی دیوی کی ہے ورنہ ابھی ترشول تیری گردن میں اتار دوں گا۔“ میں جو سچے دل سے توبہ کر چکا تھا، سوچا کہ چاہے میری جان چلی جائے، کلمہ کفر زبان پر نہیں لاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کلمہ شادت پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

☆=====☆=====☆

اپنی زندگی سے میں باپس ہو چکا تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ جنات کے عالم ہاموس نے مجھے بدی کی قوتوں سے نمٹنے کے لئے ایک وظیفہ تعلیم کیا تھا۔ اس کے الفاظ مجھے یاد تھے۔ یہ آزمودہ وظیفہ تھا۔ ایک مرتبہ یہی وظیفہ پڑھنے سے میری جان بچ چکی تھی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں نے وہی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وظیفے کے آخری الفاظ ادا کرنے کے ساتھ ہی میں نے سوای اوم پرکاش کی تیز چیخ سنی اور آنکھیں کھول دیں۔

سوای اوم پرکاش کی لمبی داڑھی اور سر کے بڑے بڑے بالوں میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ چیختا ہوا بھاگا اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ میرے سامنے قریب ہی سو رہے تھے، اتنی چیخ و پکار کے باوجود ان میں سے کوئی نہیں جاگا تھا۔

وقت کا پیسہ گردش کرتا رہا اور قرب و جوار کے علاقوں میں میری دھاک بیٹھتی چلی گئی۔ میرا نام سنتے ہی ظالم زمینداروں، سود خوروں اور اجارہ داروں کے دل کانپ جاتے۔ ایسے لوگوں نے نقدی اور زیورات گھر میں رکھنا چھوڑ دیئے۔ غریبوں کو تنگ کرنے والے سنجوس مالدار اب نرم پڑنے لگے تھے۔

قرض اور سود کے مارے ہوئے کسانوں کی زمین چھینتے ہوئے زمینداروں کو اب سوچنا پڑتا، اگر مجھے علم ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ میں، کسان کو زمین واپس کر دوں گا بلکہ ان کی دولت بھی لوٹ لے جاؤں گا۔ جن باتوں سے مالدار ڈرتے تھے، انہی باتوں کی وجہ سے غریب میری عزت کرتے تھے۔ وہ کہتے، اب تک ہمارے ساتھ نا انصافی ہوتی تھی تو کورٹ پکھری میں برسوں کے بعد کہیں سنوائی ہوتی تھی لیکن اب تو وجہ کو خبر ہوئی اور چند ہی دنوں میں فیصلہ ہو گیا۔

اب مجھے اپنی زندگی کا ایک مقصد مل گیا تھا۔ مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے نجات دلاتے ہوئے مجھے بے پناہ خوشی ہوتی، میری روح کو ایک ایسی مسرت حاصل ہوتی جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں مجھے اور میرے ساتھیوں کو آسرا دینے والے نہ ہوں۔ جس رات میں کسی گاؤں میں جاتا، سنانا سا چھا جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ میں کہاں چھپا ہوں۔ لوگ کہتے کہ جب وجہ ہمارے گاؤں میں ہو تو اسے نقصان نہیں پہنچنا چاہئے ورنہ گاؤں کی عزت پر داغ لگ جائے گا۔

میری شہرت و عزت سے اب چند جمل ساز بھی فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ کبھی کبھی میرے نام پر چھوٹی موٹی چوریاں بھی ہو جاتیں۔

دو چار مرتبہ تو میں نے اس قسم کی وارداتوں پر توجہ نہ دی لیکن پھر محسوس کیا کہ ان واقعات کی وجہ سے بدنامی ہو رہی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے نام سے واردات کرنے والے ایک گروہ کو پکڑ کر ایسی عبرت ناک سزا دی کہ پھر کسی نے ایسی ہمت ہی نہیں کی۔

بہت سے افراد میرے گروہ میں شامل ہونے کے آرزو مند تھے۔ میں ایسے افراد کو بلاتا اور انہیں کوئی پر پرکھتا۔ اگر آدمی مجھے مناسب اور معقول معلوم ہوتا تو میں کہتا۔ ”پہلے تم چھ مہینے ہمارے لئے اطلاعات پہنچانے کا کام کرو، آس پاس کے دیہات میں ڈاکا ڈالنے کے لائق مقامات کے پتے بتاتے رہو اور پولیس پر نگاہ رکھ کر ہمیں رپورٹ دو۔ اگر اس کوئی میں کامیاب ہوئے تو ہم تمہیں اپنے گروہ میں شامل کر لیں گے۔“

میں نے اس طرح کے پندرہ آدمی پورے امر ترس ضلع میں جگہ جگہ متعین کر رکھے تھے جو آگے چل کر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

ہر قدم میں بڑی ہوشیاری سے اٹھاتا۔ میں اپنے مخبروں پر بھروسہ کرنے سے پہلے ان کی ایمانداری کو پوری طرح پرکھ لیتا۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں مجھے علم تھا کہ ڈاکو بننے والے لوگ تھوڑی سی کامیابی کے بعد ہی ہلک جاتے ہیں، ان میں بے پروائی آ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔ میں اسی وجہ سے غلط اطلاع دینے والے پر قطعی رحم نہیں کرتا تھا۔

نئے کار توس، ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدنے کے لئے مجھے پیسے کی ضرورت تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب بھی پولیس سے ٹکرائے ہوئی کار توس اور ہتھیار بڑی تعداد میں درکار ہوں گے۔ چند پستولوں کی بھی ضرورت تھی کیوں کہ گھڑ سواری کرتے ہوئے نشانے بازی کرنے کے لئے راکٹل سے زیادہ پستول کار آمد ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ تین چار ہزار روپوں کی فوری ضرورت تھی۔ انہی دنوں مجھے اطلاع ملی کہ مادھوپور

کے ایک سنجوس سکھ کے گھر سے کافی مال مل سکتا ہے۔ میں نے اس کے گھر ڈاکا ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے ہری کو بھیجا لیکن سکھ سے ملاقات نہ ہو سکی چنانچہ بغیر اطلاع کے ڈاکا ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔

رات کا ایک بج رہا تھا جب ہم مادھوپور اس سکھ کے گھر کے پاس اپنے گھوڑوں سے اترے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک کتے نے بھونکنے شروع کیا تو ہری نے رولی کا کلزا پھینک کر اسے خاموش کر دیا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ میں دھیمی آواز سے بولا۔
”دروازہ کھولو۔“

پھر بھی جواب نہیں ملا۔ اتنی دیر میں شکر نے گھر کے آس پاس گھوم کر جائزہ لے لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اگر وہ واقعی بت سنجوس ہے تو اس وقت دروازہ کھولنے کا خطرہ کبھی مول نہ لے گا۔ میرا خیال ہے، ہم دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جائیں۔“

ہری نے اپنے گھوڑے کو دیوار کے پاس کھڑا کیا۔ شکر اس پر چڑھ کر اور دیوار پھلانگ کر گھر میں کود گیا۔ اس کے باوجود گھر میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ ہری بھی اندر پہنچ گیا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ہم سب گھوڑوں سمیت اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

ہم سب نے رانٹھلیں ہاتھ میں لیں اور اوپری منزل پر پہنچ گئے، مگر وہاں بھی جالی والا دروازہ بند تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے جالی سے بیڑی کی روشنی اندر چھینکی۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹے بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں نے ڈانٹا۔ ”خاموشی سے دروازہ کھول دو ورنہ خیریت نہیں۔ میں سب کو مار ڈالوں گا۔“ دھمکی کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا مارا۔ دوسرا اور پھر تیسرا دھکا لگنے سے دروازہ ٹوٹ گیا۔

ہم پانچوں ساتھی اندر داخل ہوئے۔ دیکھا تو ایک بوڑھا، ایک بڑھیا اور تقریباً سات سالہ بچہ ایک دوسرے سے چپے ہوئے کانپ رہے تھے۔
مجھے اس وقت اتنا غصہ تھا کہ اگر وہاں کوئی جوان ہوتا تو اس کا بھرکس نکال دیتا لیکن بوڑھے اور بچے کو دیکھ کر میں غصہ پی گیا۔

”جو کچھ ہے نکالو۔“ میں نے بوڑھے پر رانٹھل تان لی۔
بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ اتنی شدت سے کانپ رہے تھے کہ کوشش کے باوجود شاید وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ جب میں نے رانٹھل کی ٹال اس کے شانے میں چھوئی تو بولا۔ ”گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

بڑھیا، بچے کے منہ کو ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی۔ بچہ خوفزدہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔
میں نے بڑھیا کو دھمکایا۔ ”بڑھیا! ہمیں پتا ہے کہ اس گھر میں کافی مال ہے۔ تم لوگ ہمیں

دوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو ورنہ.....“

اس موقع پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے منہ پر بڑھیا کا ہاتھ تھا۔ اس دوران شکر اور ہری برابر کے کمرے میں گھوم آئے لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ رگھویر اور موہن مکان کے پچھلے حصے میں دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔
بوڑھا بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ”گھر میں کچھ نہیں۔ کیوں ہم غریبوں کو تنگ کرتے ہو؟“ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ میں نے بوڑھے کی پہلی میں ایک گھونسا جمایا اور بولا۔ ”جھوٹے، غریب بن رہا ہے۔ اگر مجھے اطلاع دینے والا جھوٹا ہے تو میں اس کی زبان کاٹ دوں گا لیکن اس سے پہلے تجھے ضرور سبق سکھاؤں گا۔ سنجوس کہیں کے۔“ پھر میں نے ہری سے کہا۔ ”ایک کرسی لے آؤ۔“ اس کے بعد بوڑھے کو پکڑ کر میں نے برابر پڑی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا، اسی کے ساتھ تاکید کی۔ ”اگر تم تینوں میں سے کسی نے آواز نکالی تو ہماری رانٹھلیں بھی چیخ اٹھیں گی۔“

ہری اور شکر نے بوڑھے کو چارپائی سے کس کر باندھ دیا۔ بڑھیا سسکتی ہوئی اس منظر کو دیکھتی رہی۔ اب بچہ بھی رونے لگا تھا۔

”ہری! چارپائی کے نیچے آگ جلا دے۔ دیکھتا ہوں بوڑھا کب تک سچ نہیں بولتا۔“ میں نے حکم دیا۔

کھوئی پر سے ہری نے بوڑھے کا صافہ اتارا اور چارپائی کے نیچے رکھا، پھر جلتی ہوئی لالہین سے تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ فوراً ہی شعلے اٹھنے لگے اور بوڑھے کی پیٹھ جلنے لگی۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ پھر بھی اس کی زبان پر وہ بات نہ آئی جو میں سننا چاہتا تھا۔

اب میں شدید غصے میں بیچ اٹھا۔ ”بڑھے! اب بھی بتا دے مال کہاں ہے ورنہ اسی طرح تجھے زندہ جلا کر مار ڈالوں گا۔“

بڑھیا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ بول اٹھی۔ ”اب بتا دو نا۔“
مجھے یہی چاہئے تھا۔ میں نے ہری کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً بوٹ سے آگ بجھا دی لیکن بڑھا اب بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ”تم چاہے مجھے مار ڈالو لیکن اس گھر سے کچھ نہیں ملے گا۔“

میں نے کمر کی بیلٹ میں لگا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بوڑھا جان دے دے گا لیکن مال نہیں دے گا۔ میری نگاہ بچے پر پڑی میں نے سوچا، کسی ترکیب کے بغیر بڑھا زبان نہیں کھولے گا۔ بچے کو میں نے گردن سے پکڑ کر اٹھالیا اور ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر خنجر والا ہاتھ اونچا کیا۔ بڑھیا کی چیخ نکلتے ہی دالی تھی کہ ہری نے اس کا منہ دبا دیا۔ بڑھیا اس کے ہاتھوں میں جمول گئی۔

”بڑھے! اگر تو چاہتا ہے کہ اس معصوم کی جان میرے ہاتھ سے نہ جائے تو بتا دے مال کہاں ہے؟“ میں سخت لہجے میں بڑھے سے مخاطب ہوا۔ پھر میں نے ہاتھ کو اس طرح جھکا دیا کہ جیسے میں واقعی بچے کو قتل کرنے والا ہوں حالانکہ میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا۔

لڑکی کا گلا رندہ گیا۔

”اوپر جو زیورات اور روپیہ ایک دیوار میں چھپا ہوا تھا کیا وہ تیری شادی کے لئے.....“ میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

لڑکی نے کہا: ”ہاں“ مجھے سب بد نصیب کئے گئے تھے اس لئے میری شادی کی خاطر زیادہ چیز کی ضرورت تھی۔“ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ تین روز بعد اس کی شادی تھی۔

میں نے راتقل شانے پر لٹکائی اور دایاں ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھ دیا۔ ”تو نے وجے کو بھائی کہا ہے نا“ اب وجے بھی اس نائے کو پوری طرح بھائے گا۔ چل آ میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر میں تیز قدموں سے پھر اوپر لوٹ گیا۔ میرے ساتھی مجھے فوراً واپس آ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”کیوں کیا ہوا، کوئی خطرہ ہے کیا؟“ ہری نے پوچھا۔

جواب میں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر میں بولا۔ ”ان دونوں کے منہ کھول دو“ بڑھے کے منہ پر پانی ڈال کر اسے جلدی ہوش میں لاؤ۔“ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ”یہ بڑھا جو زبان نہیں کھول رہا تھا، اس کا سبب کجوسی نہیں تھی بلکہ گھر میں تین دن بعد ہونے والی شادی تھی۔“

اسی عرصے میں لڑکی ہاتھ میں مٹھائی کی تھالی لئے اوپر آ گئی۔

”دوستو! اس نے مجھے بھائی کہا ہے۔ اب ہم اس گھر کی کسی چیز کو نہیں چھو سکتے۔ ہری! سارا مال واپس کر دے۔“ میں بولا۔

بچہ دوڑ کر لڑکی سے لپٹ گیا۔ بڑھا، بڑھے کو جھنجھوڑنے لگی۔ ”ارے دیکھو، یہ لوگ سب مال واپس کر رہے ہیں۔ کلدیپ کو وجے نے بہن بنا لیا ہے۔“

بڑھے نے آنکھیں کھولیں تو یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میرے ساتھیوں کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔

میں نے کلدیپ کے ہاتھ سے تھالی لے کر مٹھائی ایک کپڑے میں ڈالی اور بولا۔ ”یہ میری بہن کی شادی کی مٹھائی ہے۔ چلو، اب ہم چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی میرے چاروں دوست بھی ہم قدم تھے۔

اس لڑکی کلدیپ کو میں نے بہن کہا تھا۔ دوسری ہی رات میں نے ایک بہت بڑا ہاتھ مارا۔ اس واقعے کے تیسرے دن میں نے ایک مخبر کے ذریعے پانچ سو روپے نقد اور پانچ جوڑے بیجیہ۔ انہی کے ساتھ پانچ گھوڑے اور پانچ بھینسیں بھی میں نے کلدیپ کے جیز کے لئے بھیجی تھیں۔

بعد میں مجھے اپنے مخبر کے ذریعے معلوم ہوا کہ کلدیپ نے مجھے جھولی پھیلا کر دعا دی تھی۔ جب یہ بات مادھوپور گاؤں میں پھیلی تو لوگ حیرت سے کہنے لگے کہ کیا واقعی وجے ڈاکو ہے؟ اس واقعے کے بعد میرے دل کو ایک عجیب سی راحت اور سکون محسوس ہوا۔

☆=====☆

کافی سوچ بچار کے باوجود اب تک میں اپنی محبوبہ گلشلا کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا

یہ دیکھتے ہی بڑھا بول اٹھا۔ ”اس معصوم کو مت مارنا“ میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔“
بوڑھے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ بوڑھے نے بتا دیا کہ سارا مال و متاع اس نے ایک دیوار میں چن رکھا ہے۔

مال نکالنے کے لئے دیوار میں کئی شکاف کرنے پڑے تو دیوار سے زیورات کی ایک اور نقدی کی دو پوٹلیاں برآمد ہوئیں۔ بوڑھے کو کھول دیا گیا تھا۔

بڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مال ہمارے حوالے کیا اور چکرا کر بے ہوش ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔

”میں نیچے جا کر معلوم کرتا ہوں راستہ صاف ہے کہ نہیں۔ اس وقت تک تم بڑھیا اور لڑکے کے منہ بند رکھو۔ جب میں سین بیجاؤں تو انہیں کمرے میں بند کر کے نیچے آ جانا۔“ اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید کر کے میں آہستہ قدموں سے بیڑھیاں اترنے لگا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اب چاند کی روشنی بھی بڑھ گئی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وقت کافی گزر چکا ہے اس لئے جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ مادھوپور سے ہمیں دس بارہ میل دور جانا تھا۔

آس پاس نگاہ دوڑاتے ہوئے میں نے آخری بیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ کسی کو کہتے سنا۔ ”دیر جی!“

یہ سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ سنان رات میں اس دھیمی، میٹھی اور نرم آواز نے میرے دل کو جیسے چھو لیا تھا۔ آواز کیوں کہ نسوانی تھی اس لئے مجھے حیرت بھی ہوئی۔ پھر بھی عادت کے مطابق میری انگلی راتقل کی لہلی پر آ گئی۔

”کون ہے؟“ میں نے دھیمی لیکن مستحکم آواز میں دریافت کیا۔

اسی وقت ایک نوجوان لڑکی سامنے آ گئی۔ اس کی بادی آنکھوں سے معصومیت اور بے خونی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جس میں طرح طرح کی مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میں لڑکی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ بولی۔ ”دیر جی! جانے سے پہلے منہ میٹھا کرتے جاؤ۔“

ڈاکو بننے کے بعد آج پہلی مرتبہ کسی عورت نے مجھے دیر، یعنی بھائی کہہ کر پکارا تھا۔ یہ سن کر میرا پتھر سادل پھول بن گیا۔ میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان سامنڈ آیا۔ لڑکی نے جب ہاتھ بڑھا کر تھالی میرے سامنے کی تو میں نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ اسی وقت میری نگاہ لڑکی کے منہ کی گئی

”بہن! کیا تیری شادی ہونے والی ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

لڑکی نے آہستہ سے سر ہلا کر نظریں جھکا لیں۔

”اوپر جو بڑھا اور بڑھیا ہیں، کیا وہ تیرے ماں باپ ہیں؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”وہ میرے دادا اور دادی ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرے باپ کا دو سال پہلے ہی سے انتقال ہو گیا تھا۔ ماں اس کے بعد پاگل ہو گئی۔ گئے سال وہ بھی ایک کنویں میں گر کر مر گئی۔“ یہ کہتے ہوئے

تھا۔ اسی دوران میری زندگی نے ایک اور غمی کروٹ لی۔ ہوا یہ کہ وجے کے ماں باپ کی خیریت جاننے کے لئے میں نے اپنے تصور کی پراسرار قوت آزمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں 'پولیس' کے گھنٹیا حروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ قانون کے کسی باغی پر دباؤ ڈالنے کے لئے پولیس عموماً اس کے قریبی عزیز و اقارب کو بھی تنگ کرتی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیسے مایا کو اور سوہن سنگھ کے ساتھ بھی تو ایسا نہیں ہو رہا۔

معلوم ہوا کہ پولیس ان کے گھر کی نگرانی کر رہی تھی۔ یہ جاننے کی خاطر انہیں تنگ تو نہیں کیا جا رہا، میں نے ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو ایک اور ہی عقدہ کھلا۔ مایا کو اپنے شوہر کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ دودھیا گاؤں جا کر وجے کا رشتہ ختم کر آئے۔

”کل چلا جاؤں گا، جلدی کیا ہے۔“ سوہن سنگھ نے جواب دیا۔

”کل کل کر کے تم نے کتنے دن گزار دیئے۔ بیساکھ بھی آگیا۔ ایک بات جو ہونی ہے تو طے ہو ہی جائے تاکہ اس بے چاری سروج کا کیس اور ٹھکانہ ہو جائے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم خود ہی اس کا کوئی دوسرا اچھا سا رشتہ کرا دیں تو بہتر ہو۔ بھگوان اسے سکھی رکھے۔“ مایا کو نے کہا۔ پھر سوہن سنگھ چپ رہا تو وہ بولی۔ ”آج شام تک تم سوجھی کے یہاں نہیں گئے تو مجھ پر اناج کا دانہ حرام ہے۔“ یہ کہہ کر گویا مایا کو نے اپنے شوہر پر مزید دباؤ ڈالا۔

”جیسی تمہاری مرضی، میں شام کو روانہ ہو جاؤں گا۔“ سوہن سنگھ کو آخر کہنا ہی پڑا۔

نانک پور کے دوران قیام ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وجے سے سروج کی منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ دونوں کے باپ پولیس کے محکمے میں رہے تھے۔ نوکری کے دنوں میں وہ برسوں ایک ساتھ رہے تھے۔ اس وقت وجے کی عمر چھ سال تھی اور سروج دو ڈھائی سال کی ہو گئی۔ دونوں گھروں کے درمیان تعلقات بڑھتے رہے۔ ان تعلقات کو مزید بڑھانے کے لئے دونوں کے بزرگوں نے وجے اور سروج کی منگنی کر دی۔ پھر سوہن سنگھ نانک پور چلا آیا۔ وجے بھی اس کے ساتھ تھا۔

خاندانی حالات کے پیش نظر وجے اپنے نانا کے گھر چلا بڑھا۔ سروج کے باپ بشن سنگھ کو جب اطلاع ملی کہ وجے اب نانک پور واپس آ گیا ہے تو اس نے سوہن سنگھ سے کہلوایا، لڑکی اب شاید کے قابل ہو گئی ہے، برات لے کر آؤ تو اس کے ہاتھ پہلے کر دیں لیکن قسمت کچھ اور ہی کھیل کھیل رہی تھی۔ میں اس وقت تک وجے کے جسم پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ سروج کے ہاتھ پہلے ہوتے میں نے انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ سرخ کر لئے۔ بشن سنگھ نے جب یہ سنا تو خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

شام کو جب سوہن سنگھ گھر سے روانہ ہو کر دودھیا گاؤں میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت بڑا بوجھ بھی تھا جس کی بنا پر اس کا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا۔ یہ تھی اس کے شانے پر رکھی ہوئی وہ پوٹلی جس میں وجے اور سروج کے شگون کے پانچ روپے، چاول، بادام، کنکھش اور پانچ کٹڑے سپاری کے بندھے ہوئے تھے۔ وجے کی ماں مایا کو نے اتنے برسوں تک ان چیزوں کو بڑے شوق اور چاؤ سے منبھال کر رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس پوٹلی میں ہماری آنے والی لسوں کا بیج ہے لیکن میری وجہ سے حالات

ایسے بدلے کہ سوہن سنگھ آج وہی پوٹلی واپس کرنے آیا تھا۔

پھر بشن سنگھ کا گھر آ گیا اور اسی کے ساتھ میرے رگ و پے میں لبو کی گردش تیز ہو گئی۔ بڑی بڑی ہرنیوں جیسی بھولی آنکھوں والی وہ نوجوان لڑکی بے حد حسین تھی۔ ہری ساڑھی میں اس کا ہرا ہرا موج موج بدن قیامت ڈھا رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت ایسی تھی جیسے دودھ شد آپس میں ملے ہوں۔ ستواں ہانک، ہلالی ابرو، کتالی چہرہ، ابھرے ابھرے سرخ ہونٹ، پھول سے رخسار، یہ تھی سروج۔ کاش میں نے اسے پہلے دیکھا ہوتا۔ سادوں کی گھٹا اس کے دونوں شانوں پر بالوں کی صورت میں مجھوم رہی تھی۔ نرمس اور سریتا ہی کی طرح اس کا حسن بھی مثالی تھا۔ مجھے بڑا رنج ہوا کہ وجے، یعنی میرا رشتہ اس سے توڑا جائے والا تھا۔

سوہن سنگھ کو آتا دیکھ کر بھینس کا دودھ دوہتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ ساڑھی کا آنچل منبھالتی ہوئی وہ دوڑ کر گھر میں گئی اور میں نے اس کی آواز پہلی مرتبہ سنی۔ اس کے جسم کی طرح اس کی آواز بھی نشیلی تھی۔ ”باپو! نانک پور سے آیا آئے ہیں۔“

بشن سنگھ، بیٹی کی آواز سننے ہی اٹھا اور چارپائی پر نئی چادر بچھائی، پھر آنگن میں آکر سوہن سنگھ کو گلے لگا لیا، پھر کہا۔ ”پہلے سے کہلویا ہوتا تو گاڑی بھجوا دیتا۔“

”کئی روز سے آنے کی کر رہا تھا لیکن آنہ سکا۔ آج تمہاری سوجھی نے اصرار کر کے مجھے مجبور کر ہی دیا۔“

”بھائی کیسی ہیں؟“ بشن سنگھ نے پوچھا۔

اسی وقت سروج نے آکر سوہن سنگھ کے پیروں چومے اور پھر لسی لینے اندر چلی گئی۔ سوہن سنگھ نے بشن سنگھ کو اپنی بیوی کی خیریت سے آگاہ کیا۔

”ہمارے داماد کے بارے میں کیا خبر ہے؟“ بشن سنگھ نے سوال کیا۔

سوہن سنگھ اس سوال پر چونکا، پھر جواب دیا۔ ”جو خبریں باہر سے آتی ہیں، ہم بھی سن لیتے ہیں۔“

”ہاں، باہر کی خبریں تو ہم بھی رکھتے ہیں۔ ہماری سروج، وجے کی روز نئی خبریں لاتی ہے۔ جب وہ کنویں سے پانی بھر کے لوٹی ہے تو ساری باتیں جو اس کی ملنے والیوں نے سنائی ہوتی ہیں، ہمیں آکر بتاتی ہے کہ آج کہاں ڈاکا پڑا، آج وجے کو کہاں وجے (فج) ملی، آج کس کسان کی خاطر وجے نے کس زمیندار کو دھمکی دے دی۔“

سوہن سنگھ بہت غور سے بشن سنگھ کی باتیں سن رہا تھا۔ سروج لسی کا گھاس دے کر چلی گئی۔ اس کے رخساروں پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ سوہن سنگھ نے ایک سرد آہ بھری۔ یقیناً اسے بھی رشتہ توڑنے پر بے حد رنج تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہو۔ بڑی دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر ہمت کر کے شانے پر لٹکی ہوئی پوٹلی اتاری اور بشن سنگھ کے سامنے رکھ دی۔

”کیا لے آئے بھائی صاحب؟ کیا میری بیٹی کے لئے ساس نے کوئی تحفہ بھجوایا ہے؟“ بشن سنگھ نے

ہتے ہوئے یہ الفاظ زور سے ادا کئے۔

سروج کے بڑھتے ہوئے قدم دروازے پر رک گئے۔ وہ دروازے کی آڑ لے کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب کچھ اور سرخ ہو گئے تھے۔

بشن نے بڑے شوق سے پوٹلی کھولی لیکن پوٹلی کے کھولتے ہی وہ گم سم ہو گیا۔ خاموشی محسوس کر کے سروج نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا، مگر پوٹلی اس کے احاطہ نگاہ سے باہر تھی۔ پھر چند لمبے بعد بشن کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے آئی۔ ”سوہن سنگھ جی! یہ سب کیا ہے؟“

سوہن گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ شاید اس میں بشن سے نظرس ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”بشن! تمہاری بھالی نے شگون واپس کر دیئے ہیں۔“ پھر وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”دیکھو بشن سنگھ! میں جانتا ہوں تمہیں یہ بات بڑی گئی ہو گی، گنتی بھی چاہئے۔ تمہاری یہ شرافت ہی تھی کہ اب تک اپنی زبان کا پاس کیا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دجے کے ڈاکو بننے ہی معنی توڑ دیتا، مگر ہمارا رشتہ دوستی کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ سروج تمہاری ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔ وجہ کی ماں کو گھر میں بھولانے کا کتنا زیادہ ارمان تھا لیکن.....“ سوہن سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اس نے گاڑی سے چہرہ پونچھنے کے بہانے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور بولا۔ ”ہمارا ایک ہی بیٹا زندہ رہ گیا ہے۔ اس کے بیاہ کا کیا کیا ارمان ہمیں نہ ہو گا لیکن اس نے جو راستہ اختیار کر لیا ہے، اس کا انجام بھی ہم جانتے ہیں۔“

”کیا شگون واپس کرنے کے لئے دجے نے کھلوا یا ہے؟“ بشن نے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں“ اسے تو اس کا خیال بھی نہیں آیا ہو گا۔ وہ ایک مرتبہ جانے کے بعد ہم سے ملنے بھی نہیں آیا۔ تمہاری بھالی کہتی ہے کہ اب گھر میں بھولانے سے کیا حاصل۔ کسی معصوم کو بیوہ بنانے کے لئے اسے ہم اپنی ہو کیوں بنائیں۔ اس معصوم کی کیا خطا ہے؟“ کچھ دیر خاموشی کے بعد سوہن پھر بولا۔ ”میں یہاں آنے پر راضی نہیں تھا، مگر دجے کی ماں نہیں مانی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں دو چار دن یہاں رک کر لوٹوں اور اس عرصے میں کہیں اور سروج کا اچھا سا رشتہ کر کے آؤں۔“

آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بشن نے پوٹلی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سروج تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں اتنی دیر میں سرخ ہو گئی تھیں، ہاتھ پر پینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔ ”نصرو باپو!“ پھر وہ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے سوہن سنگھ کے روبرو آکر بولی۔ ”نیا جی! اب سروج کو آپ کے گھر کے سوا کوئی اور گھر نہیں چاہئے۔ جس سانس نے میرا اتنا انتظار اور خیال کیا ہے، مجھے بھی اس کے بڑھاپے کی فکر ہے۔ ٹھیک ہے، مجھے شوہر کا پیار اور سکھ نہ ملے تو نہ سہی لیکن آپ کو اور ماں جی کو کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے پوٹلی، سوہن سنگھ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کے بیٹے کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس سے کھلوا دیجئے کہ جب بھی فرصت ملے گھوڑے پر چڑھ کر ایک بار میرے پاس آجائے“ میں اس کے گلے میں در ملا پستا دوں گی۔ پھر چاہے وہ اسی وقت جہاں جانا چاہے، چلا جائے۔ یہ میرا فیصلہ

ہے کہ سوہن کر رہوں یا بیوہ بن کر رہوں گی اسی گھر میں۔“ سروج نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں یہ سب کچھ کہا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ دونوں بوڑھے اس کنواری دلیر خیار کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ پھر سوہن سنگھ کھانا کھا کر واپسی کے لئے تیار ہو گیا۔

سروج نے آکر اس کے پیچھے چھوئے، پھر جلدی سے رسی کا ایک ٹکڑا سر کو دیتے ہوئے بولی۔ ”تایا جی! یہ میری کلائی کا ٹاپ ہے۔ ماں جی سے کہئے گا کہ سوہا جی (خوش قسمتی) نشانی کے طور پر دو ٹکٹن بھوا کر ابھی سے رکھ لیں، موقع پر کام آئیں گے۔ کیا جانے انہیں کب میرے گھر آنے کا موقع مل جائے اور اس کی فوری ضرورت پڑ جائے۔“ سروج یہ کہہ کر خود ہی شرما گئی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو ساڑھی کے آچل کی آڑ میں کر کے کھڑی ہو گئی۔

سوہن سنگھ نے لاج سے دہری ہوتی سروج کو دیکھا اور رسی کا ٹکڑا احتیاط سے جبب میں رکھتے ہوئے دعا دی۔ ”سدا ساگن رہے بیٹی!“ چلتے وقت اس نے بشن سنگھ سے کہا۔ ”تم دونوں باپ بیٹی نے میری اور میرے خاندان کی جو عزت رکھی، اسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اب مجھے ایسا جان پڑتا ہے بشن سنگھ کہ ہمارا خاندان آگے چل پڑے گا۔ میں جانتے ہی کسی صورت بھی دجے کو سروج کا یہ پیغام بھجوا دوں گا کہ وہ ایک بار گھوڑے پر چڑھ کر تمہارے دروازے تک آئے تاکہ ہم ہو کو دواغ کرالیں۔“

پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے پٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب مزید کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سروج کو دیکھ کر رشتہ ٹوٹنے پر مجھے جو ملال ہو رہا تھا، وہ خوشی میں بدل گیا۔ اس کا سبب خود سروج ہی تھی۔ اس کے دلیرانہ اقدام نے میری ہار کو جیت میں بدل دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ سوہن سنگھ کسی صورت پیغام بھیجنے کے لئے مجھ سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ میں نے اسی لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے پر میرے دو جاں نثار ساتھیوں ہری اور شکر کو عمل کرنا تھا۔ منصوبہ بناتے ہوئے میں نے یہ خیال بھی رکھا تھا کہ سوہن سنگھ کے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے۔ منصوبہ بنانے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو اس سے آگاہ کیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق شکر اور ہری، ناک پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ ساتھیوں کو میں نے یہی بتایا تھا کہ اس طرح میں اپنے والدین کی خیریت لینا چاہتا ہوں۔

میرے اندازے کے مطابق جب ہری اور شکر، ناک پور پہنچ گئے تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں انہیں خطرے میں بھیج کر ان کی طرف سے غافل رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے تصور کی پراسرار قوت آنکھیں بند کرتے ہی متحرک ہو گئی۔

میں نے سوہن سنگھ کے گھر کے پاس ایک بیل گاڑی کو رکتے دیکھا۔ گاڑی میں ایک مرد کے ساتھ بزرگ پوش عورت بھی تھی۔ مرد نے بیل گاڑی سے عورت کو اتار کر اس کا ایک پیسہ اٹک کیا۔ پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوا جو بڑی دیر سے وہیں آس پاس گھوم رہا تھا۔ ”بھائی! ہمیں یہاں سے پانچ چھ میل آگے جانا ہے۔ میری گاڑی کا پیسہ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں قریب میں کوئی لوہار ہو گا؟“

مخاطب کئے جانے والے شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں! ہائیں ہاتھ کی گلی میں لوہار کی ایک دکان ہے۔“ وہ شخص مجھے سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہی معلوم ہوا۔

مرد نے یہ سن کر آگے قدم بڑھائے، لیکن کچھ خیال آتے ہی فوراً مڑا اور اسی شخص سے پوچھا۔ ”اتنی دیر کے لئے میری بیوی کو یہاں کہیں آسرا مل جائے گا کیا؟“ پھر اس نے سوہن سنگھ کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس کے دروازے پر میں نے ابھی ایک بڑھیا کو دیکھا تھا جو دروازہ بند کر رہی تھی۔ اگر یہ لوگ قابل اعتماد ہوں تو میں اپنی بیوی کو یہاں چھوڑ دوں؟ پیسہ ٹھیک کرا کے میں ابھی لوٹ آؤں گا۔“

”میاں جی! اس گاؤں میں تو سارے ہی ایسے لوگ ہیں۔ آدھے پونے گھنٹے میں تمہاری بیوی کو کوئی اغوا نہیں کر لے گا، پہنچا دو اندر۔“

نیل گاڑی والے نے یہ سن کر سوہن سنگھ کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ دروازہ دھکے کی مار لگا کر کھولا۔ نیل گاڑی والا اس سے بولا۔ ”ماں جی! میری نیل گاڑی کا پیسہ خراب ہو گیا ہے، اسے ٹھیک کرانے جا رہا ہوں۔ اتنی دیر تک میری بیوی کو اگر آپ کے گھر میں سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو احسان مانوں گا۔“

دھکے کی مار نے انجینی کی بات سنتے ہی پورا دروازہ کھول دیا اور کہا۔ ”احسان کی کیا بات ہے بھائی! اپنی بیوی کو اندر بھیج دو۔ اتنی تیز دھوپ میں تو وہ بے چاری برفے میں اور بھی پسینے پسینے ہو گئی ہو گی۔“ اس کے لہجے میں ہمدردی اور خلوص کی جھلک تھی۔

برقعے والی گھر میں آگئی۔ سوہن سنگھ برفے والی کو گھر میں دیکھ کر پردے کے خیال سے باہر جانے لگا تو برفے والی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ سوہن گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مایا کو ابھی حیران ہو گئی لیکن اسی لمحے عورت نے نقاب الٹ دی۔

مایا کو اور سوہن سنگھ حیرت زدہ رہ گئے۔ برفے میں بڑی بڑی مونچھوں والا ہری تھا۔ حیرت کے بعد دھکے کے والدین اپنی ہنسی روکنے لگے۔ سوہن سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر وہ تینوں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر پہنچتے ہی مایا کو بول اٹھی۔ ”ہری بیٹے! پہلے یہ بتا میرا دھکے کیا ہے؟“

”ارے ماں جی! میرے بارے چند ہی دنوں میں جو نام پیدا کیا ہے، جو عزت بنائی ہے، وہ سارا پنجاب کبھی نہ بھلا سکے گا۔ وہ جہاں جاتا ہے لوگ مسلمانوں کی طرح اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مقابلے پر آنے والا اس کی ایک ہی بڑھک سن کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے، گولی چلانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ غریب لوگ تو اسے اپنا بلی اور رکھوالا سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب کسی غریب کی بیٹی جیز نہ ہونے کی وجہ سے کنواری نہیں بیٹھی رہتی۔ جیز کا انتظام اپنا دھکے کر دیتا ہے۔“ ہری نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔

مایا کو ابھی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ”میں نے ہمیشہ اسے برا بھلا ہی کہا تھا لیکن اس نے ڈاکو بن کر بھی خاندانی شرافت نہیں چھوڑی۔“

”مجھے دھکے نے آپ کی خیریت معلوم کرنے بھیجا ہے۔“ ہری نے کہا۔ ”اس نے کھلویا ہے کہ میں ایک بار آؤں گا اور بڑی فرصت سے آؤں گا۔“

مایا کو نے ہری کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہنے لگی۔ ”بیٹے! جن آنکھوں سے تو روز دھکے کو دیکھتا ہے، مجھے بھی ان میں جھانک لینے دے۔ اسی طرح شاید سکون مل جائے۔ اس سے کہہ دینا کہ یہاں آکر جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں اور تو بھی دوبارہ اس طرح یہاں مت آ۔ پولیس والوں کی نگاہیں ہر وقت اسی گھر پر رہتی ہیں۔“

”ارے بھانگوان! ہری اس وقت تو بڑے موقع پر آ گیا ہے۔ اس کے ہاتھ دھکے کو پیغام بھجوا دیجئے ہیں۔“ سوہن سنگھ نے جلدی سے کہا۔

پھر سوہن سنگھ نے ہری کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور کانوں سے سنا تھا۔ سوہن سنگھ کے خاموش ہوتے ہی مایا کو بولی۔ ”ہاں ہری! دھکے سے کہنا کہ اب وہی اپنی ماں کے قول کا پاس رکھنے والا ہے، بغیر وقت گموائے جلد سے جلد سرج کو بیاہنے کے لئے آجائے۔“

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ باہر فٹک کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے ظالم! تو نے ڈاکو کا گھر بتا دیا۔ میری بیوی کو اگر پتا چلا ہو گا کہ یہ دھکے کا گھر ہے تو وہ ڈر کے مارے مر ہی گئی ہو گی۔ اللہ کے بندے! تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“

ہری نے یہ سن کر دھکے کے والدین کو مخاطب کیا۔ ”یہ جو میرا میاں بنا ہوا ہے، ہمارا ہی ساتھی فٹک ہے جو دھکے کے ساتھ فوجی وردی میں ایک بار یہاں آ چکا ہے۔ باہر پولیس کا آؤی جو بار بار گھر کے چکر کاٹ رہا تھا، اسے چکر دینے کے لئے خود دھکے نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ دھکے کو پہلے سے معلوم تھا کہ پولیس اس گھر کی نگرانی کر رہی ہو گی۔ گاڑی کا پیسہ بھی ہم نے خود جان بوجھ کر خراب کیا تھا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں بلکہ..... چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ہری دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

فٹک اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”ارے تیرے گھنے دھننے تو سلامت ہیں نا؟..... میرا بھی داغ چل گیا تھا جو ڈاکو کے گھر پہنچے چھوڑ گیا۔ چل جلدی، یہ ڈاکو کا گھر ہے۔“

ہری یہ سن کر تیز تیز چال سے نیل گاڑی تک پہنچا اور اندر بیٹھ گیا۔ نیل گاڑی کا پیسہ لگا ہوا تھا۔ فٹک نے فوراً گاڑی چلا دی۔

جب ہری اور فٹک واپس آ گئے تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہری نے زنانہ لباس میں مردوں والا کام کیا ہے۔“

بسجی میرے ان الفاظ پر ہنس پڑے۔ ہری نے ساری بات بتا دی تو مجھے فکشتا کا خیال آیا اور سوچا، اگر ہری اس کی بھی خیریت لے آتا تو فکشتا کو اطمینان ہو جاتا، مگر میں نے خود ہی ہری سے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔

رگھو دیر نے ساری بات سن کر کہا۔ ”یار دھکے! تجھے بیوی بھی بہادر ملی ہے۔ تو نے حکومت سے بغاوت کی، اس نے غیر ضروری اور روایتی شرم سے بغاوت کر دی اور کچلے عام تجھے اپنانے کا فیصلہ سنا دیا۔“

چل 'آج رات ہی رات لے کر چلتے ہیں۔ سردار کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہئے..... یار! کچھ بول نا' چپ کیوں ہے؟"

"دوستو! میں بڑی الجھن میں گرفتار ہوں۔" میں سنجیدگی سے بولا۔

"کچھ ہمیں بھی تو بتا کہ کیا الجھن ہے وہ۔" موہن نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ "ہم نے جو راہ اختیار کی ہے، اس پر چلتے ہوئے کسی سے شادی کرنا اس کی زندگی کو برباد کرنے کے برابر ہے۔" میں جذبات سے قطع نظر جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ میرے دل کی آواز تھی۔ "پھر بھی میں پہلے سرونج سے ملاقات کروں گا پھر ہم سب مل کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات پریشان کر رہی ہے۔"

دوستوں نے میری پریشانی کی وجہ دریافت کی۔

میری پریشانی کی وجہ کھلتا تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر کھلتا کو گھر میں آسرا دینا پڑا تو کیا سرونج اسے برداشت کر لے گی؟ دوستوں کے سامنے اس مسئلے کو چھیڑنا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اچانک مجھے ایک اور بات یاد آگئی اور میں نے کہا۔ "جب ہم نے بغاوت کی تھی، اس وقت میں نے ایک وعدہ کیا تھا کہ شکر کی محبوبہ سے اسے ضرور ملاؤں گا۔ اگر وہ اب بھی شادی ہونے کے بعد شکر کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو تو اسے شکر کے گھر لانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ میں اسی لئے یہ ذمہ داری پوری کئے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں 'سرونج اور اس کے والدین کو سمجھاؤں گا کہ اگر شادی کرنی ہے تو وہ کچھ دن اور انتظار کر لیں۔"

میں اپنے ساتھیوں کے جذبات کا پوری طرح خیال رکھتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میری شادی کے ذکر پر شکر کو یقیناً اپنی محبوبہ یاد آگئی ہو گی جسے اس کے باپ نے کسی اور سے بیاہ دیا تھا۔ میں نے اس وقت اسی لئے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ میں گروہ کا سردار ہونے کے باوجود ڈاکے میں آئے ہوئے مال کے پانچ حصے کرتا تھا تاکہ ہر ساتھی کے گھر رقم بروقت پہنچ سکے۔

اپنے ساتھیوں کو میں بیش نیکی اور ایمانداری کا سبق دیتا اور کہتا۔ "جب تک ہمارے درمیان مکدورت اور برائی نہیں آئے گی، قدرت ہماری مدد کرتی رہے گی۔"

یہی وجہ تھی کہ ہم پانچوں دوست پانچ پانڈوں کی طرح اتحاد سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی تنگی جھیل لیتے تھے۔

"چلو اب ہم جو گیندر والے ڈاکے کی تیاری کریں۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا۔ "پھر ذیہ کام ختم کر کے میں اور ہری 'دودھیا گاؤں کا چکر لگا آئیں گے۔"

جلد ہی ہم پانچوں ساتھی تیار ہو گئے۔ میں نے چلنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم روانہ ہوئے تو آسمان پر بادلوں کی چادر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے ابھی برکھا رانی بادلوں کی چادر چیر کر اپنے دھرتی دیوتا سے آٹے لے گی۔ پھر اپنے من کی پیاس بجھانے کے لئے دھرتی دیوتا کے قدموں میں گر کر پیار کا وہ گیت گائے گی جسے سن کر دھرتی کے بیٹے اپنے کھیتوں کی طرف دیکھ کر جھوم

اٹھتے ہیں۔

جو گیندر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ اس کے متعلق اطلاعات فراہم ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ دنگ ہونے کے باوجود قابل اعتماد ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی میں نے اس کے امتحان کا فیصلہ کیا۔ جو گیندر نے اطلاع دی تھی کہ اس کے گاؤں میں ایک ہندو سرمائے دار ہے۔ اس کے یہاں ڈاکہ ڈالا جائے تو اچھی دولت ہاتھ لگ سکتی ہے۔

میرا اصول تھا کہ ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا کر بھی، میں آخر وقت تک مخبر کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اچانک ہی میری پابندی حملہ کرنے کے لئے مخبر کو ساتھ لے کر روانہ ہوتی اور کامیاب ڈاکہ ڈال کر واپس ہوتی۔ جو گیندر کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر ہم نے آدھی رات کے بعد ہلا بولا۔ پیواری مال خریدنے کے لئے امر تر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف اس کی ماں اور جوان بیوی موجود تھیں۔ جو گیندر ساتھ تھا۔ اسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی ہم سب تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا جس نے دروازہ کھولا تھا، ہمیں مسلح دیکھ کر کانپنے لگی لیکن اس کی جوان و حسین ہو، جو گیندر پر نظر پڑتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ یقیناً جو گیندر سے واقف تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جو گیندر اس حسین شادی شدہ عورت کو اشاروں اور فحش حرکات کر کے چھیڑتا تھا، نیز اس پر فقرے بھی کستارہتا تھا۔ "پیواری رو! جیسا تیرا نام ہے ویسی ہی تو روپ رنگ میں منفرد ہے۔"

ایک بار جان بوجھ کر وہ روپا سے راستے میں ٹکرا گیا تھا۔ روپا نے غصے میں پھر کر کہا تھا۔ "گاؤں کی بیابانا عورتوں کو ستاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں۔"

جو گیندر دانت پیس کر بولا۔ "اچھا! یہ بات ہے، اب دیکھ میں تجھے کس طرح قابو میں کرتا ہوں۔" وہی جو گیندر ہمیں ساتھ لے کر روپا کے شوہر کی غیر موجودگی میں آدھی رات کو آیا تھا۔

"شوہر بچانے کی ضرورت نہیں۔" میں گرجا۔ "وہ تمہارے گھر ڈاکہ ڈالنے آیا ہے۔" میں نے روپا کے چہرے پر اس وقت اطمینان کی جھلک دیکھی۔ میری یہ شہرت عام تھی کہ نہ میں کسی عورت کو بے آبرو کرتا ہوں نہ کسی کو ایسا کرنے دیتا ہوں۔

رگھو پر اور شکر دروازے کے پاس چوکس کھڑے تھے۔ موہن کے سپرد بڑھیا کو داخل دھکا کر چپ رکھنے کی ذمہ داری تھی۔ میں 'ہری اور جو گیندر اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔ کسی قسم کی مزاحمت کئے بغیر روپا نے تجوری کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ روپا کی گھرائی کا کام جو گیندر نے خود نبھال لیا۔ میں اور ہری دوسرے کمرے میں تجوری اور الماری کھٹکالے گئے۔ تجوری میں بمشکل پچاس ساٹھ روپے ملے۔ تمام کپڑے وغیرہ ہم نے الماری سے نکال کر باہر پھینک دیئے، مگر ایک ہی زیور ہاتھ نہ لگ سکا۔

ہری نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس عورت نے تجوری کی چابیاں جس آسانی سے ہمارے حوالے کی تھیں اسی سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ پھیرا بیکار ہو گا۔"

"لیکن جو گیندر نے تو ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہزاروں کا مال ہاتھ لگے گا۔" میں اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ہری! کیوں نہ اس عورت کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ ممکن ہے اس طرح کام بن جائے۔ تم

ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آیا۔

خلاف توقع برابر والے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ دبے پاؤں آگے بڑھ کر میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسی کمرے میں جوگیندر اور رپا کو چھوڑ کر کچھ دیر پہلے میں گیا تھا۔ دروازے کی ایک جھری سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے وہ منظر یاد آگیا جب میرے ہاتھوں قتل ہونے والا آئندہ، ٹھٹھکا کو زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والا تھا۔ رپا کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور جوگیندر نے اسے زمین پر گر لیا تھا۔ پھر بھی رپا ٹانگیں چلائے جا رہی تھی۔

"اب ٹوچ نہیں سکتی اس لئے چپ چاپ پڑی رہ۔" جوگیندر نے آخر اس بے بس عورت کو قابو میں کر بی لیا۔

پھر اس سے پہلے کہ جوگیندر اس کی عزت لوٹ لیتا، میں نے زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ جوگیندر اچھل پڑا اور جلدی جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کر کے رپا کے منہ سے کپڑا کھول دیا اور اسے دھمکی دی کہ اپنی زبان بند رکھے۔ زرا دیر میں جوگیندر نے دروازہ کھول دیا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے جوگیندر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم اندر دروازہ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟"

"اس کی زبان کھلوا رہا تھا۔" جوگیندر نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "مجھے شک ہے کہ گھر میں مال نہیں۔"

"پھر کیا بتایا اس نے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے شوہر نے اپنی دکان کے نیچے تمہ خالے میں تمام سرمایہ اور زیورات چھپا دیئے ہیں۔" جوگیندر نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ جوگیندر کو پہلے ہی سے یہ بات معلوم ہوگی۔ ہمیں یہاں لے کر آنے مقصد تو رپا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا تھا۔

"تو پھر چلو، واپس چلتے ہیں۔" میں نے جوگیندر سے کہا۔

اس کے بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم سب گاؤں سے باہر آ گئے۔ جوگیندر گاؤں ہی میں رہ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اس سے ضروری بات کرنے کا بہانہ بنا دیا۔ جوگیندر کو میں نے ہری کے ساتھ گھوڑے پر بٹھایا تھا۔ ہری کو میں نے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

جب ہری دور نکل گیا تو میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو بتایا۔ "یہ جوگیندر بے ایمان اور مطلبی آدمی ہے۔ وہ اس حسین عورت کو بے آبرو کرنے کی خاطر ہمیں یہاں لایا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے جو دیکھا تھا بتا دیا۔ پھر بولا۔ "جوگیندر کو اس کی اس حرکت کی سزا دی جائے گی۔"

گاؤں سے تقریباً چار میل دور نکل آنے کے بعد ہم سب ایک کنویں کے قریب ٹھہر گئے۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لے کر جوگیندر کو اپنے قریب بلایا۔

"ہمیں پیاس لگی ہے لہذا یہاں کچھ دیر سٹالینے ہیں۔" میں بولا۔ "تم سے مجھے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔ پھر تم اپنے گاؤں واپس چلے جانا، ہم تمہیں گاؤں کے باہر چھوڑ دیں گے۔ آؤ ذرا ادھر آ جاؤ۔" میں اسے کنویں کے قریب لے گیا۔ پھر کہا۔ "یار! وہ عورت تو بلا کی حسین تھی، تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"اس پر میری بہت دن سے نظر تھی۔" جوگیندر فوراً ہی کھل گیا۔ "غلطی مجھی سے ہو گئی ورنہ آج کام بن گیا ہوتا۔" پھر اس نے رپا پر فقرے بازی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "مگر میں نے تو تمہارے بارے میں یہ سنا تھا کہ تم کبھی کسی عورت پر بڑی نظر نہیں ڈالتے..... خیر تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں آج ہی رات اپنے ارمان پورے کر لوں گا۔"

عین اسی لمحے میری راکٹل تیزی سے حرکت میں آئی۔ گولی جوگیندر کے سینے میں اتر گئی۔ اس کے قدم لڑکھرائے اور پھر وہ کنویں میں گر گیا۔ ایک بڑا آدمی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے آسمان پر چپکتے ہوئے لاتعداد ستاروں کی طرف دیکھا۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں اور ہری دودھیا گاؤں جا کر صبح ہونے سے پہلے واپس آ سکتے ہیں۔"

اس موقع پر مومن کہنے لگا۔ "وہ! ہم لوگ ہمیشہ کہیں بھی ایک ساتھ ہی جاتے ہیں، کیوں نہ اکٹھے چلیں۔ ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

"نہیں دوستو!" میں نے انکار کر دیا۔ "خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ ہری میرے ساتھ کافی ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد کسی نے بحث نہیں کی۔ ہم پانچوں، گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ایک کچے راستے پر آ نکلے۔ کچھ آگے بڑھ کر میں ایک چوراہے پر رک گیا۔ سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کی بائیں کھینچ لیں۔ ڈاکے ڈالنے کے سبب مجھے پورے ضلع کا ایک ایک راستہ یاد ہو گیا تھا۔

میں نے ایک راستے کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ راستہ جنگل میں ہمارے نئے ٹھکانے کی طرف جاتا ہے۔ تم تینوں وہاں پہنچو۔ ہم دونوں دودھیا گاؤں سے واپس آ کر تم سے آ ملیں گے۔ ہماری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔"

سب نے اثبات میں سر ہلائے اور میرے بتائے ہوئے راستے پر اپنے گھوڑوں کو ڈال دیا۔ اپنے ساتھیوں کی فکر مندی کا سب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ ایس بی متانے حکومت کی طرف سے میری گرفتاری پر دو ہزار روپے کا اعلان کر دیا تھا۔ اعلان یہ تھا کہ جو کوئی مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرے گا یا میرے بارے میں اطلاع دے گا اور اس اطلاع کی بنا پر میں پکڑا گیا تو اطلاع دینے والے کو انعام دیا جائے گا۔

یہ گزشتہ ہفتے ہی کی بات تھی۔ غبروں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہر طرف اس اعلان کا چرچا تھا۔ وہ سستے کا زمانہ تھا۔ دو ہزار روپے کی رقم بہت بڑی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود بھی اکثر لوگ

انعام کے اعلان پر ہنس کر کہتے کہ صرف دو ہزار روپے؟ دو ہزار روپے کی ضرورت ہو تو وجے کے خلاف مجبوری کیوں کی جائے، خود وجے کے پاس جا کر اس سے دو ہزار روپے کیوں نہ مانگ لئے جائیں۔ بھلا اس غریبوں کے بیلے نے کب کسی کی مدد کرنے سے انکار کیا ہے۔

کوئی کتا، وجے جیسے مرد سے بے ایمانی کرنا مردوں کا کام نہیں۔ پولیس والے سرکاری روٹیاں کھا کر کافی بھگڑے ہو گئے ہیں، ذرا وجے کو تلاش کر لیں گے تو چربی ہی کم ہوگی۔ کرنے دو تلاش، دیکھیں گے وجے کو کیسے گرفتار کرتے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ یہاں تک کہ کچھ عورتوں کو تو یہ تک کہتے سنا گیا کہ ہمارے باپ کے پاس دینے کو جیزنہ تھا اس لئے ایک بوڑھے کھوسٹ سے شادی ہو گئی۔ اگر ہماری جوانی میں بھی وجے ہوتا تو ایسا کاہے کو ہوتا۔

کچھ لوگ اس انعام کا اعلان سن کر شیخ چلی بھی بن گئے تھے اور پہلے سے انعام کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کبڑا مناسکھ تھا۔ اس کے بارے میں تفصیلات کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اس بد بخت کبڑے کی وجہ سے مجھے بہت پریشان ہونا پڑا۔

کبڑے منا کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ اسے شادی کرنے کا بڑا ارمان تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جوانی میں پیچک کا مرض ہو جانے سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، رنگ پہلے ہی آجوسی تھا۔ پھر ایک آنکھ بھی گئی، پیچک نے اس کی شکل اور بگاڑ دی۔ لوگ اسے رات برات دیکھ لیتے تو زور جاتے۔ ایسے میں اسے لڑکی کون دیتا لیکن اس کا خیال یہی تھا کہ اگر جیب میں دولت ہو تو شادی ہو سکتی ہے۔

جس گاڑی والے نے سوہن سنگھ کو ناک پور واپس پہنچایا تھا، کبڑے نے اس سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سوہن سنگھ کس گاڑی میں اور کس کے گھر گیا تھا۔ دوسرے دن وہ بھی بشن سنگھ کے گاڑی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے میرے اور سروج کے گھریلو تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس گاڑی میں کبڑے کا ایک رشتے دار بھی رہتا تھا۔ کبڑے کا کام اسی لئے آسان ہو گیا۔ اس نے بقیہ معلومات حاصل کرنے کے لئے وہیں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆=====☆

ستاروں کی وندلی روشنی میں میری سفید گھوڑی اور ہری کا سیاہ گھوڑا قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہا تھا۔ ہم دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ہری نے ایک مرتبہ بھی شکنتلا کا ذکر نہیں کیا حالانکہ میں اس سے ناک پور میں وجے کے والدین ہی کے متعلق تفصیل معلوم کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا حالات سے تنگ آکر شکنتلا اپنے شوہر کر تار سنگھ کو چھوڑ کر میکے چلی گئی ہوگی؟ وہ یا پھر کر تار سنگھ نے اسے گھر میں قید کر دیا ہوگا؟ بہر حال میری محبت تھی۔ مجھے اسی لئے شکنتلا اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھا دینے والی موجودہ زندگی بہت کھل رہی تھی۔

”ہری! ماں جی نے شکنتلا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ مجبور ہو کر آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔
”وجے! تمہارے ماں باپ نے سروج کے بارے میں اتنی باتیں کیں کہ مزید کچھ معلوم کرنے کا

مجھے موقع ہی نہیں ملا اور میں چلا آیا۔“ ہری نے جواب دیا۔

پھر میں نے ہری سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ رات کے پچھلے پہر ہم دووہیا گاڑیوں میں داخل ہوئے۔ اس وقت گاڑی گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں گھوڑی کی لگام اور دوسرے میں پستول تھا۔ ذرا دیر میں ہم بشن سنگھ کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ گھوڑی سے اتر کر میں نے دروازے کی کڑی کھٹکھٹائی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ سروج کے گھر والے شاید گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

دوسری اور پھر تیسری بار دستک دینے پر کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”مہمان۔“ میں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

بڑے دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور لالین کی روشنی دکھائی دی۔

”کون ہے بھائی؟“ پھر سوال کیا گیا۔

”رات کا مہمان۔“ میں بولا۔

کھڑکی میں ایک بوڑھا چہرہ نظر آیا اور حلقے سے میں سمجھ گیا کہ وہی بشن سنگھ ہو سکتا ہے۔ بوڑھے کے چہرے پر آشنائی کے آثار نظر آئے۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ میں اپنی گھوڑی اندر لے گیا تو بوڑھا دروازہ بند کرنے لگا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو روک دیا اور کہا۔ ”میرا ایک دوست بھی ساتھ ہے، اسے بھی اندر بلا لیں۔“

پھر ہری بھی اندر آ گیا اور دروازہ بند کر لیا گیا۔

بشن سنگھ کے مکان کے سامنے ایک مندر تھا۔ اس مندر کے باہر چوتھے پر کبڑا مناسکھ ہماری آمد سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ کھانا بھی تھا، مگر میں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اتنی رات گئے کون آیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے سروج بھی گھر کے صحن میں آ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ اس وقت شلوار قمیض میں لمبوس تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میرے دل پر جیسے قیامت سی گزر گئی۔ وہ تھی بھی تو سراپا قیامت۔ جلدی میں وہ دوپٹے کے بغیر باہر آ گئی تھی۔ غالباً اسے جلد ہی یہ خیال آ گیا اور اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ کر کے شرمیلے انداز میں منہ پھیر لیا۔ پھر وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

”میں آپ سے چند اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔“ میں نے بشن سنگھ کو مخاطب کیا، پھر ہری سے کہا۔
”ہری! چھت پر جا کر تم اطراف کا جائزہ لے لو کہ کسی قسم کا خطرہ تو نہیں۔“

ہری کے ساتھ ہی بشن سنگھ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تمہیں جو ضروری باتیں کرنا ہیں، سروج سے کرلو۔ میں اس سے معلوم کر لوں گا۔ میں بھی تمہارے ساتھی کے ہمراہ جا رہا ہوں۔“

بشن سنگھ اور ہری چلے گئے اور میں اندر کمرے میں داخل ہو گیا جہاں سروج موجود تھی۔ کچھ دیر کم صم ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سروج ہی دھیمی آواز میں نظریں جھکا کر بولی۔ ”تمہیں یاد تو ہے ناکہ بیچن میں تم میرے سوا کسی اور کے ساتھ کھیلتا پسند نہیں کرتے تھے۔“ سروج بیچن کی یادوں میں کم ہو کر کے جا رہی تھی۔ ”جب ہم آنکھ پھولی کھیلتے تھے تو تم بھی کو تلاش کر کے پکڑ لیتے تھے

اور میں رونی صورت بنا کر کہتی تھی، تم میرے سوا کسی اور کو نہیں پکڑتے۔ جاؤ ہم تم سے نہیں کھیلنے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”اور اب تم ہی نے یہ کھلویا تھا کہ میرے سوا کسی کے ساتھ نہیں کھیلو گی۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”تم نے اسی لئے رشتہ توڑنے کی اجازت نہیں دی۔“

سروج نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سینے کے اتار چڑھاؤ سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”تم نے بڑی ہمت کر کے مجھے شادی کی دعوت بھیجی تھی۔ میں تمہاری دعوت قبول کر کے آ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

سروج نے چونک کر اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں پیار کے موتی چمک رہے تھے اور پلکوں نے بولتی آنکھوں پر حیا کی چادر ڈال دی تھی۔

”میں اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر ضرور آیا ہوں مگر شادی کے ارادے سے نہیں۔“ میں نے صاف صاف بات کہہ دی۔ ”میں تمہیں قول دینے سے پہلے صاف صاف بات کر دیتا ضروری سمجھتا ہوں۔“

”کو۔“ اس کے حسین ہونٹ ہلے۔

”تم جانتی ہو سروج کہ میری زندگی کس دورا ہے پر کھڑی ہے۔ ہم نہ جانے کب ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں۔ کیا تم اس کے باوجود میرے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہو گی؟ ملاپ چند ساعتوں کا اور جدائی عمر بھر کی؟ بولو سروج! کیا تمہیں یہ سب کچھ منظور ہے؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

مجھے اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اپنے متغیر وجہ کو دل کی گمراہیوں سے جانتی ہے۔ ظاہر ہے اسے کیا خبر تھی کہ اس کے متغیر کے جسم پر ایک جن زاد، یعنی میں قبضہ کر چکا ہوں۔ چند لمحے بعد وہ دھیمی آواز سے بولی۔ ”وہ! تم نے جس جدائی کی بات چھیڑی ہے تو تمہاری ماں بھی اسی جدائی میں رت پ رہی ہے۔ ہم ایک ہی جگہ دو عورتیں مل کر جدائی کے اس بوجھ کو بانٹ لیں گے۔“

یہ جواب ملنے کے بعد مزید کسی سوال کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سروج ہر قیمت پر مجھے اپنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اب صرف اس سے ایک بات کرنا باقی تھی۔ سو میں بولا۔

”سروج! تمہیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ جرم و بے نادت کے راستے پر مجھے خاندانی عداوت کے علاوہ دشمن کی عورت لے کر آئی ہے۔“

سروج نے جلدی سے کہا۔ ”تم شکنتلا کی بات کر رہے ہو؟“

میں حیرت سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم میرے متعلق تمام اطلاعات رکھتی ہو۔ یہ تو اچھا ہے، اب میں تم سے کھل کر بات کر سکوں گا۔ دیکھو سروج! شکنتلا نے میری خاطر بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ اس کی خاطر اسی لئے مجھے کتنا بھی خطرہ مول لینا پڑے میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

سروج نے یہ سن کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہماری شادی کی بات میں شکنتلا کا ذکر کیوں؟“

”ضرورت پڑنے پر مجھے شاید شکنتلا کو اغوا بھی کرنا پڑے۔ اس وقت تم یہ نہ کہہ سکو کہ میں نے پہلے سے نہیں بتایا اسی لئے شکنتلا کا ذکر میں نے کیا ہے۔“

”تم کہہ چکے ہو تو سنو کہ میں شکایت نہیں کروں گی۔ اور کچھ؟“ وہ مسکرا دی اور مجھے اس پر بہت آیا۔

میرا جی چاہا کہ سروج کو اپنی بانہوں میں لے لوں، پھر یہ سوچ کر خود پر قابو پا لیا کہ وہ تو تھی ہی نا، جلد بازی کی کیا ضرورت تھی۔ آج نہیں تو کل اسے میری بانہوں میں سمٹا تھا۔

میں اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔ ”تمہیں تین چار مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ برسات کے بعد دیوالی رتے ہی میں گھوڑے پر سوار ہو کر تمہیں اپنانے آ جاؤں گا۔“ پھر میں نے اس کا گورا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے دبایا۔ سروج کا چہرہ حیا کی چادر سے چھپ گیا۔

اسی وقت باہر قدموں کی چاپ ابھری اور میں نے سروج کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کمرے میں آنے والا تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

ہری نے بتایا۔ ”ایک شخص مکان کے گرد چکر لگا رہا ہے۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا میں راکفل کا امداد کر اسے بے ہوش کر دوں؟“

خطرہ محسوس کرتے ہی میرا ہاتھ پستول پر جم گیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے سروج کی طرف دیکھا پھر ہری کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ ہری نے آگے بڑھ کر دروازے میں موجود کھڑکی کھول دی۔

ادوار سے لگا کھڑا تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اپنی پشت پر پڑا ہوا کپڑا میں نے کبڑے کے بے پر کس کر لپیٹ دیا۔ میں نے اسے پیچھے سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا۔ اسی اثنا میں ہری میرے پیچھے گیا۔

اسی وقت گھوڑے لائے گئے۔ میں نے پستول کی نال پر کبڑے کو بانک پر سوار ہونے کے لئے مجبور دیا اور خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دونوں گھوڑے دوڑتے ہوئے گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئے۔

بادومیل کا فاصلہ طے کر کے میں نے کبڑے کو گھوڑی سے اتار دیا۔ ہری راکفل تانے کبڑے کے پیچھے چلا گیا۔

میں نے کبڑے کے منہ سے کپڑا کھول دیا۔ اس کا کمرہ چہرہ دیکھ کر مجھے گھن سی آئی۔

”بول وہاں کیا کر رہا تھا؟“ میں نے سخت آواز میں کبڑے سے سوال کیا۔

کبڑا کانپنے لگا۔ اس نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! میں چوری وغیرہ کی نیت سے نہیں کھڑا تھا بلکہ دیوار کے پاس.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی چھوٹی انگلی اٹھائی اور اپنی سے میری طرف رحم طلب انداز میں دیکھا۔

ہری نے پیچھے سے راکفل کا کندا کبڑے کی پشت پر مارا اور بولا۔ ”جھوٹ بکنا ہے۔ اس میں چندہ نہیں لگتے۔“

”میرے باپ! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ پتھری کی بیماری کے سبب مجھے آدھے آدھے گھٹنے پریشان

ہونا پڑتا ہے۔“ کبڑے نے بہانہ بنا دیا۔

مجھ سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں نے یہ بھی غلط ہی سمجھا کہ کبڑا مجھے پہچانا۔ میرے خیال میں وہ پولیس کا تجربہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس چکر میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں سمجھا۔ سو اسے آزاد کر دیا اور کہا۔ ”جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔ اگر پولیس کے ہاتھ لگ جائے تجھے بار بار کراہہ موار دیتی، سمجھا۔“

یہ سنتے ہی کبڑے نے ہاتھ جوڑے اور وہاں سے گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگ اٹھا۔ اس پر ہری کہنے لگا۔ ”وہ! تم نے اسے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کی حرکات شک میں والی تھیں۔“

”جانے بھی دوا سے۔“ میں بولا۔ ”ہم تو ہر ایک پر شک کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔“ میں گم پر سوار ہو گیا۔ ”اب ہمیں جلدی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے۔ ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ ہمیں زیادہ دیر ہو گئی تو وہ فکر کریں گے۔“

آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے۔ برسات کے آثار نہیں رہے تھے۔

☆=====☆

برکھا کے موسم میں پورے علاقے میں تین نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ میں برق کی طرح حمل ہوتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد طوفان کی طرح غائب ہو جاتا۔ موسلا دھار بارش کی سیاہ راتوں میں کچھ لبریز گینڈنوں اور گندے پانی سے چھلکتے ہوئے نالوں سے گزرتا ہوا میرا چھوٹا سا گردہ مخصوص ٹھکانا اچانک چھاپے مار کر جاگیر داروں اور سرمائے داروں کے گھروں میں چھپائی ہوئی یا زمین میں دبائی گئی کو برآمد کر لیتا تھا۔

میرا نام سن کر زمینداروں کے دل دہل جاتے تھے۔ مال حوالے کرنے میں اگر کوئی پس و پیش میری تیز نظریں اس کے حواس غائب کر دیتی تھیں۔

چھاپے مارنے سے پہلے میں معلوم کر لیتا تھا کہ کتنا مال اور دولت کس جگہ موجود ہے۔ یہی وہ کہ میں اپنے نشانے پر پہنچ کر اپنے شکار کو حکم دیتا، جلدی مال نکالوں میں جانتا ہوں مال تم نے کہا رکھا ہے۔ بے چارے شکار کے حواس ہوا ہو جاتے تھے۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ مجھے پوری اطلاع مل چکی کہ مال کہاں ہے۔

میرا اتنا رعب طاری ہو چکا تھا کہ لوگ جھوٹ بولنے سے گریز کرتے تھے۔ لوگوں کو علم تھا کہ جھوٹ بولنے والے پر رحم نہیں کرتا۔ جھوٹ بولنے کی صورت میں پیٹ پر پڑنے والا گھوٹا طاقتور طاقتور آدمی کو بھی زمین چلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

ایک بار ایک سود خور بیوپاری کے گھر میں نے ڈاکا ڈالا۔ بیوپاری کو سن گن گن گئی تھی۔ اسے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی، مگر میرے ساتھیوں نے اس کے بیٹے کو پکڑ لیا۔ بیوپاری اور اس کے بیٹے کو گھر میں موجود کنوئیں کے اندر لٹکا دیا گیا اور ساری دولت لوٹ لی گئی۔ میرے ایما پر رگھو ورنے

مٹا کے نام ایک خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی:

وہجے تحریر کر رہا ہے ایس پی مٹا کہ تمہارا محکمہ بہت کجس ہے۔ میرے سر کی قیمت صرف دو ہزار مقرر کر کے تم نے میری ہنگ اور اپنی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ انعام کے لالچ میں آنے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑتا۔ اس ضمن میں جتنے لوگ بھی میرے ہاتھوں مارے گئے، ان کے قتل کی ذمہ داری تمہارے محکمے پر ہوگی۔ تم لوگوں میں بہت ہے تو خود میرے مقابلے پر آؤ۔ ہم ہر وقت کھلے عام سر سے کفن باندھ کر گھوم رہے ہیں اور تم حکومت سے تنخواہ پا کر بھی موت سے ڈرتے ہوں۔ دوسروں کو موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی دعوت مت دو۔ میں کسی بھی وقت اور کہیں بھی تم سے مقابلے کے لئے تیار ہو۔

یہ خط بیوپاری کے گھر چھوڑ دیا اور پھر جلد ہی اس کا رد عمل سامنے آ گیا۔ ایس پی مٹا نے اعلان کیا آج سے چھ ماہ کے اندر اندر میں اگر وہجے کو ختم نہ کر سکا تو اپنے محکمے سے استعفیٰ دے دوں گا۔ اس ساتھ ہی مٹا نے میرے سر کی قیمت میں اضافہ کر دیا۔ میری گرفتاری پر اب انعام کی رقم پانچ ہزار کر لی۔

دیوالی آنے تک میں نے اپنے گردہ کو اچھی طرح منظم کر لیا۔ اب میرے ہمراہ بااعتماد اور ہمدرد کے علاوہ ایسے ذہین لوگ بھی تھے جو میرے لئے خبری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ گردہ میں ان نو دن کی مکمل تربیت اور نئے اسلحے کی فراہمی کے لئے میں نے پے در پے کئی کامیاب ڈاکے ڈالے۔

میری خواہش تھی کہ ضلع امرتسر سے نکل کر آہستہ آہستہ پورے پنجاب پر چھا جاؤں۔ اس کے مجھے مزید جاں نثاروں کی ضرورت تھی۔ اپنے تجربوں کے ذریعے مجھے پولیس کی نقل و حرکت کی تمام مالتی رہتی تھیں۔ اب خود پولیس کے محکمے میں بھی میرے تجربے موجود تھے۔ اس کے علاوہ اپنے بول پر بھی میری کڑی نظر تھی کہ کوئی غداری نہ کر جائے۔

اب تک پولیس سے میرے گردہ کا صرف دو مرتبہ مقابلہ ہوا تھا، مگر وہ صرف معمولی نوعیت کی تھیں۔

دیوالی میں ہفتہ بھریاتی رہ گیا کہ میں نے اپنے ساتھی شکر سے کہا۔ ”چلو، آج تمہاری محبوبہ کے گھر کے معاملہ بھی نمٹا دیتے ہیں۔“

میں اور شکر اس کے گاؤں میں پہنچے جہاں شکر کی محبوبہ پدمنی رہتی تھی۔ رات کے نو بج چکے

پدمنی کے بارے میں شکر مجھے پہلے ہی تمام تفصیل بتا چکا تھا۔ پدمنی اس کے بچپن کا پیار تھی۔ اور شکر دونوں ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ دو سال پہلے پدمنی کے باپ نے اسے کسی سے بیاہ دیا تو شکر کا خون کھول اٹھا۔ جانتے بوجھے اس بوڑھے نے ایسا کیا تھا۔ وہ شکر اور پدمنی کی ناسے بے خبر نہیں تھا۔ پدمنی کے جواری باپ نے دولت کے لالچ میں ایسا کیا تھا۔ شکستہ دل شکر

بے شوہر کے درمیان پدمنی دو کام ایک ساتھ انجام دے رہی تھی۔ دائیں ہاتھ سے وہ اپنے شوہر کے میں روٹی کا ٹوالہ دے رہی تھی اور اس کا بائیں ہاتھ جھولے کو ہلاتا تھا۔ اس منظر نے میرا دل ہلا دیا۔ چارپائی کے قریب رکھا ہوا پانی کا گلاس میں نے اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

”میں نے ابھی سنا ہے کہ آپ فکسر کے دوست ہیں۔“ پدمنی کا شوہر بولا اور پھر اپنا تعارف کرایا۔
 ”کانام بلویر سنگھ تھا۔“ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے اگر مجھے اس بات کا پتا چل جاتا تو یقیناً میں پدمنی کے ساتھ شادی سے انکار کر دیتا۔“ اس عرصے میں پدمنی اپنے کام میں مصروف رہی۔ بلویر نے مزید کہا۔ ”دیے بھی مجھ سے بیاہ کر اس بے چاری کو کون سا سکھ ملا ہے۔ ایک طرف گھر میں جھولا جا دوسری طرف میرے ہاتھ کٹ گئے۔ کارخانے کی مشین سے یہ حادثہ ہوا۔“

اپنے شوہر کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگاتے ہوئے پدمنی بولی۔ ”پہلے آپ اطمینان سے کھانا کھا پھر باتیں کر لیجئے گا۔“

پانی پی کر بلویر کہنے لگا۔ ”بچے اور شوہر کی تیار داری کا بار اٹھا کر پدمنی اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ اس کے گھر کام کاج کر کے تھوڑا بہت کمالاتی ہے اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس وقت مجھے کھانا کھانا پانا ہے۔“

میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ پھر میں نے معلوم کیا۔ ”کارخانے کے مالک نے اس کا کوئی معاوضہ دیا؟“
 ”معاوضہ؟“ بلویر کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”اس نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا۔ اگلے بڑی عاجزی سے کسانیتھ صاحب، اپنے پیروں سے میں جو کام کر سکوں گا، کرنے کو تیار ہوں، یہ روزی نہ چھینیں، مگر اس نے ہاتھ کٹنے کے بعد علاج تک کے لئے پھونٹی کوڑی نہیں دی۔ وہ روزی دیتا۔“

بلویر کھانا کھا چکا تو پدمنی نے بھیجے ہوئے ہاتھ سے اس کا چہرہ صاف کیا۔
 کھانے سے فارغ ہو کر اٹھتے ہوئے اس نے پدمنی سے کہا۔ ”اب تم بھی کھانا کھاؤ، میں اتنی دیر سے باتیں کر لوں۔“

میں نے دیکھا، بلویر کے برتن میں جو جو ٹھنپا ہوا تھا، پدمنی وہی کھانے لگی۔ شاید یہ اس کے روز کا دل تھا۔ اب تک میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا، اس سے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ میں سخت کشمکش میں تھا اور سوچ رہا تھا، قدرت نے جس شخص کے ہاتھ چھین لئے ہوں، کیا ایسے اپالاج سے اس کی بیوی کو اجا سکا ہے؟

بلویر نے مجھ سے میرا نام پتا اور کام دریافت کیا۔ میں بات کو ٹال گیا۔ فکسر کے بارے میں سوالات کا پ دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ”وہ پہلے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا، پھر وہاں سے فرار ہو کر اب ڈاکو دہے گردہ میں شامل ہو گیا ہے۔“

دونوں میاں بیوی کے چہروں پر حیرت نظر آئی۔ پدمنی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ سب کچھ مانجہ سے ہوا ہے۔“

پدمنی کے باپ کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا، مگر اس سے پہلے ہی قدرت نے بوڑھے کو سزا دے دی۔ جو میں بوڑھے کا ایک شخص سے بچتا ہو گیا۔ بوڑھے نے اس شخص کو قتل کر دیا اور اسے عمر قید کی سزا سنائی۔ اس کے بعد پدمنی تنہا رہ گئی۔ اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی اور بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔
 دل شکستہ فکسر فوج میں بھرتی ہو گیا، مگر وہ پدمنی کو نہیں بھول سکا جو اس کی روح میں سمائی ہو تھی۔ کوشش کے باوجود فکسر، پدمنی کی یادوں کے نقوش اپنے دل سے نہ مٹا سکا۔ اسے یقین تھا کہ پدمنی کے دل میں بھی ابھی تک اس کی محبت کا چراغ روشن ہو گا۔

بچے در بچے گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔
 ”فکسر! میں اکیلا اندر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنی رائفل مجھے دے دو اور میرا ہسپتال پاس رکھ لو۔ اس طرح کوئے میں چھپ کر یوں کھڑے ہو جاؤ کہ کسی کو تم پر شک نہ ہو۔ میں جب پدمنی کو لے کر باہر آؤں تو تم فوراً ہی اسے کھوڑی پر بٹھا کر فرار ہو جانا۔ باقی کام میں خود غمتالوں گا۔“
 فکسر نے میری ہدایت پر عمل کیا اور میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ جلدی ہی کھل گیا مجھے دیکھنے کے لئے لائینر بلند کی گئی۔ وہ ایک حسین عورت تھی۔ میں سمجھ گیا وہی پدمنی ہے۔
 ”کس کو تلاش کر رہے ہیں؟“ پدمنی نے مجھ سے دریافت کیا۔ اس کی نظر میری رائفل پر پڑا

وہ کچھ پیچھے ہٹ گئی۔
 ”پدمنی بہن آپ ہی کانام ہے؟“ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لئے پوچھا۔ ”میں آ کے رشتے داروں کی جانب سے آیا ہوں، فکسر کا دوست ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ پدمنی کا چہرہ کھل اٹھا، مگر دوسرے ہی لمحے اس پر دکھ کے سائے منڈلائے۔
 اس کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی، مگر شاید اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ”تشریف لائیے، وہ جب کھانا کھا رہے ہیں، آپ بیٹھئے۔“ پدمنی نے مجھے اندر بلا کر چارپائی بچھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اس کے شوہر کی آواز آئی۔ ”کون آیا ہے؟“ دونوں کمرؤں کے دروازوں کے درمیان لائینر لٹک رہی تھی جس سے کمرؤں میں مدھم مدھم سی روشنی تھی۔ گھر کی حالت اچھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پدمنی کے حسین چہرے پر بھی سکھ کی لالی نہیں تھی۔

زبردستی بیاہے جانے والی پدمنی اب میرے دوست فکسر کا گھر آباد کرے گی۔ مجھے وہ اپنے لئے پسند آ گئی تھی۔ میں، فکسر کے پیار کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت کو اپنا آبادہ تھا جو کسی اوز کے پہلو کو آباد کر چکی تھی۔

”بھائی! اندر آ جائیے۔“ مردانہ آواز نے مجھے مخاطب کیا۔
 میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ پدمنی نے وہی چارپائی جلدی سے وہاں بچھا دی۔ میری پہلی نظر جھولے پر پڑی اور وہاں سے گزرتی ہوئی پدمنی کے شوہر پر آ کر جم گئی۔ حیرت سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھنے لگا۔ اس جوان شخص کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے اس نے کٹے ہوئے ہاتھ بلا کر میرا استقبال کیا۔ جھولے میں سوئے ہوئے بچے اور کھانے کے

اس پر بلور بول اٹھا۔ ”نہیں! اگر میں پدمنی سے شادی نہ کرتا تو شکر اس راستے پر نہ چلتا۔“
میں نے پدمنی کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہونے لگا۔ یہ
موقع تھا کہ میں کچھ حاصل کرنے آیا تھا اور خالی ہاتھ لوٹنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اسی وقت مجھے شکر سے
ہوا وعدہ یاد آیا لیکن میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور بلور کو مخاطب کیا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ
میں پدمنی بہن سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے خوشی سے..... اگر کہیں تو میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔“ بلور اٹھتے ہوئے کہنے لگا
”تمہارا سہاگ سلامت رہے میری بہن!“ میں نے پدمنی کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا۔
میں نے اٹھ کر بچے کے سر پر ہاتھ پیرا اور روپوں کی تھیلی جھولے میں رکھ کر تیزی سے کمرے سے
آیا۔ میرے قدم دروازے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ روانگی سے قبل پدمنی کو میں نے بتا دیا تھا کہ یہ
نام وجہ ہے۔ پدمنی نے بھی مجھ سے ایک بات کہی تھی۔

میں باہر پہنچا تو مجھے اداس دیکھ کر شکر نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم دونوں خاموشی سے گھوڑا
سوار ہو کر دور نکل آئے۔

پھر شکر نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا ہوا ہے! پدمنی کیوں تمہارے ساتھ نہیں آئی؟ کیا اس
شوہر نے اسے روک لیا؟“ پھر اس کی آواز میں تلخی آگئی۔ ”کیا اس کا شوہر اتنا بھادر تھا کہ تم جیسے فتنہ
بھی وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا پڑا؟“

”وہ اتنا کمزور تھا کہ میں اس کی بیوی کو نہ چھین سکا۔ پدمنی کے شوہر کے ہاتھ کٹ گئے ہیں!
ایک بچے کا باپ بھی ہے۔“ میں نے بتایا۔ پھر میں نے شکر کو سب کچھ بتا دیا۔ شکر سوچ میں گم ہو
تھائی میں پدمنی نے مجھ سے جو بات کہی تھی، میں نے شکر کو اس سے بھی آگاہ کر دیا۔ پدمنی نے کہا
”وجہ بھائی! میرے شوہر کو میری ضرورت ہے۔ اس وقت اگر میں اسے چھوڑ کر چلی گئی تو عورت
پر دھبہ لگ جائے گا۔ آپ شکر کا خیال رکھئے گا۔ اسے کسی اچھی سی لڑکی سے بیاہ دینا۔ اپنے بچے
بھی میں نے شکر ہی رکھا ہے، اسے بتا دینا۔“

سب کچھ سن کر بہت دیر تک شکر خاموش رہا۔ میں اس کا دکھ محسوس کر سکتا تھا۔
”مرد ہو کر اتنے کم ہمت نہ بنو میرے دوست!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”اب میں نے تمہا
رے میں سے ہر ماہ کچھ رقم پدمنی کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس طرح تم اسے خوش رکھ رہے
ہو جو بھلا کر سکتے ہو۔“

شکر نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ شاید اس کی قوت گویائی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
شکر کے معاملے سے نمٹ کر میں نے اپنے ایک تجربے کے ذریعے وجہ کے والدین کو بتایا
شادی کا دن اور وقت مقرر کر لیا۔ اس میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے کہلوایا تھا کہ
کی تمام تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور یہ کہ شادی کی رسوم آدمی رات کے وقت کسی انجان جگہ
میں جس کے متعلق تین دن پہلے آگاہ کر دیا جائے گا۔ میں نے یہ بھی کہلوایا تھا کہ شادی کے بعد

پہانہ چلے، صرف گھر کے افراد بیاہ میں شرکت کریں۔
اسی عرس میں مجھے یہ خبر بھی مل گئی کہ وجہ کا ماہوں خشونت سنگھ جیل سے رہا ہو کر ٹانک پور پہنچ
گئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وجہ کا باپ سوہن سنگھ نے دودھیا گاؤں جا کر بش سنگھ کو شادی کے
تکلیف سے آگاہ کر دیا ہے۔

میں اس سے بے خبری رہا کہ کبڑا منا سنگھ نے اس عرس میں کیا نئی چال چلی ہے۔ اس کا علم مجھے
میں ہوا کہ کبڑا، بش سنگھ کے گھر میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے متا کو بھی شادی کی خبر پہنچا دی تھی
ہر بے مقام نہیں بتا سکا۔

میرے خبروں نے مجھے اطلاع پہنچا دی کہ پولیس کو کسی ذریعے سے سب کچھ علم ہو چکا ہے۔ میں
ہو گیا۔ فوراً ہی میں نے ایک آدمی کو ٹانک پور بھیجا اور شادی کی تاریخ مزید آگے بڑھا دی۔ میں
نت سے کہلوایا تھا کہ کسی نے ہمارے متعلق پولیس کو اطلاع دی ہے، اس کا کھوج لگائیں۔ جس پر
شبہ ہو، اس کے نام اور ٹھکانے سے مجھے آگاہ کریں۔ بش سنگھ کے یہاں بھی خبری ہونے کی خبر
ماں سے کہہ دیں کہ تیرے بیٹے کی شادی روکنے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یقین
ہے ایک ماہ کے اندر ان کی ہوان کے آنگن میں پہنچ جائے گی۔ میرا خون جوش غضب سے گرم ہو
متا کی عیاری کا جواب میں نے اسی رات دینے کا فیصلہ کر لیا۔

گلے ہی روز میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جس رات متا کی پولیس پارٹی مجھے پھنسانے کے لئے گوبند
ماں میں جال بچھائے بیٹھی ہو گی، اسی رات دوسرے قریبی گاؤں میں ڈاک ڈالا جائے گا۔ میں اس
کو دہری شکست دینا چاہتا تھا۔

ماں نے شکر کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔ ”کل اس کا رخانے کے مالک کے گھر ڈاک ڈالا جائے گا
پدمنی کے شوہر بلور کے ہاتھ کٹ جانے پر بھی اسے معاوضہ نہیں دیا اور مازمت سے نکال دیا۔
ام لینا ہمارا فرض ہے۔ خوابوں میں بھی مجھے وہ معذور شخص نظر آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا
را تمہیں اس کا رخانے کے مالک کا پورا پتا معلوم کرنا ہو گا۔“
ماں سے معلوم کروں؟“ شکر الجھے ہوئے لمبے میں کہنے لگا۔

پدمنی کے گھر سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں اس کے گھر جا چکے ہیں۔ تمہارے اور
وہاں کسی اور کا جانا ٹھیک نہیں۔ تم نے اس کے شوہر کو نہیں دیکھا۔ اگر میں نے اسے دوبارہ
مجھے ڈر ہے کہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لئے
اسے پہلے لوٹ آؤ۔“

میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میرے کہنے کو ٹال سکے۔ وہ روانگی کی تیاری کر لے لگا۔
موقع پر میں نے شکر سے کہا۔ ”دیکھنا ایک مرد کی طرح باہمت رہنا“ پدمنی کو دیکھ کر کہیں اپنے
ٹال کا اظہار نہ کر دینا ورنہ اس کے شوہر کو صدمہ ہو گا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام کرنا۔ اسے
بت کا امتحان بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”یار! اگر ایسا ہی ہوتا تو میں اس رات تم سے جھگڑا کر کے بھی پد منی کو اغوا کر لیتا۔“ پھر مگر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مزید کہا۔ ”میں تمہاری دوستی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مردانگی کا مظاہرہ کر گا اور اپنی محبت پر آج نہیں آنے دوں گا۔“

میں نے اسے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ میں سوچنے لگا کہ جب دو محبت کرنے والے دوسرے کا سامنا کریں گے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ شکر واپس آیا چلا کہ پد منی سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ پد منی اس وقت کسی کے گھر کام کرنے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اکیلا بچے کے ساتھ تھا۔ بر حال وہ پتالے آیا تھا۔ اسی رات کو میں نے کارخانے کے مالک کے پر ڈاکہ ڈالا جس رات پولیس گویند پور میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

پانچ ہزار کی رقم چھیننے کے بعد میں نے کارخانے کے مالک کو دھمکی دی۔ ”تم لوگ غریبوں کا چوس کر سرمائے دار بنے ہو۔ پھر انہی مظلوموں کی آہوں سے ہم جیسے ڈاکو وجود میں آتے ہیں۔ تم ان شخص کے ہاتھ کٹ گئے اسے تم نے معاوضہ کیوں نہیں دیا؟“

”کک..... کے جناب!“ کارخانے کے مالک نے کانپتے ہوئے پوچھا۔
میں نے طیش میں آ کر ایک گھونسا اس کے جڑے پر مار کر کہا۔ ”یہ بھی بھول گئے، شہر رہے اور نفع تمہاری جیب میں جمع ہوتا رہے۔ مزدور جیسے یا مرس نہیں کیا۔“
”مگر جناب! اس کی غفلت کے سبب ہی ہاتھ کٹے تھے۔ اس میں میرا کیا قصور؟“
”کینے! مجھ سے بحث کرتا ہے۔“ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ”تجھے پچیس سال تک خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔“

”پچیس سال..... مگر وہ اپناج تو اس وقت مجھ سے صرف پچاس روپے مانگ رہا تھا۔“
”اور تم نے اسے اتنا معاوضہ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ پچیس سال بعد اس کا بیٹا جوان ہو وقت تک سال کے کم سے کم دو سو روپے کے حساب سے جتنا معاوضہ بنتا ہے تمہیں بلویر سکھ کوا گا۔ نہیں تو.....“

”مگر حضور! اس طرح تو پانچ ہزار روپے بنتے ہیں۔“ سیٹھ میری بات کاٹ کر بول اٹھا۔
پچاس روپے، کہاں پانچ ہزار! یہ تو.....“

اسی وقت میں نے سیٹھ کی گردن پر راکفل کی نال رکھ دی اور بولا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا، رقم بلویر کے گھر پہنچ جانا چاہئے۔ دوسری صورت میں میں تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دوں گا۔“
وے کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے واپس آ گیا۔

اس طرح میں نے ایس پی متا کو دہری شکست دی۔ پھر مخبروں کے ذریعے پتا چلا کہ ہے، میں نے شادی ضرور ملتوی کی ہے، رشتہ ختم نہیں کروں گا۔

چھ دن بعد ہی میں نے شادی کی دوسری تاریخ مقرر کر دی۔ اس کی خبر بھی کپڑے نے دی۔ میں نے اس بار دوسرا داؤ کھیلایا۔ پولیس تک انفارمیشن پہنچ رہی ہے، یا نہیں؟ یہ جاننے

نے اپنے چاروں قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ان چاروں پر بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ گھر میں وجے کے والدین اور خشونت کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں سرج کے یہاں سے توجات باہر نہیں نکل جاتی؟

پولیس نے دوسری مرتبہ انتہائی رازداری سے کام لیا، مگر میں نے تو اس مرتبہ محض پولیس کو بے وقوف بنانے کے لئے تاریخ دی تھی۔ حقیقتاً میں نے گھریہ اطلاع پہنچائی تھی کہ تیاریاں اس طرح کرنا چاہیے واقعی شادی ہونے والی ہے، مگر آخری وقت پر دو گرام ملتوی کر دینا۔

اس طرح دوسری بار بھی کچھ نہ ہوا۔ تیسری مرتبہ سرج کی خالہ کے گاؤں میں شادی کا پروگرام طے کیا گیا۔ مجھے آدمی رات کے قریب چار ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچنا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے حکم دیا تھا پولیس اس سے پہلے حملہ آور ہو تو ہنگامہ شروع کر دیا جائے۔

مجھے اطلاع ملی کہ پولیس نے مجھے زیر دام لانے کے لئے دھرا منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ اس بار متا نے پچیس پولیس والوں کو پیدل اور کچھ کو تین چار کشتیوں میں روانہ کیا۔ کشتیاں جیسے ہی گاؤں کے قریب پہنچیں انہوں نے نارنج کی روشنی کنارے پر ڈال کر جائزہ لیا۔ میرے ساتھی سمجھ گئے کہ پولیس آ گئی ہے۔

تقریباً گیارہ بجے پہلی سنساتی ہوئی گولی کشتیوں کی جانب بڑھی۔ فوراً جواب میں کئی فائر ہوئے۔ پھر دونوں کناروں سے باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی۔ گھرے اندھیرے کی چادر بھیلی ہوئی تھی۔ صرف آواز اور حرکت پر نشانہ لے کر فائرنگ ہو سکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔

اندھیرے میں کسے کتنا نقصان ہوا، اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس گزیر میں پولیس کی کشتیاں بڑی طرح ڈولنے لگیں۔

پولیس والے کشتیوں کی آڑ سے ہوا میں فائرنگ کر رہے تھے۔ میرے ساتھی خبردار ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ پولیس کا کوئی دستہ پیدل بھی آ رہا ہے۔ اسی لئے دریا والی پولیس سکنل کے طور پر ہوائی فائر کر رہی ہے۔ گھبرے جانے سے پہلے وہ فرار ہونے لگے۔ دوسری جانب اس فائرنگ سے متا کا پیدل دستہ، میں اور میرے ساتھی چونکنا ہو گئے۔

دریا کے کنارے سے دور ایک غار میں، مجھے پناہ مل گئی۔ پھر اپنے چاروں ساتھیوں کو میں نے مختلف سمتوں میں روانہ کر دیا۔ قریب ہی ان بخاروں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی مجھے پناہ دے چکے تھے۔ پولیس کے گھوڑوں کی ٹاپیں قریب ہی گونجنے لگیں۔

بخاروں کے پوڑھے سردار نے مجھے پہچان لیا اور بولا۔ ”تم ہماری عورتوں کے درمیان جا کر کسی بھی چارپائی پر خلف اوڑھ کر لیٹ جاؤ، باقی سب کچھ میں منٹ لوں گا۔“

میں پہلے ہچکچایا، مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ گھوڑوں پر سوار پولیس والے کسی بھی لئے پہنچ سکتے تھے۔

وہاں دس بارہ چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر عورتیں لیٹی ہوئی تھیں۔ سردار کے کہنے پر ایک

عورت اٹھ کر قریبی چارپائی پر سوئی ہوئی دوسری عورت کے لحاف میں گھس گئی۔ یوں ایک چارپائی میرے لئے خالی ہو گئی۔ میں اس پر عورتوں کے درمیان لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ بوڑھا سردار آگ کے الاؤ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میری گھوڑی، بخاروں کے گھوڑوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی، ذرا ہی دیر میں ایس بی متا اور اس کے ماتحت کبڑے مناسکھ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ میں لحاف میں بھری بنا کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کبڑے کو دیکھ کر مجھ پر یہ عقدہ کھل گیا کہ پولیس کو اب تک اطلاعات کون پہنچاتا رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ راکفل میرے پاس ہی تھی، جی چاہا ابھی کبڑے کو بھون دوں، مگر خود پر قابو پا لیا۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر بخاروں کا سردار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

”اے بوڑھے! یہاں کوئی ڈاکو آیا ہے؟“ متا کے ایک ماتحت نے دبنگ آواز میں سردار سے پوچھا۔

”ڈاکو..... صاحب! کچھ دیر پہلے ادھر سے چار گھڑسوار گزرے تھے۔ کیا وہ ڈاکو تھے؟“ یہ کہہ کر سردار خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ”بھگوان بھلا کرے کہ ہم بچ گئے۔ ہمارے قافلے میں آج کی رات ویسے بھی کوئی مرد نہیں ہے۔ میرے سوا سب ایک دوسرے گاؤں گئے ہوئے ہیں جہاں کل ہمارا پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے۔ اپنی عورتیں اور بچے وہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اگر ان عورتوں پر ڈاکوؤں کی بڑی نظر پڑ جاتی تو جانے کیا ہوتا۔“

سردار کی باتیں سنتے ہوئے متا نے تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر وہ مضبوط قدموں سے چارپائیوں کی طرف بڑھا۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اسی لمحے میں نے وجہ کے جسم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے وجہ کے جسم سے نکل کر تیزی کے ساتھ عدار کبڑے کی طرف لپکا۔ مجھے وجہ کے جسم کو بھی پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچانا تھا کیوں کہ میں ابھی اس کے جسم سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

کبڑے کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے پہلو پر ضرب لگائی اور وہ چیخ اٹھا۔ متا کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”کیوں کیا ہوا؟“ متا نے پلٹ کر پوچھا۔

”چپ حرامزادے!“ میں نے متا کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا؟“ متا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”مجھے کس نے گالی دی؟“

”کبڑے بد معاش نے۔“ میں دھیرے سے پھر اس کے کان میں بولا۔ ”یہ کبڑا“ وجہ سے ملا ہوا ہے۔“

”کیوں بے کبڑے! تو مجھے ڈبل کر اس کر رہا ہے؟“ متا نے آگے بڑھ کر کبڑے کا گریبان پکڑ لیا۔ اسی وقت میں کبڑے کے جسم میں گھس گیا۔

”نن..... نہیں تو سرکار!..... میں تو وجہ کا بھڑے ہوں۔“ کبڑے کی زبان میں اب میں

دل رہا تھا۔

”بھرقار کر لو اسے۔ اس کینے نے اعتراف جرم کر ہی لیا آخر۔“ متا نے پولیس والوں کو حکم دیا۔ ”اے او متا! تو مجھے پکڑ سکتا ہے مگر وجہ کو تیرا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا۔“ میں نے متا کو مخاطب کیا۔

پھر ادھر متا کا ہاتھ گھوما اور ادھر میں کبڑے کے جسم سے باہر آ گیا۔ کبڑے کے منہ پر بڑا زوردار تھپڑ پڑا تھا۔

”صاحب! مجھ..... مجھ غریب کو کیوں مار رہے ہیں؟“ لمحے بعد ہی کبڑے نے روتے ہوئے پوچھا۔

”کتنے! میں تجھے یہ تھانے چل کر بتاؤں گا۔“ متا نے دانت پس کر کہا۔ اس وقت تک کبڑے کو ہتھکڑیاں پہنائی جا چکی تھیں، مگر وہ پولیس کا نہیں میرا مجرم تھا۔ میں نے اسی لئے پھر اس کی دھنائی شروع کر دی۔

”ہائے مر گیا..... مر گیا۔“ کبڑا زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ اسی لمحے میں نے کبڑے کو زمین سے اٹھا کر دوبارہ بچ دیا۔ دیکھنے والوں کو یہی نظر آیا ہو گا کہ کبڑا اچھل کر خود سر کے بل زمین پر گرا ہے۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ ایسا ہی کیا اور کبڑے کی کھوپڑی بچ گئی۔

متا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں کبڑے نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ وجہ کا کوئی وفادار ساتھی تھا اسی لئے خودکشی کر کے مر گیا تاکہ پولیس اس کی زبان نہ کھلوا سکے۔ اس کی لاش اٹھاؤ اور چلو۔“

پولیس ذرا ہی دیر میں کبڑے کی لاش اٹھا کر وہاں سے چلی گئی اور میں دوبارہ وجہ کے جسم میں اتر گیا۔ پھر صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے چل دیا۔

جلدی ہی میں اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ گیا جو ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ ”ٹھکانہ اور کندن زخمی ہیں۔ مرہم پٹی کر کے انہیں سلا دیا گیا ہے۔“ ہری نے رپورٹ دی، پھر پوچھا۔ ”تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟“

میں نے اپنے ساتھیوں کو کبڑے مناسکھ کی غداری سے آگاہ کر دیا، اسی کے ساتھ کبڑے کو انجام تک پہنچا دینے کی خبر بھی سنا دی۔ اس کے لئے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا۔ ظاہر ہے میں انہیں حقیقت سے کس طرح آگاہ کر دیتا۔ میں نے بات بنائی کہ ایس بی متا دو ایک بخاروں کے لحاف اٹھا کر دیکھنے اور مطمئن ہونے کے بعد چلا گیا۔ کبڑا بخاروں کے ساتھ عیش کرنے کے لالچ میں وہیں رہ گیا۔ کبڑے نے اس سلسلے میں سردار سے بات کی۔ پولیس جا ہی چکی تھی۔ موقع دیکھتے ہی میں نے کبڑے کو دیوچ لیا۔ اسے چیتنے تک کی مصلحت نہیں ملی۔ میں نے آخر میں کہا۔ ”مجھے اس بخارے سردار کی دوستی پر فخر ہے جس نے مجھ پر اعتماد کیا اور اپنی عورتوں کے درمیان سلا دیا تاکہ میری جان بچ جائے۔ جب تک ہماری نیت ٹھیک

ہے، کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

☆=====☆

چار دن بعد میں پھر گھوڑی پر سوار ہو کر شادی کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس بار میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کر کے ہی لوٹوں گا۔ میرے ساتھی بھی یہی فیصلہ کر چکے تھے۔ بار بار پولیس کے خوف سے شادی ملتوی کرنا میری بے عزتی تھی۔ میں چاہتا تو کبڑے ہی کی طرح ایس بی متا کو بھی ختم کر سکتا تھا، مگر میرے نزدیک یہ بے سود تھا۔ اس سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ میں اسے مار دیتا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ آ جاتا اور ممکن ہے کہ وہ متا کی طرح ہمارے نہ ہو۔ دشمن بھی مجھے چھوٹا پسند نہیں تھا۔ ہری نے اس موقع پر بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ ”اس بار چاہے کچھ ہو جائے ہم وجہ کو بیاہ کر ہی لائیں گے۔“

تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس مرتبہ وجہ کے رشتے کے ایک چچا کی بستی میں شادی کا بندوبست کیا گیا۔ سروج کو شادی کے منڈپ تک میک اپ میں لانے کی ذمہ داری میرے ساتھیوں کی تھی۔ وجہ کی ماں مایا کور کو پولیس کی نظروں سے بچا کر وہاں پہنچانے کا کام وجہ کے ماموں خشونت کے سپرد تھا۔

میں نے اپنے منصوبے کے مطابق گردہ کے دو حصے کر دیے۔ ہری اور شکر میں ساتھیوں کے ہمراہ شادی کی تمام رسوم کے ذمے دار تھے۔ دوسرے گروپ کو شادی کے وقت ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالنا تھا تاکہ پولیس کی توجہ شادی کی طرف سے ہٹائی جاسکے۔ رات کے تین بجے یہ ڈاکہ ڈالا جانا تھا۔ شادی کا وقت صبح کے قریب رکھا گیا تھا۔

متانے اب سروج کے گھر کی نگرانی بھی شروع کرادی تھی۔ نگرانی کرنے والوں کو ڈانچ دے کر میرے ساتھی، سروج کو نکال لائے۔ یہ پروگرام طے کیا گیا تھا کہ کنیادان کے لئے بٹن سنگھ رات کو اپنے گھر سے چلے گا۔ گاؤں کے باہر ایک گھڑسوار اسے لانے کے لئے موجود تھا۔ شادی کی رسوم کے لئے دھرم گرو کا انتظام وجہ کے چچانے کیا تھا۔ میں اپنی زندگی کا ایک سنسنی خیز خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔

بعد میں اپنے مخبروں اور دوسرے ذرائع سے مجھے جن واقعات کا علم ہوا، انہیں میں واقعات کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے پہلے ہی بیان کئے دے رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ دو دھیا گاؤں میں ایس بی متا نے جن سادہ لباس پولیس والوں کو بٹن سنگھ کے گھر کی نگرانی پر مامور کیا تھا، انہی میں سے ایک نصف شب کے بعد متا کے پاس پہنچا۔ متا اس وقت سو رہا تھا۔ اسے جگایا گیا۔ نگرانی کرنے والے نے متا کو بتایا۔ ”سر! سروج کا باپ اپنے گھر سے غائب ہو چکا ہے۔ مکان میں روشنی ہو رہی ہے، مگر دروازہ پینے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ برآمدے کی دیوار پھاند کر اندر جانے پر ہمیں پتا چلا کہ باپ بیٹی دونوں غائب ہیں۔“

”تمہیں جبک مارنے کے لئے وہاں نگرانی کرنے چھوڑا گیا تھا؟“ متانے غصے میں چیخ کر کہا۔

اس نے جلدی جلدی اپنی وردی پٹنی اور بیٹل میں پستول پھنسا کر فوراً ہی باہر آگیا۔

”جاؤ دیکھو وجہ کے گھر میں اس کے ماں باپ بھی ہیں یا نہیں؟“ متانے حکم دیا۔ ”اگر وجہ آج رات شادی کر رہا ہے تو اس کے والدین بھی گھر پر نہیں ہوں گے۔ کسی نہ کسی طرح مکان میں داخل ہو کر انہیں چیک کرو، سمجھو، مجھے ایک گھنٹے کے اندر جواب چاہئے۔“

”بہتر جناب!“ سادہ لباس پولیس والے نے متا کو سیلوٹ کیا، پھر پوچھا۔ ”اگر وہاں نہ ملیں سر! تو پھر؟“

”پھر بھی تم اپنی مخسوس شکل مجھے ضرور دکھاؤ گے۔“ متانے جواب دیا۔

وہ ایک گھنٹہ ایس بی متانے اضطرابی کیفیت میں گزارا۔ علاقے کے چھوٹے بڑے ڈھائی سو دیہات میں میری شادی کس گاؤں میں ہو رہی تھی، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

برق رفتار گھڑسوار پولیس والا گھنٹے بھر میں لوٹ آیا اور متا کو بتایا۔ ”گھر میں وجہ کا باپ تو موجود ہے مگر ماں نہیں ہے۔ ہمارے دریافت کرنے پر پہلے تو سوہن سنگھ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا، پھر بتایا کہ وجہ کی ماں مایا کور اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔“

”وجہ کا ماموں خشونت سنگھ نظر آیا؟“ متانے سوال کیا۔

”نہیں، وہ بھی مایا کور کے ساتھ گیا ہے۔“ جواب ملا۔

”تب تو وہ آج ہی رات شادی کرے گا۔ مجھے اپنی عزت خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ کتنے انوس کی بات ہے کہ پولیس کا محکمہ سوتا رہتا ہے۔ تم لوگوں سے بہتر تو گلی کے خارش زدہ کتے ہیں جو رات بھر ایک اچھے چوکیدار کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وجہ دھرم نگرانی میں شادی کر رہا ہے۔“

پھر متانے اپنے ساتھ بیس مسلح پولیس والے لئے اور دھرم نگرانی کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس نے وجہ کے نانا کے گھر ایک سادہ لباس پولیس والے کو بھیجا۔ پولیس والے نے گھر کے دروازے پر دستک دی اور بلند آواز میں پوچھا۔ ”مکان میں کوئی ہے؟“

بوڑھے نانانے ذرا ہی دیر میں دروازہ کھول دیا۔ اسے ایک شخص گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا نظر آیا جس کے چہرے سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔

”کیوں بھائی! کیا بات ہے؟“ بوڑھے نانانے اجنبی شخص سے معلوم کیا۔

پولیس والا جواب میں بولا۔ ”میرے بزرگ! میں ٹانک پور سے آرہا ہوں۔ اہم اطلاع پہنچانی ہے۔ سوہن سنگھ کے سینے میں اچانک درد ہو گیا ہے لہذا وہ وجہ کی ماں کو یاد کر رہے ہیں۔ میں انہیں لینے آیا ہوں۔“ پولیس والا، متا کا پڑھایا ہوا سبق دہرانے لگا۔

”آپ اکیلے آئے ہیں کیا؟“ بوڑھے نانانے پوچھا۔

وہ شخص بوکھلا سا گیا اور پھر اس نے سنبھل کر چاروں طرف دیکھا۔ ”جی ہاں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”خشونت، وجہ کے والد کی خدمت اور دیکھ بھال کر رہا ہے۔“

بوڑھے نانانے بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اجنبی شخص اسے بے

وقوف بنا رہا ہے۔ یقیناً یہ کوئی چکر ہے۔

”وجہ کی ماں یہاں نہیں ہے۔“ جہاں دیدہ بوڑھے نانا نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں ہیں؟“ اجنبی حیرت سے بولا۔ ”تب پھر وہ کہاں ہے آپ مجھے بتائیں تاکہ میں وہاں جا کر انہیں اطلاع کر دوں۔“

بوڑھا نانا دھکلی آنکھوں سے اجنبی شخص کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آئے والا شخص کس کے اشارے پر جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے تو صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ وجہ کی ماں کہاں ہے۔ اجنبی کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ پولیس کو اگلے راستے پر لگانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ بوڑھا اسی لئے نرم سے بولا۔ ”وجہ کی ماں تو اس وقت ٹانگ پور پہنچ چکی ہو گی۔ کیا تمہیں راستے میں کوئی ریزہ نظر نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ اجنبی نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانک تھی۔

اجنبی واپس جانے لگا تو بوڑھے نانا نے اس سے کہا۔ ”سوہن سنگھ سے کتا“ صبح میں اسے دیکھنے آؤں گا۔“

متا کو یہاں بھی ٹھکانا ہی ہوئی۔ اس کی عیاری کا جواب وجہ کے بوڑھے نانا نے دے دیا تھا۔ متا بات سمجھ گیا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی منزل طے کر رہی تھیں۔ متا کی حالت کسی ہینکے ہوئے مسافر کی طرح تھی جو اندھیرے میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔ وہ دوبارہ پولیس اسٹیشن آگیا۔ وہاں ایک شخص اس کا منتظر تھا۔

”جناب! جلدی کیجئے۔“ وہ شخص تیزی سے بولا۔ ”ہمارے گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ شاید وہ وجہ کا گروہ ہے۔“

متا کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”تم کون ہو؟ تمہیں اطلاع دینے کس نے بھیجا ہے؟“ متا نے دریافت کیا۔

”گاؤں کے کھیا نے مجھے بھیجا ہے۔ تقریباً تین بجے وہ گاؤں میں داخل ہوئے ہیں۔“ متا نے پاکٹ وچ پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چار بج چکے تھے۔ پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ پچیس تیس مسلح پولیس والوں کو ساتھ لے کر وہ متاثرہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے گھیرے میں لینے کی امگ اسے تیز رفتاری پر آکساری تھی۔

وہ مطلوبہ گاؤں پہنچا تو لوگوں نے کہا کہ ہمیشہ ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بعد پولیس آتی ہے۔ لٹ جانے والوں کو تسلی دے کر آپ بھی لوٹ جائیں گے۔

پوچھ گچھ کرنے پر پتا چلا کہ میرے ہی گروہ نے وہاں ڈاکا ڈالا ہے۔ وہاں شادی وغیرہ کا چکر نہیں تھا۔ متا چکر کر رہ گیا۔

”گروہ میں وجہ خود بھی موجود تھا یا نہیں؟“ متا نے معلوم کیا۔

”اسے کوئی جانتا ہو تو پتا چلتا جناب! پھر چروں پر ڈھائے باندھے ہوئے ڈاکوؤں کی پہچان کس طرح ہو سکتی ہے۔“

”پھر تم لوگوں نے مجھے اتنی دیر میں کیوں خبر بھیجی؟“ متا غصے سے بولا۔

”خبر! گاؤں کا کھیا حیرت زدہ ہو کر کھنے لگا۔“ ڈاکو گاؤں کا عاصرو کئے ہوئے تھے، ایسے میں آپ کے پاس ہم خبر کیسے بھیجتے جناب! ڈاکوؤں نے گاؤں سے باہر جانے والوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی تھی۔“

”مگر میرے پاس خبر لانے والے نے تو بتایا تھا کہ اسے اطلاع پہنچانے کے لئے تم نے بھیجا ہے۔“ متا کو اس معاملے میں کوئی اور ہی چکر نظر آیا۔ کھیا کہنے لگا۔ ”ہم میں سے کسی نے آپ کے پاس اطلاع نہیں بھیجی جناب! آپ کے آنے پر تو ہم خود حیران تھے۔“

پھر متا کچھ نہ بولا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ ”ضرور اس میں کوئی چال ہے۔“ اس کا انداز خود کھامی کا سا تھا۔ ”تو کیا وہ آدمی وجہ کا تھا؟ مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟“

کچھ سپاہیوں کو مفرد ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ کیا گیا، کچھ کو وہاں تفتیش کی غرض سے روک دیا گیا تاکہ وہ رپورٹ تیار کر سکیں۔ خود متا پولیس افسران کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ وجہ نے کوئی چکر دینے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ متا کے قریبی ماتحتوں میں میرے تجربے موجود تھے۔

گھر واپس پہنچنے کے بعد ابھی متا سستایا بھی نہیں تھا کہ ایک شخص لنگڑاٹا اور ہانپتا ہوا آیا۔ وہ متا کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

”صاحب!“ یہ کہتے ہوئے وہ بڑی طرح لڑکھڑایا۔

متا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ متا نے دیکھا، اس شخص کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا، آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور تیزی سے چلنے والا سانس اس کے خون کی تیز گردش کا ہتادے رہا تھا۔ متا نے اسے فرش پر لٹایا اور کہا۔ ”تم بہت زیادہ زخمی ہو۔ ہسپتال جانے کی بجائے میرے پاس کیوں آ گئے؟“

”صاحب!.....“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

متا نے پانی کا گلاس منگوا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ زخمی شخص جلدی جلدی پانی پینے لگا جیسے بھاس سے اس کا حلق خشک ہو۔ متا سمجھ چکا تھا کہ زخمی شخص اس کے لئے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

زخمی شخص بڑی مشکل سے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ”ہمارے گاؤں میں وجہ کی شادی ہو رہی ہے۔ میں یہی اطلاع دینے کی غرض سے چھپ کر گاؤں سے باہر آیا، مگر ڈاکوؤں کو پتا چل گیا۔ میں بھاگا تو ایک ڈاکو کی گولی نے میری ران چیر دی۔ بڑی مشکل سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ غریب آدمی ہوں حضور! لہذا انعام مجھی کو دلانیے گا۔“

آخری الفاظ کے ساتھ ہی زخمی شخص پر ہتھیوں کا دورہ پڑ گیا۔ پھر اس نے ایک لمبی ہتھی لی اور روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔

میتا اس شخص کے بے جان چہرے کو دیکھنے لگا جو اس کے لئے بہت قیمتی خبر لے کر آیا تھا، مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مرنے والا شخص اپنے گاؤں کا نام نہیں بتا سکا تھا۔ میتا کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پوری اطلاع بے سود ہو گئی تھی۔ وہ غور سے مقتول کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے مگر زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔ اب وہ میتا کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میتا مایوس ہو جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کی نظریں دروازے کے باہر سے مقتول کے جسم تک خون کی لکیر پر جم گئیں اور اس کی آنکھیں اسی کے ساتھ چمک اٹھیں۔ وہ تیزی سے پلٹا اور خون کی لکیر دیکھتا ہوا اپنے مکان سے باہر سڑک پر آ گیا۔ مزید کچھ سوچنا لاحاصل ہی تھا۔ آٹھ دس سپاہیوں کے ساتھ وہ خون کی لکیر کے سارے آگے بڑھنے لگا۔

☆=====☆

آسمان سے سورج کی پہلی کرن نے زمین پر آ کر صبح کا اعلان کیا۔ اسی وقت میں اور سورج مقدس گرد گرنتھ کے سامنے بیٹھ کر دھرم گرد کی آوازیں اپنی آواز ملا کر مقدس کتاب کے الفاظ دہرانے لگے۔ پھر پھیرے شروع ہوئے۔ جہاں تک مقدس الفاظ کی ایک سطر پوری ہوتی ہم گرنتھ صاحب کا پورا پکر لگاتے ہوئے بیٹھ جاتے۔ میرے سر پر سرا بندھا ہوا تھا اور سورج کا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ آئین میں بندھے ہوئے شامیانے کے نیچے شادی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں۔ وجہ کی ماں، سورج کا باپ، خشونت سنگھ اور دوسرے کچھ قریبی رشتے دار موجود تھے۔ دھرم گرد (سکھوں کا مذہبی رہنما) جب مقدس کتاب کے چار پھیرے کے الفاظ پڑھ لے تو شادی کی رسم پوری ہوتی ہے۔ مجھے اور سورج کو پھیرے لگاتے دیکھ کر مسرت سے لبریز مسکراہٹ کے ساتھ وجہ کی ماں مایا کور بھگوان کا شکر ادا کر رہی تھی۔ ”بھگوان! میرے خاندان کی لاج رکھنا۔“

چوتھا پھیرا ختم ہوتے ہی دور سے رانگل کا دھماکہ سنائی دیا۔ سب چونک کر ہوشیار ہو گئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری شادی کی خوشی میں پولیس موت کا پیغام بن کر آگئی ہو۔ ہر لمحہ لوگوں کو جیسے ایک یقینی موت سے قریب کر رہا تھا۔ سب سنائے میں تھے۔

”آپ رسم جاری رکھیں۔ ہم پھیرے کرتے رہیں گے۔ اب شادی نہیں رکے گی۔“ میری مضبوط اور ٹھہری ہوئی آواز سنائے میں گونجی۔

چار پھیرے ایک طرح سے لازمی ہیں اور بقیہ تین پھیرے خوش بختی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ دنا دن گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سورج نظریں جھکائے ہوئے میرے ساتھ بقیہ پھیرے کر رہی تھی۔ ان تینوں پھیروں کا ثواب عقیدے کے مطابق الگ سے ملتا ہے۔ سورج کے قدم مضبوطی سے حرکت کر رہے تھے۔ نئی زندگی کے راستے پر چلتے ہوئے اس کے قدموں میں ذرا سی بھی نفرت نہیں آ رہی تھی۔

جیسے ہی پھیرے پورے ہوئے میں نے اپنے چہرے سے سرا اٹھایا اور سورج کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر ہم دونوں بطور تعظیم مایا کور کے آگے جھک گئے۔

”تمہاری جوڑی سلامت رہے۔“ مایا کور نے ہمیں دعا دی۔

رانگلوں کے دھماکوں کی آوازیں اب قریب سنائی دے رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ شور بھی تھا۔ مایا کور نے مجھے اور سورج کو مکان کے دروازے کے درمیان کھڑا کر کے جلدی جلدی رسوم ادا کیں۔ اسی کے بعد میں فوراً اپنی گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اسے ایڑ لگائی۔

وہاں سے میرے فرار کے بعد جو کچھ ہوا مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ایس پی میتا اس وقت وہاں پہنچا جب میں فرار ہو رہا تھا۔ اٹھتے ہوئے غبار کی جانب اس نے پستول کا رخ کر کے فائرنگ شروع کر دی، مگر پستول کے فائر کی ریخ کم تھی، فائر بیکار ثابت ہوئے۔ اس نے گرج کر سپاہیوں سے کہا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو، گولی چلاؤ۔“

پستول سے زیادہ رانگل لہا فائر کر سکتی تھی، مگر میری گھوڑی سمجھدار تھی۔ نشانہ خالی دینے کے لئے میں نے لگام سے اسے اشارہ دیا اور مانک تیزی سے لہرائی ہوئی دوڑنے لگی۔ مضطرب میتا نے ایک سپاہی سے رانگل لے کر دو ایک فائر داغ دیے، مگر کامیاب نہیں ہوا اور گھوڑی اپنے سوار کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میتا ہاتھ لگی بازی ہار گیا اور تحسک سے مغلوب ہو کر بیٹھ گیا۔ آج آدمی رات کے بعد وہ چند لمحوں کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ مایا کور اندر گئی اور پانی کا گلاس میتا کے لئے لے آئی۔ اپنے لاڈلے بیٹے پر گولی چلانے والے پولیس افسر کو پانی کا بھرا ہوا گلاس دینے والی بہادر ماں کو متا حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میتا پانی پی کر کچھ کتا، مایا کور نے اپنی نئی ٹوبلی ہو سورج کو حکم دیا۔ ”ہو بیٹی! میتا صاحب کے چرن چھوؤ۔“

ساس کا پہلا حکم سورج کے لئے امتحان تھا۔ جو شخص اس کا سہاگ لوٹنے شادی کے منڈپ تک آ پہنچا تھا، اس کے پیر چھوٹے کا حکم تھا۔ پھر بھی وہ اپنی ساس کے حکم کی تعمیل میں جھک گئی۔ اس نے میتا کے سامنے سر جھکایا۔ میتا جیسے امتحان میں پڑ گیا۔ ابھی ابھی بیانی ہوئی لڑکی اس کے پیر چھو رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائے دیتا تو یہ ظلم ہوتا۔ پستول اس نے بیٹھ میں بنے ہوئے کیس کے اندر رکھ لیا۔

میتا نے سورج کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ”چند لمحے پہلے میں تمہارے شوہر پر گولی چلا رہا تھا، مگر اس وقت میں قانون کے نگہبان کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اب تمہارے بزرگ کی حیثیت سے اور تمہیں اپنی بیٹی سان (کی طرح) سمجھ کر دعا دیتا ہوں کہ تمہارا سہاگ ہمیشہ سلامت رہے۔“

پھر مایا کور، دولہا کے بغیر اپنی ہو کو نانک پور لے آئی۔ ایس پی میتا پرامید تھا کہ میں سہاگ رات منانے نانک پور ضرور آؤں گا۔ اس وقت اسے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ مجھے تمام اطلاعات مل گئیں کہ نانک پور کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

شادی کر کے سورج سے نہ ملنا خود سورج کے ساتھ بھی ظلم تھا اور اپنے ساتھ بھی۔ یہی سوچ کر

شادی کے پانچویں دن میں نے اپنے خیر کو ناک پور بھیجا۔ میں نے اس کے ذریعے وجہ کے گھر یہ کہلوا یا تھا کہ میرا ناک پور آنا خطرے سے خالی نہیں لہذا سرج کو ناک پور سے بھیجنا پڑے گا۔ میں نے سرج کو نہایت رازداری کے ساتھ اس کے میکے بھجوانے کو کہا تھا۔ ساتویں دن شام کو سرج مردانہ لباس میں لوگوں کی آنکھوں سے بچ کر اپنے میکے دودھیا گاؤں پہنچ گئی۔ خجروں نے مجھ تک یہ خبر پہنچادی۔

میں اسی رات دودھیا گاؤں پہنچ گیا۔ آدمی رات کے قریب میں نے مکان کے عقبی دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے ایک کمرے میں سرج دلن بی بی بیٹی تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر سرج نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ سٹ گئی اور منہ پھیر لیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں آگے بڑھا اور مسہری پر بیٹھ کر سرج کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

سرج شرما کر کچھ آگے ہو گئی، پھر کہنے لگی۔ ”ٹھہریے“ میں آپ کے لئے کچھ لاتی ہوں۔“ وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

زرا دیر بعد وہ تھالی میں چاندی کا پیالہ لے کر واپس ہوئی۔ میں اسے پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حسن کا ایسا شاہکار تھی جس نے میرے دل کا سکون چھین لیا تھا۔

بستر پر بیٹھے ہوئے سرج نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ذعفرانی دودھ ہے۔“ اس کا نازک ہاتھ میری طرف بڑھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے پیالہ لیا اور دوسرے سے سرج کی کلائی تھام لی۔ شرم سے سٹ کر ہاتھ کھینچتی ہوئی سرج کو میں نے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم اس طرح شرماتی رہو گی تو صبح ہو جائے گی اور مجھے صبح ہونے سے پہلے چلے جانا ہے۔“ پھر دودھ کا پیالہ ایک طرف رکھ کر اس آدم زاد کو میں نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

رات کی خاموشی میں دو دل ایک دوسرے میں سما جانا چاہتے تھے۔ سرج نے چمت کی جانب چلتی ہوئی لالین کو دیکھ کر اشارہ کیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اٹھ کر لالین بچادی۔ سرج نے میرے قدموں پر گر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کے سکھ کی خاطر سب کچھ کروں گی۔“

اس کو اپنے قدموں سے اٹھا کر میں نے پہلو میں بٹھالیا اور بولا۔ ”میرے سکون کی خاطر؟ میرے ماں باپ کے سکون کی خاطر نہیں؟“

”آپ کے ماتا پتا کے سکھ الگ کب ہیں؟“ اب سرج کی قوت گویائی جیسے واپس آ گئی۔ وہ بلا جھجک بول رہی تھی۔

”نہیں سرج! یہ بات نہیں۔ میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میرے ماں باپ کو مجھ سے جو امیدیں“ سکتی تھیں، انہیں پورا کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ تمہاری ذمے داری اسی لئے بڑھ گئی ہے۔“ میں نے بے بات اس لئے کہی کہ وجہ کے والدین کو سرج اپنے والدین کی طرح سمجھے۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ان کے کسی حکم کو میں نہیں ٹھکراؤں گی، اس کا آپ یقین رکھیں اور کچھ؟“

”اور ہاں..... دوسری بات، مجھے ناچ گانے سے سخت نفرت ہے، تم اس بات کا خیال رکھنا۔“ پھر سرج کو دوبارہ میں نے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ لمحہ لمحہ بانہوں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد سرج کے چڑھتے ہوئے سانسوں کے ساتھ چوڑیوں کی جھٹکار کا جلتنگ کمرے میں گونجنے لگا۔ رات کا ثبات اپنی منزل طے کر رہا تھا۔

میں صبح ٹھکانے پر واپس پہنچا تو میرے چاروں قریبی ساتھیوں نے شریر مسکراہٹوں سے میرا استقبال کیا۔ ہری نے شرارت کا آغاز کیا۔ ”بھابی کی بانہوں سے بہت جلد نکل آئے؟ آخر ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“

”بیٹے! تیری بھی باری آئے گی۔“ میں بولا، پھر اسے چھیڑا۔ ”سرج نے تیرے لئے ایک لڑکی تلاش کر لی ہے۔“

”میرے لئے؟“ ہری نے حیرت سے کہا۔ ”تعب ہے کہ بھابی آتے ہی میرے لئے فکر کرنے لگی ہیں۔ بتاؤ تو وہ لڑکی کیسی ہے؟“

میں نے اپنے بقیہ تینوں ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی کی وہ بہت تعریف کر رہی تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے، ایک بار دیکھ کر بھلائی نہیں جاسکتی۔ ذاتی طور پر تیرے لئے مجھے وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔“

”مگر مجھ جیسے آوارہ گرد سے وہ شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی؟“ ہری نے پزمرت لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں کرے گی، وہ تیری بھابی کی ہر بات مانتی ہے، انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر میں دانستہ دوسری باتیں کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ہری کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی اٹھا۔ ”ابھی تم بھابی سے ملاقات کر کے آئے ہو، دوسری باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ کوئی دلچسپ بات کرو کہ لطف بھی آئے۔“

”کیا دلچسپ بات کروں؟“ میں نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے سوال کیا۔

”اسی لڑکی کی بات۔ وہ کیسی ہے؟ کچھ اس کی بات کرو۔“ ہری دل کی بات زبان پر لے آیا۔

”اچھا تو سنو۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”وہ لڑکی بہت زیادہ حسین ہے، صرف ایک کمزوری ہے کہ کافی ہے لیکن یہ کوئی خاص برائی نہیں ہے۔“ میں نے تینوں ساتھیوں کو پھر مخصوص اشارہ کیا۔

”ہاں ہری!..... کافی لڑکی تو اچھی رہے گی۔ ایک آنکھ سے وہ صرف تم ہی کو دیکھے گی۔“ رگھوپر بھی میری تائید میں سنجیدگی سے بولا۔

شکر بھی پیچھے نہ رہا۔ اس نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔ ”پھر ایک اور بھی فائدہ ہے۔ وہ ہماری طرف یا کسی دوسرے کی جانب دیکھ ہی نہ سکے گی۔ ہری کے لئے یہی لڑکی مناسب رہے گی۔“

ہری نے خاموشی اختیار کر لی تو میں نے مزید کہا۔ ”اس کی آواز کسی کو نکل کی طرح ہے۔ تیری بھابی تعریف کر رہی تھی۔ بس سنے جاؤ، دل ہی نہ بھرے لیکن ذرا ہلکاتی ہے۔ جب تک وہ اپنی بات پوری نہ کر لے، انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ اس مرتبہ موہن بول اٹھا۔ ”وہ مرد خوش نصیب ہوتا ہے جس کی بیوی زبان دراز نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں ہری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

”ہاں ایک بات اور یاد آئی۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں لیکن.....“

ہری کی قوت برداشت جواب دے گئی بولا۔ ”اس میں بھی کچھ ہے؟“

”ہاں یار! اس کے اگلے دانت تھوڑے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ پاؤں بڑے خوبصورت ہیں، مگر ذرا مالتھاتی ہے اور پشت پر چھوٹا سا کبڑ ہے۔ ویسے لڑکی حسین ہے۔“

”بس بس بہت ہو گیا۔“ ہری غصے سے چیخ اٹھا۔ ”مطلب یہ ہے، اس کے جسم کا کوئی حصہ صحیح نہیں ہے اور میرے لئے بھابی نے ایسی لڑکی پسند کی ہے۔“

ہری کے چہرے کو دیکھ کر ہم سب کی ہنسی پھوٹ گئی۔

”ایسی لنگورنی کو بیاہنے سے تو کل دالی خن بانو بہتر ہے۔ اس سے کبھی کبھی ملاقات ہو جائے تو بہتر ہے۔“ ہری نے کہا۔

”کل دالی خن بانو؟“ میری پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”کل رات تم لوگ کہاں گئے تھے؟“ میرے لہجے میں سختی آگئی۔

چاروں ساتھی ایک دوسرے کو مجرموں کی طرح دیکھنے لگے۔ ہری کی زبان پر یقیناً ایسی بات آگئی تھی جو ان لوگوں کو مجھ سے چھپانا تھی۔ وہ سب خاموش رہے اور میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان کی خاموشی میں کسی اخلاقی جرم کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو سختی سے یہ تاکید کر رکھی تھی کہ وہ بازاری عورتوں سے دور رہیں۔ میری غیر حاضری میں وہ یہ ہدایت بھول گئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے ساتھیوں نے میرا کوئی حکم نہیں مانا تھا۔ میرے نزدیک یہ کافی سنجیدہ معاملہ تھا۔

”تم لوگوں کو میں نے منع کیا تھا۔“ میں پھر سختی سے بولا۔ ”اس کے باوجود تم لوگ اسی راستے.....“

”ہم نے وہاں جا کر کوئی پاپ (گناہ) نہیں کیا۔“ شکر بول اٹھا۔ ”ناچ دیکھنا کوئی جرم یا پاپ تو نہیں۔“

”ناچ؟“ مجھے غصہ آگیا۔ ”تم لوگ پاپ کی بات کر رہے ہو، مجھے ناچ سے سخت نفرت ہے، مگر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں پاپ کو بھی درمیان میں لانا نہیں چاہتا۔ بے گناہی پر کمر کرنے والوں کو جس بات سے بچنا چاہئے سوال اس کا ہے۔ بازاری عورت کسی کی رشتے دار نہیں ہوتی۔ وہ تو تمہیں دو گھڑی خوش کرنے کے لئے اپنے جسم کو تھرکاتی ہے، صرف پیسے کی خاطر۔ وہ پیسے کے لالچ میں کیا تمہیں گرفتار نہیں کر دے

گی، اس کا کیا ثبوت ہے؟“ میری آواز تیز ہوتی گئی۔ ”قانون سے بغاوت کرنے والے بڑے بڑے جی دار ایسی ہی پیشہ ور عورتوں کے جال میں پھنس کر مارے گئے۔ ایسا ہی سنہرا جال بچھا کر پولیس جہیں دھرے، اس سے زیادہ ایک ڈاکو کے لئے کوئی بے عزتی نہیں۔ کسی ٹاپنے والی کی پائل سے گھائل ہو جانا بڑی ذلت کی بات ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ہم گولیوں کا راگ سننے ہوئے موت کو گلے سے لگا لیں۔ آج ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ کون کیا چاہتا ہے۔“ میں شدید غصے میں تھا۔ اس سے پہلے میرے ساتھیوں نے مجھے اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اسی لئے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ میں کچھ دیر بعد نرم پڑ گیا اور دھیسے لہجے میں کہا۔ ”مرد کی ہوس کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، مگر اس کے لئے تمہیں شادی کر لینا چاہئے۔ جان جو کھوں میں ڈال کر میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ پھر میں کوئی کچھ نہ بولا تو مجھے دوبارہ غصہ آنے لگا۔ ”میں ہی مسلسل بولے جا رہا ہوں، تم لوگ بھی تو جواب میں کچھ بکو۔“

”وہ! تمہاری بات صحیح ہے۔“ ہری ہمت کر کے بولا۔ ”اس حسن بانو نے جھک جھک کر بڑے پیارے انداز میں ہمیں پھر آنے کی دعوت دی ہے، یہاں تک کہ اس نے دوبارہ آنے کے بارے میں ہم سے تاریخ بھی معلوم کی۔ شاید وہ ہمیں پہچان گئی ہے۔ ہماری اس غلطی پر تم ہمیں جو چاہو سزا دے سکتے ہو۔“

”سزا۔“ میں نے ٹٹلتے ہوئے کہا۔ ”سزا تو میں اپنے آپ کو دوں گا۔ میں اب کبھی اپنی عورت سے نہیں ملوں گا۔ یہی ہمارے لئے بہتر ہے۔“

میری بات پر شکر کو غصہ آگیا اور بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ! کیا تمہارے خیال میں ہم اتنے کم ظرف ہیں کہ اپنے دوست کے سکھ سے جلتے ہوں۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر۔“ پھر اس نے شانے سے رانکل اور کارتوسوں کی بیٹ اتار کر میرے پیروں میں پھینک دی۔ ”سلام ہے ایسی دوستی کو۔“

شکر ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ میں نے اسے بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”شکر! اب تم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاؤ گے۔“ وہ رک گیا تو میں نے اس کی رانکل اور کارتوسوں کی بیٹ اٹھائی۔ پھر میں آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولا۔ ”آخری لمحات تک ساتھ بھالنے کا قول و قرار کرنے کے بعد تم اس طرح چلے جاؤ گے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ تمہاری بھابی سے میں ملتا رہوں گا مگر مینے میں صرف ایک بار۔“

شکر کی آنکھوں سے پیار کے جشے ابل پڑے۔ وہ پلٹا اور میرے سینے سے لگ گیا۔ اسی وقت ہری چکا۔ ”چلو میں اس اونٹ مار کا لڑکی سے شادی کر لوں گا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ حسن بانو جہنم میں جائے۔“

اس پر ہم سبھی ہنس پڑے۔

☆-----☆-----☆

میری شادی کے بعد دو ہفتے کسی سرگرمی کے بغیر گزر گئے۔ شادی سے قطع نظر درمیان میں اس طرح آرام کرنا میرا اصول تھا۔ میں اس عرصے میں نئے اسلحہ کی خریداری اور نئے آدمیوں کی بھرتی کا کام

تھیں۔

میں نے ایک مشعل الاؤ پر رکھ کر چلائی اور ریڑھوں کو گنا ان کی تعداد سات تھی۔ دونوں چٹانوں کے درمیان سامنے والے ریڑھے داخل ہو گئے۔ اسی لمحے میں نے اپنی راکفل سے فائر کیا اور فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ یہ ہوائی فائر تھا۔ پھر میں بلند آواز میں بولا۔ ”رک جاؤ۔“

ریڑھے والوں نے بیلوں کی لگائیں کھینچ لیں۔ میں مشعل بلند کر کے زمین پر اوندھالیت گیا۔ ”کون ہے؟“ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ”دنا دان“ کی آواز کے ساتھ دو گولیاں سنسناتی ہوئی مشعل کے قریب سے گزر گئیں۔ تیل فائرنگ سے بدکنے لگے۔ میں کسی قسم کی حرکت کے بغیر زمین پر لیٹا رہا۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید اور بھی جوانی فائرنگ میں ہوگی لیکن اس عرصے میں میرے ساتھیوں نے اندھیرے سے نکل کر پوری برات کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

”خبردار! اگر کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“ ہری کی گرجدار آواز سنائی دی۔

ان ریڑھوں میں سے تیسرے ریڑھے کے بیلوں کی آڑ میں ایک ہندوق بردار براتی چھپ گیا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہری کے سر کا نشانہ لیا، مگر مشعل کی روشنی میں فکر نے اس براتی کو دیکھ لیا پھر شکر نے جیتے کی طرح جست لگا کر اس براتی کی پشت پر جلتی ہوئی مشعل لگا دی۔

اس براتی کے منہ سے دل خراش چیخ نکل کر فضا میں بکھر گئی۔ رگھویر نے بھی اسی وقت گولی چلائی، مگر براتی اپنی جگہ سے ہل چکا تھا۔ سنسناتی ہوئی گولی ایک تیل کی گردن کے آر پار ہو گئی۔ تیل زور سے چیخا ہوا کودا۔ ساتھ ہی اس ریڑھے سے ہندھی ہوئی رسی بھی ٹوٹ گئی۔ ریڑھا ایک طرف الٹ گیا۔ مسلج براتی اسی کے نیچے دب گیا۔ اندر بیٹھے ہوئے تین آدمی باہر کی طرف گرے۔ دولہا اپنی گلواری کے ساتھ زمین پر چت گرا۔ ہری کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر وہ کپکپانے لگا۔

میں اسی عرصے میں اوپر سے اتر کر ان کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے تڑپتے ہوئے تیل کو گولی مار کی ٹھنڈا کر دیا، پھر زوردار آواز میں گرجا۔ ”تم لوگوں نے ذرا بھی چالاکی دکھانا چاہی تو چالاکی دکھانے والے کی لاش بھی مردہ تیل کے قریب نظر آئے گی۔“ قابو میں آئے ہوئے لوگوں کو وجہ بھی پریشان نہیں کرتا لیکن مقابلہ کرنے والوں کو معاف بھی نہیں کرتا۔“ یہ کہتے ہی میں نے اپنے ساتھیوں کو برات لوٹنے کا اشارہ کیا۔

میں نے دانستہ انہیں اپنا نام بتایا تھا۔ اس کا رد عمل توقع کے مطابق ہوا۔ براتی حواس باختہ نظر آنے لگی۔

عورتوں کی ناک، کان، گردنوں اور ہاتھوں پر سے سونے کے زیورات اترنے لگے۔ سخت سردی میں ہمارے خوف سے کپکپاتے ہوئے براتیوں میں سے ایک شخص نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا۔ ”تمہارا نام ہم نے بت سنا ہے۔ تمہاری پارٹی کبھی عورتوں کو نہیں لومتی یہ بھی ہم نے سنا ہے۔“

انجام دیتا۔ ڈاکے ڈالنے کے متعلق مجبوروں کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق تمام منصوبے بھی انہی دلوں میں تیار ہو جاتے۔ آدمی کتنے ہی قابل اعتماد کیوں نہ ہوں، میں اچانک ہی اپنے قیام کی جگہ بدل دیتا۔ کسی بھی وقت میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا کہ سامان باندھ لو۔ میرے ساتھی سمجھ جاتے کہ جگہ تبدیل کی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ مجھے محفوظ مقامات پر آسرا مل جاتا۔ میرے مقامی ساتھی اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی میری حفاظت کرنے کے سلسلے میں ہوشیار رہتے۔

ایک روز رات کے کھانے کے بعد ہم الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے ہاتھ گرم کر رہے تھے کہ ایک خبر آ

پہنچا۔

”ایک برات ریڑھے کے کچے راستے پر آ رہی ہے۔ وہ کسی زمیندار کی برات لگتی ہے۔ برات میں خاصے لوگ ہیں۔ اچھا مال ہاتھ آنے کی امید ہے۔“ خبر نے تفصیل بتائی۔

سب لوگ ہوشیار ہو گئے۔ برات کہاں؟ یہ روانہ ہوئی ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ یہ تفصیل معلوم کی۔ اندازاً برات کے ساتھ کتنے مسلح افراد ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی معلوم کر لیا گیا۔ کچھ خبر برات کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ میں نے کچھ ہی دیر میں اندازہ کر لیا کہ برات دو گھنٹے بعد ایک مخصوص جگہ سے گزرے گی۔ برات کو اس جگہ گھیرنے کا منصوبہ بنا کر میں اپنے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ مقررہ مقام تک پہنچ کر دو بلند چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ریڑھے کے کچے راستے پر اپنے گردہ کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ راستے کے دونوں جانب میری ہدایت پر ساتھیوں نے مورچے بنا لئے۔ سردی کم کرنے کے لئے دو جگہ چھوٹے چھوٹے الاؤ جلائے گئے اور برات کا انتظار ہونے لگا۔ ساتھ ہی تین چار مشعلیں بھی تیار تھیں۔ ڈاکہ ڈالتے وقت انہیں چلانا تھا۔ برات لوٹنے کے طریقے سے سبھی واقف تھے، پھر بھی میں نے انہیں سنبھالنا۔ ”دلہن کے جسم سے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری عورتوں کو پریشان کئے بغیر ان کے زیورات پر قبضہ کرنا ہے۔ میرا اگر مداخلت کریں تو ان کی حرمت کرنے کے سوا تمہیں قتل و غارت گری سے کام نہیں لینا۔ جیسے ہی میں آواز دوں چند آدمی سامنے اور چند عقب سے اور کچھ افراد درمیان سے انہیں پوری طرح گھیر لیں گے۔“

میری ہدایات سن کر سب نے اہانت میں سر ہلا دیئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد دور ہمیں روشنیاں حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔ روشنیوں کی قطار دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ برات کے سب سے پہلے ریڑھے آ رہے ہیں۔ میں نے دھیمی آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا۔ سب کی نظریں اندھیرے کے پار حرکت کرتی ہوئی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

اونچے نیچے راستے پر لڑھکتے ہوئے ریڑھے آہستگی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ریڑھوں میں لکڑی کی چھت سے لٹکی ہوئی لائینیں ریڑھوں کی حرکت کے ساتھ ہلتی ہوئی عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں جیسے اندھیرے میں ستارے ٹٹھرا رہے ہوں۔ ڈاکوؤں کا خطرہ ہونے کے باوجود برات رات کو کیوں آ رہی تھی اس پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو حیرت تھی۔

رات کے سنانے کو چرتی ہوئی بیلوں کے گلوں میں ہندھی ہوئی گھنٹیاں عجیب سا ساز بجا رہی

رہا ہے۔“

میں نے گھوڑی کی لگام کھینچ کر ایڑ لگائی اور گھوڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے روانگی سے قبل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا تھا۔ ”کوئی غریب بچی چیز کی وجہ سے کنواری رہ جائے، یہ ناانسانی میں برداشت نہیں کروں گا۔“

منزل مقصود سے پہلے ہی ہم گھوڑوں سے اتر گئے اور پھر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ ہم نے گھوڑوں کی لگائیں تھام رکھی تھیں۔

مطلوبہ مکان کے قریب رک کر میں نے سن گمن لی۔ منڈپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے جہاں شہنائیاں گونج رہی ہوں گی، وہاں سے اب ایک ارمان بھری کنواری کی ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ لڑکی کا غریب اور کمزور باپ سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہا تھا۔ لڑکی کی سوتیلی ماں کی زبان اس وقت قہقہی کی طرح چل رہی تھی۔ دھیمی آواز میں دولہے کے باپ نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کون ہیں۔

”اس لڑکی کے نصیب ہی خراب ہیں۔“ سوتیلی ماں زہرا گل رہی تھی۔ ”منڈپ تک آیا ہوا دولہا شادی کے بغیر لوٹ گیا۔ اب بیٹھی ہوئی رونے کا ڈھونگ رہا رہی ہے۔ اری بد نصیب، رونے سے تو یہ اچھا ہے کہ کسی کنوئیں میں ڈوب کے مر جا۔“

لڑکی کے نانا اور دوسرے گھر کے لوگ، لڑکی کی حمایت میں بولے کہ تم لڑکی کو تسلی دینے کے بجائے طعنے دے رہی ہو۔ برات واپس چلی گئی تو اس میں لڑکی کا کیا قصور ہے؟ قصور تو تمہارے گئے بیٹے کا ہے جو سوتیلی بہن کے زیورات لے کر فرار ہو گیا۔

”خبردار جو تم لوگوں نے میرے بیٹے کا نام لیا۔“ لڑکی کی سوتیلی ماں بھڑک اٹھی۔ ”وہ بے چارہ تو اپنے باپ کے ظلم سے تنگ آ کر گھر سے گیا ہے۔ زیورات چرانے کا اس پر الزام لگاتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ بھلا میرا بیٹا ایسا کیوں کرنے لگا۔“

زبانی جھگڑا مار دھاڑ میں تبدیل ہو رہا تھا کیوں کہ لڑکی کی سوتیلی ماں کے میکے والے بھی وہاں موجود تھے۔ اسی وقت ہم سب اندھیرے سے نکل کر وہاں پہنچ گئے۔ سب لوگ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ میرے ہاتھ میں پتول تھا اور شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔

”احق کے بچے! نیچے اتر۔“ میں نے دولہے کو بازو سے پکڑ کر گھوڑی سے اتارا۔

ہری نے زمیندار کو گھوڑی سے نیچے کھینچ لیا۔

”لڑکی کا باپ ادھر آئے۔“ میں نے بوڑھے کو قریب بلایا، پھر کہا۔ ”فوراً دھرم گرد کو بلاؤ اور شادی کا انتظام کرو۔“

یہ الفاظ سنتے ہی سسکتی ہوئی لڑکی نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ درود کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کا کابل آنسوؤں کے ساتھ ہمہ کر اس کے رخساروں پر پھیل گیا تھا۔ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

”تم نے غلط سنا ہے میرے دوست!“ میں تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”میں کسی عورت کی عزت نہیں لوٹا۔ عورت اگر اکیلی ہو تو اس کے زیورات پر بھی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیسے مرد عورت کی آڑ لے کر جس قدر ممکن ہو مال بچانے کی کوشش کرتے ہو۔ تمہاری چال میں سمجھ چکا ہوں۔ اس کے باوجود دلہن کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔“

”اس برات کے ساتھ دلہن نہیں ہے۔ دولہا بغیر شادی کے برات واپس لے جا رہا ہے۔“ دولہا کے باپ نے عاجزانہ لہجے میں بتایا۔ ”حضور! ہم تو دو طرف سے لٹے ہیں۔ لڑکی کا باپ بے ایمان نکلا۔ اس نے پہلے سے طے کیا ہوا چیز نہیں دیا اور واپسی میں یہاں بھی لٹے۔ بھگوان کے لئے ہمیں جانے دیں۔“

میں سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ ”برات منڈپ سے واپس آگئی۔ باپ کی عہد شکنی کا بدلہ تم نے بیٹی سے لیا۔ اس کا تم لوگوں نے بالکل خیال نہیں کیا؟“

”ہم اپنے بیٹے کو بیاہنے ہی تو گئے تھے۔“ دولہا کے باپ نے صفائی پیش کی۔ ”مگر طے شدہ چیز تو ملنا چاہئے تھا۔ آپ چیز دلوادیں تو ہم منڈپ کی طرف لوٹنے کو تیار ہیں۔“

میں نے اس کی پہلی پر گھونسا مار دیا۔ ”احق کے بچے! تو مجھ سے سودے بازی کر رہا ہے۔ مجھے لڑکی کا باپ سمجھتا ہے۔“ میں غصے سے پھر گیا۔ پھر دولہا کی فیض کا کار تھام کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ ”اٹو کے شے! تجھے بھی اپنی ہونے والی بیوی پر رحم نہیں آیا جو تو اسی طرح شادی کے بغیر بیرنگ لفافے کی طرح پلٹ آیا۔“

دولہا کے چہرے کا بچہ لگے اور اس نے جواب دیا۔ ”کیا کرتا، میرے باپو نے حکم دیا تو مجھے واپس آنا پڑا ورنہ مجھے خود بھی لڑ لڑی پسند ہے۔“

میں نے اسے دھکا دے کر الگ ہٹا دیا۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ پلو سے اپنا پتول نکال کر میں نے آواز لگائی۔ ”ہری!.....“ وہ دونوں میرے سامنے آگئے تو میں بولا۔ ”میری گھوڑی اور تم دونوں اپنے گھوڑے یہاں لے آؤ۔“ پھر میں نے موہن اور رگھویر کو بلا کر ہدایات دیں۔

میں کیا کرنا چاہتا ہوں، ظاہر ہے دولہا کا باپ کیا سمجھتا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہوا تھا۔

شکر اور ہری گھوڑے لے آئے تو میں نے زمیندار کو حکم دیا۔ ”چل گھوڑے پر سوار ہو جا۔“ پھر میں نے ہری سے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میں دولہے کو اپنی گھوڑی پر بٹھالیتا ہوں۔ ایک اور شخص بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔“

”مگر ہمیں آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟“ دولہے کے زمیندار باپ نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

”منڈپ میں۔ ہم تمہارے بیٹے کی شادی کرائیں گے۔“ میں نے زہر لی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

زمیندار کچھ کستا ہی چاہتا تھا کہ ہری نے اس کی پشت پر گھونسا جڑتے ہوئے کہا۔ ”چپ رہو، ہم کہتے ہیں، تم لوگ اسی طرح کرو گے۔ تم خوش نصیب ہو کہ وجہ تمہارے بیٹے کی شادی میں شرکت کر

وہیں کا مقابلہ کرتے ہوئے پولیس والے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ پولیس کے ساتھ لڑکی کا سوتیلا بھائی تھا جسے پھٹکڑی لگی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں چھوٹا صندوق نما ڈبا تھا۔ اس نے دلہن کے پاس سے کہا۔ ”تمہارا یہ صاب زادہ اچانک ہمارے ہت لگ گیا۔ ہم لوگ ڈاکوؤں کی تلاش میں گشت کر رہے تھے۔ یہ زورات کا ڈبا لے کر بھگ رہا تھا۔ ہم نے اس کو پکڑ کر مارا تو پتا چلا کہ یہ زورات چرا کر رو رہا ہے۔“

لڑکی کے باپ نے دانت پیس کر اپنے بیٹے کو دو چائے جڑ دیئے۔ ”کتے! بہن کی امانت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔“

دولہے کا باپ خوش ہو گیا۔ ”شاباش انس پک ٹر صاب! آپ نے ہم پر ایشان کیتا ہے۔“ یہ کہہ کر نے زورات کا ڈبا لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

سب انسپکٹر گرجا۔ ”اوائے چھڑ دے، عدالت میں مکدا چلے گا فریہ آپ کو ملیں گے۔ اس وکت یہ زورات سرکاری ہیں۔“

دولہا کا باپ جھینپ گیا۔ اسی کے ساتھ پولیس کی موجودگی میں اس کی اصلیت واپس آگئی۔ وہ سب پکڑ کو ایک طرف لے جا کر کچھ کہنے لگا۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں سن نہ سکا ہاں یہ ضرور دیکھا کہ سب انسپکٹر کی آنکھیں احمقوں کی طرح پھیل گئیں۔ چرے کے تاثرات سے میں سمجھ گیا کہ دولہا کے معاش باپ نے سب انسپکٹر سے کیا کہا ہو گا۔ سب انسپکٹر نے پستول کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا، یوں ا اپنی ”بمادری“ کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دے گا۔ اس نے اپنی ”بمادری“ کا پسلا مظاہرہ آخر کری

”مکان کو گھیر لو۔“ سب انسپکٹر دھاڑا۔ ”خبردار ڈاکو مغرور نہ ہونے پائیں۔“

اب مزید وقت نہیں رہا تھا، اس لئے میں نے لپک کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

”تو یہ کیا کر رہا ہے وجہ؟“ ہری بول اٹھا۔

”وہی جو کرنا چاہئے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جلدی کرو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

”لگتا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے۔“ ہری کہنے لگا۔ ”کمرے کا دروازہ بند کر کے نکلنے کی بات.....“

”بحث مت کرو۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ پھر میں اس کمرے میں بھیجی ہوئی چارپائی کی طرف بڑھا۔

پائی پر شکر اور ہری بیٹھے ہوئے تھے۔

”شاید خطرہ ہے۔“ شکر نے کہا اور چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شانے پر لٹکی ہوئی گن ہاتھ مائل کی تھی۔

”شاید نہیں، اس مکان کو پولیس گھیرے میں لے رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

جس کمرے میں ہم تھے، اس کی چھت گھاس پھوس، مٹی اور لکڑی کے شہتیروں کی بنی ہوئی تھی۔ شہتیر نکلا ہوا تھا جہاں سے مٹی جھڑ رہی تھی۔ میں نے ایک، ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ فرار کا سہ صرف یہی ہے۔

میں نے لڑکی کے قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”بہن! کھڑی ہو جا۔ میں تیرے دولہے کو واپس لے آیا ہوں۔“

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو پھٹک پڑے۔ اس نے احسان مندانہ انداز میں سر جھکا کر پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں کون ہوں، یہ جان کر تم کیا کرو گی؟..... پھر بھی میں بتا دیتا ہوں۔ تم نے وجہ ڈاکو کا ہا تو سنا ہو گا۔ میں وہی ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پھر اس کا سر میرے قدموں میں جھک گیا۔ وہ بلیک بلیک کر رونے لگی۔ میں نے اسے دونوں شانے تھام کر اٹھایا اور وہ کسی بہن ہی کی طرح میرے سینے سے سر چھاکر رونے لگی۔ میں پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ ایک الگ ہی جذبہ، الگ ہی خوشی تھی، کسی آدم زادی کے قرب سے کہیں بڑھ کر خوشی۔

پھر دھرم گرد آ گیا۔ میں نے دولہے کو گھورتے ہوئے دلہن کے ساتھ مقدس گرنٹھ کے قریب بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ دولہا سدھائے ہوئے جانور کی طرح دلہن کے قریب بیٹھ گیا۔

لڑکی کا باپ میرے سامنے بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم ڈاکو نہیں، دیو تلو ہو۔ اگر تم عین موقع پر میری مدد نہ کرتے تو میں آتم ہتھیا (خودکشی) کر لیتا۔ اب اتنا احسان مجھ پر اور کرو کہ کھانا کھا کر جاؤ۔“

میں نے اسے آہستگی سے کھڑا کیا اور مسکرا کر کہا۔ ”جب تک لڑکی ڈولی میں نہیں بیٹھ جاتی، ہم یہیں رہیں گے۔ وہ وجہ کی بہن ہے لہذا اسے سسرال میں کوئی تکلیف نہ ہو، یہ دیکھنا میرا کام ہے۔ آپ فوراً ساری رسوم پوری کریں۔“ پھر میں وہاں موجود افراد کی طرف گھوم کر بولا۔ ”خبردار کوئی منڈپ کے باہر نہیں جائے گا ورنہ اسے گولی مار دی جائے گی۔“ سب کے چروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دھرم گرد مقدس کتاب پڑھنے لگا۔ لڑکی کے خاندان والوں کے چروں پر روشنی سی چھا گئی۔ دولہے کے زمیندار باپ کا چہرہ اتر گیا۔ میں نے اپنے چوتھے ساتھی کو چوکیداری کی غرض سے مکان کے پچھلے حصے میں بھیج دیا، پھر خود ہری اور شکر کے ساتھ اوپری منزل پر آ گیا۔

دلہن والوں نے ہمارے لئے مٹھائی کا تھال اور کھانا اوپر بھیج دیا۔ میں اوپر منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے نیچے کا جائزہ لے رہا تھا۔

شادی کی رسم پوری ہونے کے بعد دولہا اور دلہن نے اپنے بزرگوں کے پیر چھوئے۔ اسی وقت ایک سب انسپکٹر چند مسلح پولیس والوں کے ساتھ منڈپ میں داخل ہوا اور میں چونک اٹھا۔ میرے لئے پولیس کا وہاں پہنچ جانا حیرت انگیز ہی تھا۔ اوپری منزل سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں چکر کے رہ گیا اگر میں وجہ کے جسم کو چھوڑ کر وہاں سے فرار بھی ہو جاتا تو میرے ساتھی یقیناً مارے جاتے اور مجھے یہ کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

کھڑکی سے نیچے کا جائزہ لینے ہوئے میں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شاید

نی کہ وہ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ وہ ہماری شہرہ رگ کے قریب ہے۔

میں نے پڑھا، سب سے بڑی کتاب میں پڑھا:

”اور لوگوں میں بعض ایسے جو کہتے ہیں، ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر“ حال آنکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں۔ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور حقیقت میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بے جا اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے ان کا مرض، اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین پر، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو، بے شک یہی لوگ مفید ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں، کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا ایمان لائے ہیں بے وقوف، یاد رکھو، بے شک وہی ہیں بے وقوف لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزا کیا کرتے ہیں۔ اللہ ہی استہزا کر رہا ہے ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے، تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ ٹھیک طریقے پر چلے۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو، پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے جو کچھ گرد اس کے تھا، سب کر لیا ہو اللہ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے نہ ہوں۔ برے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ اب رجوع نہ ہوں گے۔ یا (ان کی مثال، جیسے بارش ہو آسمان سے اندھیرے میں، جس میں گرج اور بجلی بھی ہو، وہ کڑک سے، موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہوں، اور اللہ، کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ قریب ہے کہ ان کی بینائی، بجلی لے جائے، جب بجلی چمکی تو چلنا شروع کیا اور جب اندھیرا ہوا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سماعت و بینائی سلب کر لے، بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔“

(ترجمہ سورہ بقرہ، آیت: 8 سے آیت: 20 تک)

پھر میں نے تاریخ کی کتابوں میں یہ بھی پڑھا، اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا اور ایک شاعر کی بیاض بھی میری نظر سے گزری:

”زبردست دھماکے ہو رہے ہیں، عورتوں، مردوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ ہر طرف شور ہی شور ہے اور گھروں کی دیواریں گر رہی ہیں۔ لوگ عبادت گاہوں میں جمع ہیں اور اللہ کے

جھٹ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چارپائی کو میں نے دیوار سے لگایا اور اوپر چڑھ گیا۔ جس جگہ سے شہر نکل گیا تھا، جھٹ کے کونے میں تھی۔ ذرا سی دیر میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا کہ ایک آدمی آسانی سے جھٹ کے اوپر پہنچ سکے۔

”ہری! پہلے تو نکل۔“ نیچے اتر کر میں بولا۔

پھر ہری کے بعد شکر جھٹ پر پہنچا اور میں ان دونوں کے بعد۔ بے وقوف سب انکسٹر کے حکم، جب تک پولیس اس مکان کو گھیرے میں لیتی، ہم تینوں ساتھی بہت دور نکل چکے تھے۔ گھوڑوں کو وقتی طور پر صبر کرنا پڑا لیکن میری گھوڑی مانک چھچھا کرتی ہوئی نکل آئی۔

برات کو ہم نے جہاں روکا تھا، وہیں رکی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر گھن فضا میں بلند کی اور فائر کیا۔ یہ واپسی کا اشارہ تھا۔

جنگل میں پہنچ کر کئی دن مجھ پر چپ سی لگی رہی۔ یہ سب کچھ کیوں؟ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا۔ اس کے بعد ایک سوال سے دوسرا اور پھر تیسرا سوال۔ کیا میں صرف ایک ڈاکو ہوں؟ ایک جسم کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا جسم۔ کیا میں وقت اور حالات کے جبر کا شکار ہوں؟ میں نہ وجہ ہوں نہ ٹھاکر بلونت سنگھ، نہ رنجیت۔ میں تو ایک جن زاد علیا لیش ہوں۔ سارے رشتے ناتے جھوٹے تھے۔ کوئی سریتا میری تھی، نہ کوئی رکنی اور نہ کوئی شکنتلا یا سروج۔ میں تو مسلمان ہوں۔ اگر آدم زادوں کے درمیان ہی رہتا ہے تو پھر ہندو یا سکھ بن کر کیوں رہوں؟ یہ وہ آخری سوال تھا جس نے میری سوچ کو ایک نئی نچ پر ڈال دیا۔

ساری زمین اللہ کی ہے اور سب اسی کے بندے ہیں، مجھے یہ بھی خیال تھا لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ اللہ کی زمین پر لکیریں کھینچنے والے خوش تھے کہ انہوں نے ساری دنیا میں مسلمانوں کا بانٹ دیا ہے۔ اس بندر بانٹ کے نتیجے میں جو ہوا، وہ سب کتابوں میں لکھا ہے۔ میں نے کتابیں پڑھیں۔

مسلمان کون تھے؟ یہ وہ تھے کہ جن کی ہیبت سے یہودی اور عیسائی اپنی اپنی عبادت گاہوں میں گھنٹوں کے بل دست دعا بلند کئے اللہ کے حضور گڑگڑاتے تھے۔ ”اے اللہ اے یسوع کے باپ! ہمیں بچالے۔ ہمیں مسلمانوں کی پیلاخ سے پناہ دے۔ وہ ہم پر اگنی بان چھوڑتے ہیں، آگ برساتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہو جائیں یا پھر ان کے خلاف سازشیں کرنا چھوڑ دیں۔ اے یسوع! ہم اعتراض کرتے ہیں کہ وہ بچے اور ہم جھوٹے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم چاہیں تو اپنے دین پر قائم رہیں۔ عجیب لوگ ہیں۔ ساری دنیا میں انہی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہمارے دل بٹا جاتے ہیں۔ بچالے، ہمیں بچالے اے یسوع!“

بڑی بڑی داڑھیوں والے یہودی اور عیسائی روتے۔ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ وہ بے عمل تھے۔ ان کے اندر کھوٹ چھپا تھا۔ وہ جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ جسے ”اگنی بان“ یعنی آگ کے تیر سمجھ رہے ہیں، کیا ہیں۔ سو اللہ نے ان کی

سامنے دست دعا بلند کئے گزگڑا رہے ہیں کہ اے اللہ! وہ ہمارے گھروں میں کھس آئے ہیں۔ آگن آگن ہرے درختوں کے نیچے ان کی فتح کے پرچم گڑے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تُو نے ہی تو آنے والوں اور ان کے جنگی طیاروں کو ہم پر بلند کیا ہے۔ کیا تو انہیں ہلاکت خیز دیا کی صورت زمین پر پھیلنے اور بڑھنے سے نہیں روکے گا؟ وہ ہم پر تیز آگ برساتے ہیں۔ ہمارے شیردل پلٹتے ہیں اور اپنی حدود میں سر جاتے ہیں۔ اے اللہ! دیکھ کہ وہ ہوا کے دوش پر آتے ہیں اور ہمارے سارے جنگی طیاروں کو اڑنے سے پہلے ہی میٹھی نیند سلا جاتے ہیں۔ ان کا سورج، ان کی حدود میں کبھی نہیں ڈوبتا۔ ان کا لوبو پیچھے نہیں آگے روشنی پھیلاتا ہے۔ اے اللہ! اے معبود! اے خدائے ذوالجلال! انہوں نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔ وہ ہم سے ہماری آنے والی نسلوں کو چھین لے گئے۔ انہوں نے ہماری بیٹیوں کو بے حیا بنا دیا۔ اب وہ بھی نائٹ کلبوں میں کولھے منکاتی ہیں۔ ہمارے بیٹے انہیں دیکھتے ہیں اور ہمیں بیک روڑ کتے ہیں۔ وہ ہماری روحوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ہمارے اندر تک فتح کر لیا ہے۔ اے خدائے بزرگ و برتر! پناہ دے ہمیں، ہمیں ان کی دیکھی اور آن دیکھی یلغار سے پناہ دے۔“

دنیا کے اسٹیج پر پہلا منظر یودیوں اور عیسائیوں کا تھا اور ابھی جو دوسرا منظر میں نے ایک شاعر کی بیاض میں لکھا، اس میں اور پہلے منظر میں صدیوں کا انٹرول ہے۔ شاعر نے جو کچھ بھی لکھا، وہ سب تدریج ہی تو ہے۔ پہلا منظر مسلمانوں کے غروب اور دوسرا منظر زوال کا ہے۔

ماضی کی رزم گاہوں سے میں زمانہ حال میں آگیا۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بے عمل ہیں۔ ہمارے اندر کوٹ چھپا ہے۔ ہم جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے بے خبر ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ اور یوں بھی ہوا کہ اپنے مفادات کی خاطر ہم جان کر انجان بن گئے۔ ہمارے سینوں میں لکیروں سے بنا ہوا ایک خنجر اتار دیا گیا۔ مسلمانوں کی آخری نشانی ”خلافت عثمانیہ“ ختم کر دی گئی۔ ہمیں بانٹ دیا گیا اور ہم بانٹے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

”اسٹیج شو“ جاری رہا اور جاری ہے لیکن اس میں میرا کردار کیا ہے؟

میں تو آدم زاد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک جن زاد ہوں۔ میری بساط ہی کیا۔“

اشرف المخلوقات ہے اور میں؟

جواب ملا کہ میں صرف آدم زاد کی مدد کر سکتا ہوں، اسے خود اسی کے شرے بچنے میں مدد کر سکتا ہوں کہ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہے۔

میں نے دنیا کے نقشے پر کھینچی ہوئی نئی لکیروں کو دیکھا۔ میں کہاں ہوں؟ لاہور مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں زرخس تھی۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ میں نے خاموشی کے ساتھ وجہ کے جسم کو چھوڑ دیا اور جنگل سے نکل آیا۔ اب میں صرف علیالیش تھا اور مجھے کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ 1948ء کے آخری مہینے تھے۔ قائد اعظم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے۔ وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ مسلمانوں کی اس نئی مملکت کا دارالحکومت کراچی تھی جسے کبھی کراچی کہتے تھے۔ یہ مجھیروں کی بستی تھی۔

پاکستان کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت ہوتی گئی۔

ہندوستان کے صوبے گجرات اور سندھ (سندھ جس میں پہلے بمبئی، پونا اور اس کا گرد و نواح شامل تھا) میں آباد گجراتی زبان بولنے والے سب سے پہلے کراچی آئے اور انہوں نے اس شہر کے کاروباری مراکز منبھال لئے۔ ان میں سے بیشتر، قیام پاکستان سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کراچی ہی نئی مملکت کا دارالحکومت ہو گا۔ انہی ہجرت کرنے والوں میں جنوبی ہند کے لمباری بھی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب قائد اعظم بمبئی میں رہتے تھے۔ 1936ء سے پہلے سندھ الگ صوبہ نہیں تھا بلکہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ جو صوبہ بمبئی کے گورنر تھے، انہوں نے 1936ء میں صوبہ بمبئی سے صوبہ سندھ کو الگ کر لیا اور انگریزوں سے اس صوبے کی الگ حیثیت منوائی۔ صوبہ بمبئی اور حالیہ صوبہ سندھ پہلے ایک ہی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم شہر بمبئی سے کراچی منتقل ہو گئے اور پہلے گورنر جنرل بنے۔ 11 ستمبر 1948ء کو بمقام کراچی، زیارت سے واپسی پر قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔

1948ء کے آخری مہینوں تک، ہندوستان کے مہاجرین پاکستان آ رہے تھے جن کی حالت بہت اتر تھی۔

میں لاہور پہنچ کر حیرت میں رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور شہر میں آ گیا ہوں۔ شہر کے اندر اور باہر عجیب افرا تفری کا عالم تھا اور تو اور بھائی دروازہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ ”بھائی“ کے معنی بدل گئے تھے۔ شاہی قلعے کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر جو گلیاں تھیں، ان میں اب پیشہ ور عورتیں آ بی تھیں۔ میں وہاں سے پلٹا اور چوراہے پر آ گیا۔ کونے پر مسجد تھی، میں ادھر مڑ گیا کہ شاید کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ جائے۔ اسی سڑک پر آگے جا کر ایک گلی تھی جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

انہی گلیوں میں اک ایسی گلی ہے

جو میرے نام سے تیار رہی ہے

میں نے سوچا اور اس گلی میں پہنچ گیا۔ ابھی تک میں نے کوئی قالب اختیار نہیں کیا تھا۔ زرخس، اقبال، مولوی کفایت اللہ، نہ جانے کتنے چہرے یاد آئے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے، کیوں چلے گئے؟ اگر یہاں کوئی بھی نہیں تو پھر میں کیوں بھگ رہا ہوں؟ سوالوں کے گرداب میں ڈوبنے سے پہلے میں نے بہت اونچی پرواز کی۔ ایک وحشت سی میرے وجود میں رقص کرنے لگی۔ میں نے خود کو سمجھایا پھر کبھی سی۔ ایک زرخس اگر مجھ سے بچھڑ گئی ہے تو کیا، کتنے لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ اسے علیالیش، اسے جن زاد، ان گھروں کے شب افروز روزنوں کو نہ دیکھ، کیا خبر کون اپنے گھر میں چراغ جلا چھوڑ گیا ہو۔

پھر مجھے قرار آ گیا اور میں آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ میں نے مہاجریمپ دیکھے اور لرز گیا، وہ سب دیکھائے بیان کرنے کی تاب نہیں۔ وحشت پھر بڑھنے لگی تو میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور پرواز کرتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ ایک نئی مملکت بننے کے بعد جو کچھ لاہور شہر میں ہوا، مجھے معلوم ہو گیا تھا۔

☆=====☆

اسی عرصے میں مجھے ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ قائد آباد سے کیمائری تک روز پیدل جاتا اور لوٹ آتا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس نوجوان کی سرخ سرخ آنکھوں میں مجھے وحشت سی ناہنجی دکھائی دی۔ میرے لئے یہ جان لینا کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ نوجوان کون ہے۔ میں بھی اس کا ہم سفر بن گیا۔ وہ اس قدر کھویا کھویا رہتا کہ میں ساتھ چلتا رہتا اور اسے خبر بھی نہ ہوتی۔

وحشت زدہ سادہ نوجوان بھی قائد آباد کی ایک جنگلی میں رہتا تھا۔ اس پاس کی جھگیوں والے اسے کچھ کھانے کو دے دیتے تو کھا لیتا۔ ان جھگیوں میں رہنے والوں نے اسے اپنی ڈسے داری بتا لیا تھا، کوئی کھڑے میں پانی بھر جاتا، کوئی جنگلی کی صفائی کر دیتا، شام ہو جاتی تو کوئی لائینن جلا جاتا وغیرہ۔ جھگیوں والے اسے کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھتے تھے، کیوں کہ وہ کبھی کبھار ہی بولتا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط ہوتیں لیکن لوگ ان میں ربط ڈھونڈ لیتے۔

ایک روز حسب معمول وہ قائد آباد کی طرف لوٹ رہا تھا کہ پیچھے سے میں نے اسے آواز دی۔ وہ کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح پلٹا۔

”کیا ہے؟“ قریب آکر اس نے مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا۔

میں بولا۔ ”میرا نام مقصود ہے۔“

”مقصود، مشہور، مردود!“ وہ بڑبڑایا، پھر ایک دم چیخ اٹھا۔ ”بھاگ جا۔“

”تمہاری طرح میرا بھی کوئی گھر نہیں۔“

”گھر، در، بھر، مر۔“ وہ یہ کہہ کر پھر اپنی راہ ہو لیا۔

میں مسکرا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

قائد آباد میں اپنی جنگلی تک پہنچ کر وہ رکا اور پلٹ کر مجھے گالیاں بکنے لگا۔ جھگیوں والے میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور وہ نوجوان اپنی جنگلی میں چلا گیا۔ میں نے حکمت سمجھنے کے لئے بڑے پاؤں پیٹے تھے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ میں جن دنوں ملتان میں تھا تو حکیم نیراس الدین کے جسم پر قابض ہو کر مطب بھی آیا گیا تھا۔ مجھے بہت سے تیرہ برف لئے یاد آگئے۔ یوسف کو علاج کی ضرورت تھی۔

کبھی تو میں انسانی قالب اختیار کر کے مقصود بن جاتا اور کبھی علیالیش۔

یوسف کو علم بھی نہ ہوا اور میں اس کا علاج کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جلد ہی اپنے حواسوں میں لوٹ آیا۔ اس چکر میں قائد آباد کی جھگیوں والے مجھے بھی کوئی ”پہنچا ہوا فقیر“ سمجھنے لگے۔ چٹکی بجاتے میں ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔

وہ دن میرے لئے بڑی خوشی کا تھا جب یوسف صحت یاب ہوا۔ علاج کے دوران میں وہ مجھے کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا۔

میں اکثر یوسف ہی کی جنگلی میں رہتا۔ ایک رات بہت سردی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں جنگلی سے نکل آیا کہ یوسف کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مجھے ایک کھل کا بندوبست کرنے کی دیر نہ لگی۔

مجھروں کی بستی کلاچی اب کراچی کسلاقی تھی اور میں وہیں آ نکلا تھا۔

ایک جن زاد ہونے کے ناتے جنون عشق سے بچنے کی خاطر میں نے اپنے ہی انداز میں سوچا۔ میرے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ میں کراچی آکر بھی زمرس کو نہیں بھول سکا۔ سو میں نے اپنی روح کے زخموں پر لفظوں کا مرہم رکھ دیا۔

وہ اپنے جسم کی اک آخری اڑان کے بعد مجھے یقین ہے میرے ہی گھر پہ اترے گا

خود فریبی ہاں یہ خود فریبی ہی تو ہے۔ اس کے گھر پہ تو میں اترتا تھا، وہ کوئی جنیہ تو نہیں تھی کہ میرے گھر پر اڑتی، میری طرح فضا میں پرواز کرتی۔

اپنی آدم زاد محبوبہ زمرس کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے میں کیمائری پر اتر گیا۔ کئی دن تک میں کراچی میں گھومتا رہا۔ یہاں کی بڑی سڑک بندر روڈ تھی۔ بندر گاہ کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا تھا۔ دور سے قائد اعظم کا مزار نظر آتا جو بلندی پر تھا۔ مزار کے اوپر شامیانہ لگا تھا اور فوجی کھڑے رہتے تھے۔ کیمائری سے آتے ہوئے مزار سے ذرا پہلے دائیں جانب جھگیوں کا ایک شہر سا آباد تھا جو دور تک چلا گیا تھا، قائد آباد، نمائش، جٹ لائن، اے بی سینیا لائن اور نہ جانے کتنی لائینیں۔ حالت یہاں بھی لاہور جیسی تھی لیکن کچھ فرق تھا۔ نفسا نفسی کے باوجود سارے شہر پر سوگوار سی طاری تھی۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ان کی بولیاں الگ تھیں، مگر دل ایک تھے۔ سب جیسے کسی آن دیکھی ڈور میں بندھے تھے۔ تہذیب، رسم رواج، لباس، رہن سہن، مختلف سہی لیکن جذبہ ایک تھا۔ انہی میں جرائم پیشہ بھی تھے اور شریف بھی۔ عزت دار بھی تھے اور رذیل بھی۔ کھرے بھی تھے اور کھوٹے بھی۔ امیر بھی تھے اور غریب بھی۔ گھربار لٹانے والے بھی تھے اور لوٹنے والے بھی۔ دیسی بھی تھے اور پردیسی بھی۔ لاہور بڑا شہر تھا، مگر چھوٹا سا یہ شہر بھی مجھے اچھا لگا۔ جی لگانے کے سوا بہانے ہوتے ہیں، سو میں نے بھی یہاں جی لگا لیا۔ مصیبت کے مارے اور آن پڑھ لوگ وہم کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ جھگیوں میں پڑے تھے، ان کی زبانی میں نے جنات کے قصے بھی سنے۔ میں ذرا کھٹکا اور جھگیوں کے پھیرے پہ پھیرے لگائے۔ اپنے سوا میں نے وہاں کسی جن زاد کو نہ دیکھا، نہ محسوس کیا۔

بندر روڈ ہی پر میں نے کھٹار اسی ایک ٹرام بھی چلتے دیکھی۔ یہ محمد علی ٹراموے کمپنی کسلاقی تھی۔ بندر روڈ ہی پر ٹرام ڈپو بھی تھا۔ اس کمپنی کی ٹرامیں شہر کے مختلف راستوں سے گزرتیں۔ ٹرامیں چلتی رہتیں، مسافران میں چڑھتے اور اترتے رہتے۔ انہی میں سے ایک ٹرام سیدھی بندر روڈ پر چلتی۔ چلتی ہوئی ٹرام میں چڑھنے اور اترنے کا تماشہ مجھے بڑا دلچسپ محسوس ہوا۔ میں بھی اس تماشے کا حصہ بن جاتا اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔

پھر میں نے کسی آدم زاد کے جسم پر قبضہ کرنے کی بجائے ایک آدمی کی ہیئت اختیار کر لی اور اپنا اچھا سا ایک نام بھی رکھ لیا۔ لاہور سے لٹ پٹ کر تو میں بھی آیا تھا، شاید اسی لئے مہاجر بن گیا۔ ہر کوئی مجھے میرے چلنے کی وجہ سے مہاجر ہی سمجھتا۔

یوسف نے ابھی مجھے اپنی زبانی کچھ نہیں بتایا تھا، نہ میں نے دانستہ کچھ پوچھا۔
جنگلی میں لالٹین کی لودھی تھی۔ یوسف میلی سی ایک چادر اوڑھے دری پر سنا سنا پڑا ہوا تھا۔
جب میں نے اسے کبل اوڑھایا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔
”کون، مقصود؟“ وہ مندا سی آواز میں بول اٹھا۔

”سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”مگر تم یہ کبل کہاں سے لے آئے؟ اور..... اور پھر تم..... تمہیں بھی تو سردی لگ رہی ہو گی۔“

میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ”میں چادر اوڑھ کر سو جاؤں گا۔ تم چادر مجھے دے دو۔“

”نہیں۔ تم بھی میرے پاس کبل میں آ جاؤ۔“ اب اس کی آواز پر نیند کا غلبہ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور کبل میں گھس گیا۔

”مقصود! تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو؟“ اس نے میری طرف کر دٹ لے لی۔

”نہیں تو۔ میں نے تو خود تمہارے پاس پناہ لی ہے۔ ہم لوگ پناہ گیر ہیں نا!“

”ہم پناہ گیر نہیں ہیں۔“ اس کی آواز میں غصہ تھا۔

”پھر کون ہو تم، کون ہوں میں؟ اس شر کے باسی تو ہمیں یہی کہتے ہیں، ماکڑ بھی کہتے ہیں۔“

”غلط کہتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں معلوم۔“

”پھر کے معلوم ہے؟“

”مجھے..... مجھے معلوم ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔

”لیٹ جاؤ، تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”نہیں، آج میں نہیں لیٹوں گا۔“ وہ ضد کرنے لگا۔

مجبوراً مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ ”کیوں نہیں لیٹو گے؟“ میں نے زری کے ساتھ کہا۔

”سنو..... سنو، مقصود کہ میرے والد مولوی عبدالحکیم صدیقی کیا کہتے تھے۔ میں انہی کا بیٹا تھا۔

یوسف صدیقی ہوں۔“ ابھی تک وہ غصے میں تھا۔

میں اٹھا اور قریب رکھے ہوئے گھرے سے کٹورے میں پانی انڈیل کر لے آیا۔

”پہلے تم پانی پی لو کہ غصہ حرام ہے۔ پھر تم جو بھی کو گے میں سنوں گا۔“ میں نے کنوڑا اس کے

ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے کسی حجت کے بغیر پانی پی لیا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”میرے والد مجھ سے کہتے تھے، ہمیں معلوم ہے کہ ہم جہاں رہتے ہیں، یہ حصہ نئی مملکت میں شامل نہیں ہو گا۔ اس کے باوجود ہم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ مسلمان جہاں بس جائے وہی اس کا وطن ہے۔ ہجرت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے۔ ہجرت ہماری مجبوری نہیں، ضرورت ہے۔ تم نہیں جانتے ہو گے، میرے والد کون

تھے..... اور کسی کا کچھ جانتا ضروری بھی نہیں۔ تم نے مولوی محمد اسلمیل میرٹھی کا نام سنا ہے۔“
”ہاں، بچپن میں ان کی ایک نظم پڑھی تھی، وہی پن چکی والی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مولوی صاحب بچوں کے لئے نظمیں لکھتے تھے..... نمبر پر چل رہی ہے پن چکی، دھن کی پوری ہے کام کی پکی..... یہی نظم ہے نا ان کی؟“

”یہی ہے۔“ پھر یوسف جیسے خواب کے سے عالم میں بولنے لگا۔ ”ہم اسی گلی میں رہتے تھے جہاں کبھی مولوی محمد اسلمیل میرٹھی رہتے تھے۔ پھر مولوی صاحب کے بیٹے خان بہادر محمد سلیم سیفی بھی اسی گھر میں رہے۔ مولانا شاہ عبدالحکیم صدیقی، مولوی اسلمیل میرٹھی کے بھائی تھے۔ یہ اوپر کوٹ تھا جسے ہم میرٹھ والے اندر کوٹ کہتے ہیں۔ اس اندر کوٹ میں ایک محلہ مشائخان بھی تھا..... اور بھی محلے تھے، قاضی واڑہ، مفتی واڑہ وغیرہ۔ مولوی محمد اسلمیل میرٹھی اور ہمارا گھر انا اسی محلے مشائخان میں رہتا تھا۔ تم نے بیگم پل کا نام سنا ہو گا۔ بیگم پل کے چوراہے کی طرف سے آگے بڑھو گے تو اگلے ہاتھ ذرا دور ایک سڑک جاتی ہے، اس پر ایک سینما تھا، سینما کے بعد ہی ایک ہوٹل جس میں شراب خانہ بھی تھا، اس پر لعنت پڑو۔ پھر بیگم پل والی بڑی سڑک پر آ جاؤ۔ میں تمہیں محلہ مشائخان پہنچا دیتا ہوں۔ اندر کوٹ، محلہ مشائخان اور ہمارا گھر۔ اپنے والد کا نام میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مولوی عبدالحکیم صدیقی، میری والدہ کا نام شکیلہ اور بہن کا نام جلیلہ تھا۔ ہمارے ہی گھر کے بالکل سامنے مولوی محمد ارشد کا مکان تھا جو ارشد میاں کہلاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد احمد تھے، انہیں لوگ احمد میاں کہتے۔ احمد میاں نے نے شادی نہیں کی تھی۔ ارشد میاں سن سینتالیس سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ بچپن..... میرا بچپن..... اور ارشد میاں کی بیٹی کا بھی بچپن، اس کا نام سلمیٰ تھا۔“

کچھ دیر کو یوسف چپ ہو گیا، مگر میں نے اسے نہیں ٹوکا۔

”سلمیٰ مجھے بچپن سے اچھی لگتی تھی۔“ یوسف کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔ ”وہ زمانہ خاندانوں سے باہر رشتے کرنے کا نہیں تھا۔ سلمیٰ اور میرا خاندان الگ الگ تھا۔ جب ہم دونوں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کا احساس ہوا۔ ماں..... ماں کا دل بہت گداز ہوتا ہے۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اپنی ماں سے ارادہ ظاہر کر دیا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں۔ پھر بھی یہ بات میری ماں کے ذریعے والد تک پہنچ گئی۔ وہ اس پر خفا ہوئے، مگر باپ تھے۔ انہوں نے خفگی کے باوجود مولوی محمد ارشد سے بات کی اور انکار میں جواب مل گیا۔ قصہ ختم..... مگر قصہ، عشق ختم تو نہیں ہوتا۔ چھو..... چھوڑو، چھوڑو یہ قصہ..... ایک اور قصہ سنو..... میں تمہیں اپنے والد عبدالحکیم صدیقی کا قصہ سناتا ہوں۔ وہ مسلمانوں کی نئی مملکت کے بہت بڑے حامی تھے۔ ریڈیو سے اعلان ہوتے ہی انہوں نے سامان باندھ لیا۔ سامان..... صرف زیورات اور روپے۔ موٹر وہ خود بھی چلا لیتے تھے۔ میرٹھ میں اس وقت تک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا، ہاں چھگی مچی ہوئی تھی۔ والد بولے، ہم بلند شہر روڈ سے گزرتے ہوئے دہلی پہنچیں گے، کیوں کہ ریل اور کوئی دوسری سواری محفوظ نہیں، موٹر ٹھیک ہے۔ ان کے آگے کون دم مارتا۔ مجھے، ماں اور چھوٹی بہن جلیلہ کے ساتھ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور میرٹھ سے نکل گئے۔ بلند شہر

یوسف نے یہ سب کچھ مجھے اس رات نہیں بتایا اور میں نے اسے سلا دیا۔ بعد میں رفتہ رفتہ وہ کھلتا گیا، خود ہی اشاروں اشاروں میں وہ خوں چکاں واقعات مجھے بتا دیئے جو ابھی میں نے بیان کئے ہیں۔ علاج کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی طرح مریض کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ میں نے بھی یوسف کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے اسے بولے دیا، ٹوکا نہیں۔ دہلی میں ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر اس پر جو گزری، اسی کی زبانی میں نے سنا۔

یوسف نے ایک رات مجھ سے کہا۔ ”تمہیں تو خبر ہوگی مقصود کہ آخری مغلیہ تاج دار بہادر شاہ ظفر نے بھی لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی۔“

”ہاں، سنا ہے میں نے۔“ اسے بولے پر اکسانے کے لئے میں بولا۔

”خود دہلی شہر والوں نے بھی وہیں پناہ لے رکھی تھی، خاص طور پر ان دہلی والوں نے کہ جو ہندوؤں کے محلوں میں گھرے ہوئے تھے۔“ یوسف بولنے لگا۔ ”ایک وجہ اور بھی تھی۔ شرے بستی نظام الدین کا فاصلہ کافی ہے، درمیان میں آبادیاں نہیں۔ بستی نظام الدین کا شمار نواح شہر میں ہوتا ہے۔ اتنے بڑے رقبے پر پھیلے ہوئے مقبرے میں کسی کو پناہ تھا، کون کہاں ہے۔ میں بھی اپنی ماں کو لے کر ایک جگہ پڑا رہا۔ پھر وہ بھی ایک روز میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اتنے سارے غم لے کر کوئی جیئے بھی کیسے، بستی نظام الدین کے قبرستان میں، انہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔“ یوسف کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میں نے اس نازک مرحلے پر یوسف کے دل و دماغ کو قابو میں رکھا کہ کہیں وہ پھر نہ بکھرے لگے۔ اس کے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر رکھنے کی ضرورت تھی اور میں نے یہی کیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ ابھی تو اس کے ذہن کی بہت سی گریں کھلنا باقی تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم مقصود کہ اللہ نے مجھے کیسے صبر دیا، ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ کہ سہلی کو میں نے اپنے قریب دیکھا۔ اب وہ دن کسی بھیاںک خواب کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود! یہ بتاؤ، مرنے والوں کو تو آدمی صبر کر لیتا ہے، کیا انہیں بھی صبر کیا جاسکتا ہے جو زندہ ہوں؟“

یوسف کے سوال کا جواب ضروری سمجھ کر میں نے کہا۔ ”ہاں زندگی کو صبر کرنا بہت مشکل کام ہے۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”سہلی کے بارے میں تم مجھے بتا چکے ہو لیکن وہ میرا بھائی ہے۔ دہلی کس طرح پہنچ گئی؟“

”اپنے چچا احمد میاں کے ساتھ۔“ یوسف نے جواب دیا۔ ”اپنے بڑے بھائی کی موت کے بعد احمد میاں ہی نے تو سہلی کو اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ احمد میاں اپنی بہتیجی کو لے کر کسی طرح دہلی پہنچ گئے ہوں گے۔“

”ہاں، وہ ہم سے ایک روز پہلے میرٹھ سے چل دیئے تھے۔ دہلی شہر فساد کی زد میں تھا اس لئے سہلی کے ساتھ وہ بھی ہمایوں کے مقبرے میں رہے۔“ یوسف نے سرد آہ بھری اور پھر بتاتے لگے۔ ”کیسے دکھ کی بات ہے مقصود کہ ایک ہی محلے، ایک ہی گلی میں برسوں سے آنے والے رہنے والے ایک دوسرے کے

روڈ پر قصبہ سکندر آباد سے کچھ پہلے ہندو جاٹوں نے ہماری موٹر پر حملہ کر دیا اور اور“ یوسف کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بس کرو یوسف، بس کرو۔“ میں بول اٹھا اور وہ مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں بھرنے لگا۔

مجھے یوسف کے دکھ کا علم تھا۔ اس کے باپ مولوی عبدالکیم کو ہندو جاٹوں نے شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو جاٹ بڑے کینے تھے۔ میں نے ان کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ مغلوں کے زمانے سے (میری مراد مغلوں کے دور زوال سے ہے) یہ کینگیں پر آمادہ تھے۔ دہلی آنے والوں کے لئے یہ شاہراہ بہت اہم تھی۔ یہ جاٹ موقع سے فائدہ اٹھاتے اور دہلی پر ٹوٹ پڑتے، لوٹ مار کرتے، پھر بھاگ لیتے۔ مغلوں کے بعد انگریزوں کا زمانہ آیا، نسلیں بدل گئیں۔ مگر جاٹوں کی سرشت نہیں بدلی۔ ایک مرتبہ انہیں پھر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے اور لوٹ مار کا موقع مل گیا۔

اپنے باپ کی شہادت کے بعد بھی نوجوان یوسف نے حوصلہ برقرار رکھا۔ وہ اپنی بہن جلیلہ کو تو نہ بچا سکا، مگر حواس باختہ ماں کو لے کر کھیتوں میں ریک گیا۔ اپنی بہن یاں، دونوں میں سے وہ کسی ایک ہی کو بچا سکتا تھا۔ کوشش تو اس نے کی کہ بہن کو بھی بچالے مگر ناکام رہا۔ یوسف کے لئے وہ گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں کہ جب اس کی سماعت سے بہن کے چیخنے کی آخری آواز ٹکرائی۔ یوسف کی ماں شکیلہ نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ یوسف کی بہن جلیلہ پر کیا گزری اور شاید یوسف کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جاٹوں نے اس کا منہ باندھ دیا تھا۔ اسی وقت وہ چیخی تھی۔ پھر اجتماعی بے حرمتی کے بعد اس معصوم آدم زادی کو قتل کر دیا گیا تھا۔

جاٹ، زیورات اور روپے لوٹ لے گئے، موٹر جلا دی۔ اس عرصے میں یوسف کھیتوں کھیتوں خاصی دور نکل آیا تھا۔

سکندر آباد کی آبادی قریب تھی اور وہاں بھی قاضی داڑے تھا۔ مسلمانوں کے محلے قاضی داڑے میں یوسف کے عزیز رہتے تھے۔ میرٹھ، علی گڑھ، بلند شہر (قدیم نام برن) دہلی اور آس پاس کے شہروں میں لوگوں کی عزیز داریاں تھیں۔ قاضی داڑے میں یوسف اپنی ماں کو ساتھ لئے ایک عزیز کے گھر پہنچ گیا اور پھر وقتی طور پر حواسوں میں نہ رہا۔ گھر گھر صف ماتم بچھی تھی، کون کس کو پوچھتا۔ کسے یہ فکر ہوتی کہ ایک گھر سے آہ و بکا کی آوازیں کیوں آرہی ہیں لیکن اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ یوسف نے سنبھالا لیا تو پتا چلا کہ سکندر آباد کے مسلمان بھی تمام تر تیاریوں کے باوجود زیادہ محفوظ نہیں ہیں۔

”پھر محفوظ علاقہ کون سا ہے؟ میں اپنی ماں کو کہاں لے جاؤں؟“ یوسف کی آواز میں بڑا کرب تھا۔

جواب ملا کہ رات ہونے دو، بندوبست ہو جائے گا۔

پھر بندوبست ہو گیا۔ ایک بااعتماد تانگے والے نے یوسف اور اس کی ماں شکیلہ کو دہلی میں ہمایوں کے مقبرے پہنچا دیا۔ یہ الگ بات کہ واپس میں وہ تانگے والا بھی مارا گیا لیکن اس نے جو عہد کیا تھا، نباہ دیا۔ آدم زادوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔

حال سے بے خبر تھے۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میرا سربایہ حیات کب میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں تو اس روز میرٹھ کالج کا پھیرا لگانے گیا تھا کہ ان درو دیوار پر آخری نظر ڈال لوں۔ میں تو دیوانوں کی طرح گھوم رہا تھا، کبھی تحصیل کی عمارت کے سامنے، کبھی سپٹ بازار کے چوراہے پر، کبھی بیگم پل پر اور کبھی اپنے ہم عمروں کے ساتھ نعرے لگاتا ہوں۔ گلیوں گلیوں کو چپے کو چپے اک دیوانہ گھومے جا رہا تھا اور..... اور وہ..... سسلی مجھے ایک نظر دیکھ لینے کو بے چین تھی۔ سسلی ہی نے مجھے یہ باتیں ہمایوں کے مقبرے میں بتائیں کہ احمد میاں سارا گھر بونہی کھلا چھوڑ کر اسے ساتھ لئے چل دیئے۔ احمد میاں سمجھ چکے تھے کہ اب اگر میرٹھ سے نہیں نکلے تو پھر موقع نصیب نہ ہو گا۔ وہ اپنے بچے سے کیا کہتی۔ سرنیوڑائے ساتھ ہوئی۔ جب سسلی مجھے ہمایوں کے مقبرے میں ملی، احمد میاں ملے تو میری حالت ہوش اور بے ہوشی کے درمیان تھی۔ سسلی اور احمد میاں نے میرے دکھ بانٹ لئے اور مجھے اپنے ساتھ میاں پاکستان آنے پر آمادہ کر لیا۔ احمد میاں کو ہماری معصوم محبت کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے مرحوم بڑے بھائی ارشد میاں رشتے سے انکار کر چکے تھے، پھر بھی انہیں میری حالت پر رحم آگیا۔ اسی حالت میں احمد میاں نے مجھ سے وہ سب کچھ پوچھ لیا جو گزر چکا تھا۔ پھر احمد میاں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ سسلی ایک دیوانہ کی زنجیروں سے کیوں کھیل رہی ہے۔ مجھے تو اس نے بہت پہلے زنجیر کر لیا تھا۔ وہ..... وہ شاید چند ہی روز تھے۔ میں نے اسی عرصے میں طالب علموں کی ایک جماعت کو بہت سرگرم دیکھا۔ ان طلبہ کا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تھا۔ میرٹھ میں رہتے ہوئے بھی ہمیں خبر تھی کہ علی گڑھ کی یہ درس گاہ چھوٹا پاکستان کھلاتی ہے۔ غالباً انہی طلبہ میں سے کسی نے احمد میاں کو بتایا کہ دہلی اور لاہور کے درمیان سرکاری سطح پر جو ٹرینیں چل رہی ہیں، فساد کے سبب دہلی شہر اور دہلی کینٹ ریلوے اسٹیشنوں پہ نہیں رکیں گی۔ جن لوگوں کو لاہور جانا ہے، وہ بستی نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا تعلق علی گڑھ شہر سے بھی تھا اور دیگر شہروں سے بھی۔ وہ اسی لئے دہلی پہنچے تھے کہ لاہور جانے والی ٹرینوں میں خانہ بریادوں کو سوار کرا سکیں لیکن مقصود! تم..... تم کس طرح یہاں پہنچے؟

میں چونک اٹھا۔ یوسف نے اچانک یہ سوال کر دیا تھا۔ میں ٹھہرا ایک جن زاد، میرے لئے کہیں سے بھی کہیں پہنچ جانا کون سا مشکل ہوتا لیکن یوسف پر میں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا اور بولا۔ ”میں بھی تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گا“ کون ہوں۔ مگر بہتر یہ ہے، تم اپنی بات کہہ لو۔ فی الحال بس اتنا سمجھ لو کہ میں بھی تمہاری ہی طرح دُردر ہو کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ یوسف! میرے بھائی، میرے دوست! کسی نا سینہ درد سے خالی نہیں، تم کس کس آنکھ میں جھانکو گے، کس کس کی آنسو بندھاؤ گے۔“

”کیا کوئی کسی کی آنسو بندھا سکتا ہے مقصود؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے حوصلہ افزا جواب دیا۔

”میرا خیال یہ ہے مقصود کہ ایسا ممکن نہیں۔“

”تمہارے اس خیال کی کوئی وجہ؟“

”وجہ؟“ وہ یوں دھیرے سے ہنسا جیسے رو دے گا۔

میں اسے گھیر کھا۔ کچھ اسی مرحلے پر لے آیا جہاں سے وہ ہٹا تھا۔

”اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طلبہ نے ہم تینوں کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ شاید انہیں ہم قابل رحم نظر آئے ہوں۔ ایک بوڑھا، ایک نیم دیوانہ اور ایک بے سارا نوجوان لڑکی۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں پر ان کی پوری توجہ تھی۔ وہ طلبہ ہمیں ہمایوں کے مقبرے سے نکال کر ریلوے اسٹیشن تک لے گئے۔ ہمیں انہوں نے ایک ٹرین میں سوار کرا دیا جو لاہور جا رہی تھی۔ کسی ٹرین میں تین افراد کو سیٹ مل جانا حیران کن ہی تھا۔ جس ڈبے میں ہم بیٹھے تھے اس میں مل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ ٹرین زیادہ دیر نہ رکی اور چل دی۔ ڈبوں کی چھتوں پر بھی لوگ سوار تھے۔ جھپٹے ہوئے چہرے، پتے ہونٹ، پیاسی آنکھیں اور آنکھوں میں خواب۔ ہر طرف اندھیرا، ہر سمت لب ہائے فریاد، دلوں میں جانے کیا کیا۔ کس ماں کا ہاتھ اس کے بیٹے سے چھڑا دیا گیا، کس بھائی نے اپنی بہن کی آخری چیخ سنی، کس باپ نے اپنے معصوم بچوں اور اپنی شریک حیات کا تحفظ کرتے ہوئے سینے کو سپر بنا لیا، کسے ہوش تھا اور اگر ہوا ہو گا بھی تو ایسے ہوش سے بے ہوشی اچھی ہے۔“ یوسف بلکنے لگا۔

اسے میں نے بلکنے دیا، رونے دیا اور پھر سلا دیا۔

اس رات کے بعد یوسف نے جو کچھ بیان کیا، میرے علم میں ہونے کے باوجود بہت ہولناک تھا۔ میرے اس کے درمیان اب شب و روز کی تخصیص نہیں رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ گھومتا ہوا کبھی کبھار کھار اور گلیوں میں نکل جاتا اور کبھی مارش کوارٹرز تک۔ میں اسے یہ احساس نہ ہونے دیتا کہ کھانے پینے کو کہاں سے آ رہا ہے لیکن ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا، بولا۔ ”مقصود! یہ تمہارے پاس چاٹ کھانے کے لئے پیسے کہاں سے آ جاتے ہیں؟“

”جھکیوں والے اب بھی ہم پر ترس کھاتے ہیں۔ میں لاکھ منع کرتا ہوں خرچے پانی کو پیسے دے دیتے ہیں۔“

”لیکن یہ تو غلط بات ہے، ہم کوئی فقیر تو نہیں ہیں۔“

”تو امیر بھی نہیں ہیں۔“ میں نے برجستہ جواب دیا۔

”پھر بھی میرا ضمیر اسے گوارا نہیں کرتا۔“

”ضمیر صاحب کا انتقال ہوئے تو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا۔“ میں نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

یوسف غم کھا گیا اور پوچھا۔ ”کون ضمیر صاحب؟“

دہی جن کا ابھی تم ذکر کر رہے تھے۔“

وہ ہنس دیا۔ بڑی کڑواہٹ تھی اس کی ہنسی میں۔

”آؤ چلو گول گپے کھاتے ہیں، اوپر سے سوٹ کا پانی پییں گے، مزہ آ جائے گا۔“ میں نے اس کا

دھیان ہٹانے کو کہا اور وہ مان گیا۔ تھوڑا بہت چٹورا وہ بھی تھا۔ میں ایک جن زاد اور وہ آدم زاد۔ پھر بھی اس کی داستان الم ایسی تھی کہ اس کی زبانی سن کر میری روح بھی ترپ اٹھی۔ جس پر گزری ہو، وہ بتائے

تو کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے۔ دہلی سے جو ٹرین لاہور کے لئے چلی تھی، انبالہ چھاؤنی کے قریب اسے روک لیا گیا۔

”ست سری اکال، ست سری اکال۔“ ہر طرف سے یہی نعرے سنائی دینے لگے۔

انتہا پسند ہندوؤں کی شہ پاکر سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔

زندگی اور موت کی جنگ میں آدم زاد ہو کہ جن زاد آخری لمحے تک لڑتا ہے۔ زندگی کے پیاری نہیں ہوتی۔ دیوانگی سے فراوانی کی حد پار کرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پھر یوسف تو پوری طرح دیوانہ بھی نہیں تھا۔ اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ اُسے اپنی جان کی پرواہ ہو کہ نہ ہو، سہلی کی زندگی ضرور عزیز تھی۔

درندے اس ڈبے میں کھس آئے تھے۔ کپائیں، بلم، چھراں، لائٹیاں، ان کے پانس کیا نہیں تھا۔ اس ٹرین کا انبالہ فوجی چھاؤنی کے قریب روکے جانا بھی بے سبب نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قاتلوں کو ہندوستانی فوج کا تحفظ حاصل رہے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو پہلے ہی جن جن کر قتل کیا جا چکا تھا۔ جالندھر، امرتسر، لدھیانہ، اطراف کی بستیوں، گاؤں وغیرہ، کون سا ایسا شہر تھا کہ جہاں ایک بھی مسلمان زندہ چھوڑا گیا ہو۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جن کی رشتے داریاں پہلے ہی سے لاہور وغیرہ میں تھیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی یہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر مسلم اکثریت والے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں کون سے علاقے شامل ہوں گے اور معلوم کئے نہیں تھا، سارے ہندوستانی مسلمان اس سے واقف تھے۔ یہ تو فائدے کا سودا تھا۔ اس میں فائدہ کسے ہوا اور کون گھائے میں رہا، یہ آدم زاد جانیں۔ میں ٹھہرا ایک جن زاد مجھے اس سے کیا غرض، کیا واسطہ۔ میں تو وہ باتیں بتا رہا ہوں جو مجھے ایک آدم زاد، یعنی یوسف کے ذریعے معلوم ہوئیں۔

بڑا ہی دل ہلا دینے والا وہ منظر تھا جو یوسف نے بیان کیا۔

اس پورے ڈبے میں اب صرف تین زندہ افراد بچے تھے۔ ان میں سولہ برس کی دو شیرہ، یوسف کی محبوبہ سہلی بھی تھی۔ دس برس کی معصوم بچیوں سے لے کر سولہ برس کی دو شیراؤں کو قتل نہیں کیا گیا۔ انہیں سکھ اغوا کر کے لے گئے۔ یہ وہ بچیاں اور دو شیرائیں تھیں جن کے ماں باپ، بھائی، بہن، اقارب، سرپرست اور سارے گھر والے مار دیئے گئے۔ اس کی وجہ بہت سے آدم زادوں کو معلوم ہے اور مجھے بھی کہ اسی عمر کی بچیوں اور دو شیراؤں کو اغوا کیوں کیا گیا۔

مذہب کی آڑ میں درندگی کی حدود کو عبور کرنے والے وہ نام نہاد سکھ اغوا ہونے والیوں سے وہی کھیل کھیلتے جو میرا جن زاد ساتھی یاسف کھیلا کرتا۔ خود میں بھی کون سا پارسا ہوں۔ میں نے کیا نہیں کیا۔

شیطان تو سب کے پیچھے لگا ہوا ہے، کیا جن زاد اور کیا آدم زاد (لیکن درندگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے)۔

بعد میں انہی آدم زادوں پر انتہائی تشدد کیا گیا۔ درندوں نے کہا، اپنے مذہب کو چھوڑ دو، ورنہ ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔ وہ آدم زاداں کہ جن کا اب اس دنیا میں کوئی زندہ نہیں بچا تھا، وہ کہ جن کے سامنے گلوں پر چھراں پھیری گئیں، سینوں میں کپائیں اتار دی گئیں، نوک دار بھالوں پر پھول سے

بچوں کو اچھالا گیا، ان کی ذہنی حالت کیا ہو گی۔ خود آدم زاد نے یہ احوال لکھا ہے، میں کیا بتاؤں۔ میں تو ان میں صرف ایک آدم زادی سہلی کے اغوا ہونے کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ تو کتنی سلمانیں، سکھوں کی بیویاں بن کر زندہ رہیں، کون جانتا ہے۔

مشرقی پنجاب کے بعد اب یوپی سے لاہور جانے والوں کی بدمذہبی تھی۔ سو ٹرینیں کالی گئیں۔

اپنی بھتیجی سہلی کو سہلی اولاد کی طرح چاہنے والا احمد میاں پھانسیا گیا کہ وہ دھال کیوں بنا۔ جو آدم زاد کسی معاملے میں جذباتی ہو جاتے ہیں، ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ سکھوں نے احمد میاں کے سارے جسم کو چھید ڈالا۔ وہ کیا یوسف تو وہ بھی کب تک لڑتا۔ آخر گری گیا۔ درندوں کو سہلی کی فکر تھی کہ وہ کس کے حصے میں آتی ہے۔ ان میں ٹھن گئی لیکن اس طرح کہ شکار بچ کر نہ بھاگ لے۔ ایک درندہ ذرا قوی تھا، سو وہ سب پر بھاری پڑا۔ اس نے نیم بے ہوش سہلی کو کندھے پر ڈالا اور بقیہ درندے اس کے پیچھے دوڑے۔ اس سے بس یہ ہوا کہ یوسف کی جان بچ گئی۔ درندوں نے یہی سمجھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔ وہ یہ بھول گئے کہ موت و زندگی ان کے نہیں اللہ کے اختیار میں ہے۔

یوسف نے مجھے وہیں تک واقعہ بتایا کہ جب تک وہ شدید زخمی ہو کر گرا نہیں تھا، باقی سب کچھ میں نے خود معلوم کیا۔

یہ ٹرین لاشوں اور شدید زخموں کو لے کر لاہور پہنچی۔ وہاں اور ہی سماں تھا۔ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر جو لوگ لاہور پہنچ رہے تھے، ان کے لئے حکومت کی طرف سے مہاجر کیمپ لگے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کو صرف ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ایک قیامت بیت گئی۔ اس وقت پاکستان کی بری فوج کا کمانڈر انچیف ایک انگریز جنرل فرینک میسروی تھا، نزل ڈکلس گریسی کو فرینک میسروی کے بعد کمانڈر انچیف بنایا گیا۔

کچھ پنجابی ہندو (شرناتھی) اب بھی لاہور میں موجود تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ کسی طرح ہندوستان بھاگ جائیں۔ راولپنڈی اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے پنجابی ہندو بھی لاہور آگئے تھے کہ موقع دیکھتے ہی ہندوستان جانے والی کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں۔ یوں گویا لاہور شہر اس وقت ہندو اور مسلمان مہاجروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مادری زبان تحفظ کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان شرناتیوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، سکھوں نے بھی انہی کا ساتھ دیا۔

لاہور میں رہنے بسنے والے شرناتیوں اور سکھوں کا برائے نام نقصان ہوا۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنی جائیداد مقامی لوگوں کو فروخت کر کے نقد رقم بنا لی۔ انہی شرناتیوں کی سازشوں کے نتیجے میں کم ہی مسلمان مہاجر، لاہور میں ٹک سکے۔ انہوں نے سندھ کا رخ کیا۔ کچھ مہاجر تو سندھ کے دوسرے شہروں میں بس رہے، زیادہ تعداد کراچی آگئی۔

سہلی کو اغوا کئے جانے کے بعد یوسف ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے رضاکاروں نے شدید زخمی لوگوں کو ان کیسپوں میں پہنچا دیا جہاں زندہ بچ جانے والے زیر علاج تھے۔ جسم کے زخم مندمل ہو گئے لیکن روح کے زخم نہیں بھرے۔ ایک روز یوسف وہاں سے نکل بھاگا۔ وہ مہاجرین

جو چہار کہلاتی ہے۔

میں، یوسف کے ساتھ گویا گردش کرتا رہا۔

”اور کیا۔ تمہیں ابھی یہاں آئے جمہ جمعہ چار ہی دن تو ہوئے ہیں۔“

”میری اردو ذرا کمزور ہے۔“

”لیکن تم کبھی کبھی تو اہل زبان کی طرح بولنے لگتے ہو۔“

”تمہارے ساتھ رہنے کا اثر ہے“ ورنہ تو میرا تعلق شرعی گڑھ کے ایک گاؤں سے ہے۔“ میں

”کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟“ اسے میرے فرضی کردار کے متعلق کچھ جان لینے کا موقع مل گیا۔

شمس جو جھگیاں نظر آ رہی ہیں، پتا ہے ان میں کون لوگ رہتے ہیں؟“ میں نے اسے باتوں میں

”تم ہی بتاؤ مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔“ وہ پُر تجسس نظر آنے لگا۔

”تم نے مہرا کا نام تو سنا ہو گا نا۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں..... متھرا، یو پی کا بڑا قدیم شہر ہے۔ وہاں اورنگ زیب عالمگیر نے ایک

میں کیا تھا۔“

”یوسف! تمہیں اور کچھ بھی یاد ہے، اس مسجد کے بارے میں؟“

”ہاں‘ جب میں وضو کر رہا تھا تو تو والد مرحوم نے مجھے سامنے دیکھنے سے منع کیا تھا“

”اور اس کی وجہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں، مگر بتاؤں گا نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ وجہ تو پتانی پڑے گی تمہیں مقصوداً“ وہ بھند ہو گیا۔

”بھائی میرے“ شریف بچوں کے لئے ایسی باتوں کا جاننا ضروری نہیں۔ جو بات تمہارے والد مرحوم

سرخ پردائیں جانب پیشہ ور غورتیں آکر آباد ہو گئی تھیں۔ ان بد بختوں کو بھی ایسی ہی جگہیں پسند

یوسف نے لا حول پڑھی، پھر چونک کر دریافت کیا۔ ”تم تو ابھی کہہ رہے تھے، علی گڑھ کے ایک

”کم میرٹھ سے محلے مشائخان سے متعرا جاسکتے ہو تو کیا مجھ پر کوئی پابندی ہے۔ میں بھی سگڈے

دکھی لوگ ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ سو وہ یوسف پر ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ کراچی

خانہ بربادوں، شریفوں اور غریبوں نے شہر کراچی میں جگہ جگہ جھلیاں ڈال لیں۔

یہ اسی دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے سنا خواجہ ناظم الدین مسجد حفرہ میں نماز پڑھنے جا رہا تھا۔

جزل نہیں بنایا گیا تھا۔

”چلتے ہو لارلس روڈ؟“ میں نے یوسف سے پوچھا۔

”کیوں، وہاں کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”جمعہ ہے آج“ وہیں جمعے کی نماز پڑھیں گے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”خواجہ صاحب شہر کی

جب میں نے تفصیل بتائی تو وہ راضی ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ لارنس روڈ پر واقع مسجد کے

یوسف کا دھیان پائے رکھنا تھا۔

”تم بھی عجب سیلابی آدمی ہو مقصود!“ یوسف نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم مجھے کہاں

”ارے تم اس جگہ کو نہیں پہچانتے۔ یہ جارج مشن سینڈری اسکول ہے، یہ جو سامنے نظر آ رہا ہے

”ہو گا حرج مشن اسکول“ مجھے کیا۔ میرے گھر میں بھی عیسائیوں کا ایک مشن اسکول تھا۔ میرے والد

کے رہے ہیں۔ مسئلہ ان کو دھوکا نہیں، کھانا جانے کے کہ عسائیل کا مشن ہے۔ اگر یہ حرج مشن اسکول

”مجھ سے کہ تمہاری معلومات میں اضافے کے لئے تمہیں یہاں لایا جاوے گا۔ یہ وہ اسکول ہے جہاں

تو ان کے اہل خانہ نے ان کو روک دیا۔ ان کے اہل خانہ نے ان کو روک دیا۔ ان کے اہل خانہ نے ان کو روک دیا۔

یہ رجیدہ۔ اسی سبب میں اسے ساتھ سے اسے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ اس نے اسے چھوڑ دیا۔

جائے واسے واسے پر۔ اسی رزو کی سرک یتھ وارووں کی ابادی کی۔ یتھ وار ہندوؤں کی ایک ذات

بھرتا کبھی وہاں پہنچ گیا ہوں گا۔

وہ لاجواب سا ہو گیا، پھر ایک دم چونک کر پوچھنے لگا۔ ”تم ان جگہوں میں آباد لوگوں کے متعلق کچھ بتا رہے تھے۔ کیا یہاں متھرا کے کچھ خاندانی لوگ آباد ہیں؟“

”خاندانی تو تبھی ہوتے ہیں جان من!..... تمہارا مطلب ”خاندانی لوگ“ سے کیا ہے؟“

”نسلا شریف، نیک اور معزز لوگ۔“ اس کی گردن ذرا سی تن گئی۔

ان آدم زادوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ کسی کی شرافت، نیکی اور عزت کو اس کے پیشے سے آئکتے ہیں۔

”شریف، نیک اور معزز تو ان جگہوں میں بسنے والے بھی ہیں۔“ میں نے بات کو مختصر کر دیا۔ ”خیر یہ اپنے اپنے سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ ان جگہوں میں آباد زیادہ تر لوگ، متھرا شہر کے سبزی فروش ہیں..... آؤ پہلے کچھ کھاتے پیتے ہیں، بھوک لگ رہی ہے۔“

نگار سینما سے پہلے دائیں جانب بھیم پورہ تھا جہاں کچھ، مین اور بوہری رہتے تھے۔ یوسف کے ساتھ میں وہیں ایک ”پینچ ہوٹل“ میں آ بیٹھا۔ پیٹ کا بھرنا ہی کیا!

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یوں تو صحت کی خاطر آرام کرنا ضروری ہے لیکن یہ چونچلے آدم زادوں کے ہیں۔ جن آدم زادوں کو اتنی فرصت ہوتی ہے اور عیش کرتے ہیں، ان میں اب یوسف شامل نہیں رہا تھا۔ ماضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس تھا بھی کیا۔ عام طور پر ایسے آدم زاد فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ خود انہیں بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ تلخ اور بھیاںک یادوں کے عذاب سے دامن بچا رہے ہیں۔ تقریباً یہی حال یوسف کا تھا۔ کھانا کھا کر مجھ سے بولا۔ ”مقصود! آج گھومنے نکل ہی آئے ہیں تو اسی علاقے میں اور گھومتے ہیں۔ یہاں قائد اعظم“.....

”وہ جگہ یہاں سے دور ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کون سی جگہ؟“

”وزیر مینشن، جہاں قائد اعظم پیدا ہوئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پھر کبھی ادھر چلیں گے۔ قائد اعظم کی نشانیاں یا ان سے وابستہ جگہیں اور بہت سی ہیں، مثلاً اسٹیٹ بینک آف پاکستان۔ اس بینک کا افتتاح قائد اعظم ہی نے کیا تھا، مگر اس کے لئے بولٹن مارکیٹ تک مارچ کرنا پڑے گا، فی الحال آس پاس ہی منڈلاتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”تمہاری اردو واقعی بہت کمزور ہے۔ پرندے منڈلاتے ہیں، آدمی نہیں۔ برا نہ مانا، مقصود! تم ہو واقعی کسی گاؤں کے۔“

”لو! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے..... میں گاؤں کا رہنے والا ہوں، اس لئے تم مجھے منڈلانے سے نہیں روک سکتے..... ویسے یہ الگ بات ہے کہ منڈلانے کا شمار بھی اردو محاورے میں ہوتا ہے۔“

”بحث بہت کرتے ہو تم۔“ وہ بولا۔ ”اب یہیں کھڑے رہو گے کہ کدھر ہی چلو گے بھی۔“

”میں چلتے چلتے ہی تو یہاں آ کے رکا ہوں۔“

”یہاں کیا ہے؟“

”جو متھرا میں تھا، جس پر تم نے لاجول پڑھی تھی۔“

”تو کیا یہاں بھی..... پاکستان میں بھی.....“ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔

”کہاں کیا نہیں ہوتا۔ بس یہ ہے کہ ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔“

”چلو یہاں سے مقصود!“

”جان من! دیکھنے کے پیسے نہیں لگتے۔ یوں بھی اس وقت دیکھنے کو کچھ نہیں، بس بلڈنگیں ہیں دیکھ لو۔ طبلہ تو رات کو گھنگٹا ہے، زخمی پائل کے گھنگرو تو رات کو بجتے ہیں، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں چہرے تو رات کو بجتے ہیں۔ میں اس لئے تمہیں یہاں گھما رہا ہوں کہ تم بھولے آدمی ہو۔ تمہیں کوئی بد معاش بکا کر یہاں نہ لے آئے۔“

وہ جھانپنے میں آ گیا اور بولا۔ ”بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ راستہ چلتے ہوئے یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ گڑھا کہاں ہے۔“

”ادھر یہ نگار سینما ہے۔ اس کے سامنے جو بلڈنگیں تمہیں نظر آ رہی ہیں، یہاں پیشہ ور آدم زاد..... میرا مطلب ہے کہ پیشہ کرنے والیاں رہتی ہیں۔ جو نامارکیٹ کی جانب بلڈنگوں میں طوائفیں آباد ہیں۔ ان میں گانے والیاں بھی ہیں اور پیشہ ور بھی۔ درمیان میں جاپانی روڈ ہے جس پر ٹرام چلتی ہے۔ ایک ٹرام سیدھی چاکڈواڑے تک جاتی ہے، دوسری ادھر نگار سینما سے لارنس روڈ کی طرف مڑ جاتی ہے۔ ایک انگریز تھا، نیپیر، اسی کے نام پر پیشہ ور عورتوں کا علاقہ نیپیر روڈ کہلاتا ہے۔ ٹھوکر گلی دیکھو گے؟..... کسی دل چلنے نے کیا اچھا نام رکھا ہے۔ جہاں آدمی ٹھوکر کھا جائے، اسے یہی کہنا چاہئے نا۔“ میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

جلدی ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ یوسف کی حالت اس اونٹ جیسی ہے جو کسی باؤلے گاؤں میں آ گیا ہو۔ میں نے اس پر ترس کھایا اور دوبارہ گرد دوارے کی طرف نکل آیا۔ گرد دوارے کی زمین پر تختوں کی باڑھ بنی تھی اور اس باڑھ کے ساتھ جھگیاں تھیں۔

”یوسف! تم بھی کیوں کہ ایک جگہ میں رہتے ہو، اس لئے میں تمہیں ادھر لے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تم جگہ کیوں کہتے ہو، جھوپڑی نہیں کہہ سکتے؟“

”اس لئے کہ یہ میرٹھ یا علی گڑھ نہیں، کراچی ہے پیارے! جیسا دس دس بولی۔ دس کے ساتھ بھیس میں ہرگز نہیں بولوں گا۔“

وہ فہم دیا اور میں خوش ہو گیا۔ کسی کا دل رکھنا بھی تو ثواب ہے۔ کچھ دیر مزید گھوم گھام کر وہ اداس سا ہو گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ ”تم سے مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی، لیکن بار بار سوچ کے رہ جاتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”گھوٹنے پھرنے میں شاید اب تمہارا دل نہیں لگ رہا..... واپس قائد آباد چلتے ہیں اور ہاں سنو“
 زیادہ سوچا نہ کرو۔ اگر تھک گئے ہو تو کہیں سے ٹرام میں بیٹھ لیجئے ہیں۔“
 مجھے معلوم تھا کہ یوسف کیا سوچتا رہتا ہے۔ مگر قائد آباد آکر وہ دھڑ دھڑکی اڑانے لگا۔

”ہندوستان.....“ وہ جیسے کہیں کھو سا گیا۔ ”اب وہاں کیا رکھا ہے؟“

”وہی رکھا بلکہ رکھی ہے جس کے بارے میں تم سوچتے رہتے ہو۔ بولو، کیا وہاں سسلی نہیں ہے؟“

”ہے اور تھی میں بڑا فرق ہوتا ہے مقصود! کسے معلوم کہ وہ اب تک زندہ ہوگی۔“

”ٹرائی مار لینے میں کیا حرج ہے۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”نہیں۔“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے زخموں کو ہر ارکنا چاہتے ہو..... ابھی تو بارڈر کھلا ہے، کون روک لے گا، ہمیں؟“

”میرا تو خیر کچھ نہیں، زندوں میں نہ مردوں میں لیکن تم تم مقصود! میری وجہ سے کیوں مارے جاؤ۔“

”انگلی کنا کر شہیدوں میں داخل ہونا بھی شاید اردو زبان کا ایک محاورہ ہے۔ وہ کسی شاعر نے ایسے موقع کے لئے کیا اچھا شعر کہا ہے۔ میں کیوں کہ کم پڑھا لکھا ہوں اس لئے صرف ایک مصرع پر گزارا کر لوں۔“

شہید عشق پہ رحمت خدا کی

کیا خبر تمہاری وجہ سے مجھ پر بھی اللہ کی رحمت ہو جائے۔“

وہ مجھے بہت غور سے دیکھنے لگا۔ ”مقصود! یا تو تم بالکل جھوٹے ہو یا پھر میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔“
 ”نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، نہ اس قاتل ہوں کہ تم مجھے سمجھو۔ یا تو کوئی جھوٹا ہوتا ہے یا سچا۔
 مجھے تم کچھ بھی سمجھ لو، گلہ نہیں کروں گا، ہاں جب گلہ لکھنے کا نمبر آیا تو اوڑن چھو ہو جاؤں گا۔ گلہ لکھو تو
 تمہارا میرا گلہ کیوں کئے جان من! عشق تم نے کیا ہے، میں نے نہیں۔ سزا بھی تمہیں کو بھگتنی ہو گی۔ اگر
 لیلیٰ واقعی کوئی رعوی ہو گی تو نجد کے صحرا میں حضرت مجنوں کو بھگتا پڑا تھا، ان کو موصوف کے کسی غم گسار یا
 دوست کو نہیں۔ شہر میں کے لئے فرما دو تیشہ اٹھانا پڑا۔ سہی کے لئے پنوں.....“

”بس کرو مقصود!“ اس نے ہاتھ اٹھایا۔

”مارنا مت۔“ میں تیزی سے جھکا۔

”کون مار رہا ہے تمہیں..... تم تو جب یونے پر آتے ہو تو بولے ہی چلے جاتے ہو“ میری بات نہیں سنتے۔“

”تو سناؤ“ میں ہمہ تن گوش ہوں..... بلکہ تمہاری خاطر کچھوے سے خرگوش بھی بن سکتا ہوں۔
چھٹا نکلیں مارنا شروع کیس تو انالہ چھوڑنی پہنچ کر ہی دم لوں گا اور..... اور جان من، تم ٹاپے جاؤ۔

”وہاں سے تو اسے اغوا کیا گیا تھا..... خود مجھے بھی نہیں معلوم کہ اغوا کرنے والے کون تھے۔“
 ”سکھ تھے، اور کون تھے۔“

”میرا مطلب اغوا کرنے والوں کے جہروں سے ہے۔ میں تو بے ہوش ہو گیا تھا۔“

میں نے فوراً کر لگائی۔ ”اب تو ہو شر میں ہو“ ماشاء اللہ۔“

”ہاں مقصود، اب میں ہوش میں ہوں اور اور وہ وہ چہرے بھی میرے ذہن میں اٹھ رہے ہیں۔“

”شکر سے ابھر رہے ہیں، ڈوب نہیں رہے ورنہ میں تمہارا کہا گاڑ لیتا۔“

”کس؟“ لگاڑ..... مارا مات بگڑ تو گئی ہے۔ ”وہ انہی روم میں تھا۔“

”گدے، چھوڑا۔ کبھی کبھی بھیڑتا ہے۔“

”کس طرح؟“

”وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ حَافِظٌ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَافِظٌ“

اسے چپ لگ گئی اور میں نے اس کے ذہن کو بے قابو ہونے سے روک دیا۔ ہم جن زادوں کو یہ سارے کرتب آتے ہیں۔ یا تو ہم کسی کو اپنا دوست نہیں بناتے، اگر بناتے ہیں تو پھر دوستی بھجواتے ہیں۔ ”دوست آں باشد“ والا معاملہ ہے ہمارا۔

”تم کیا کوشش کر لو گے، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“ وہ خاصی دیر کے بعد بولا۔

”جو بات خود بندے کی سمجھ میں نہ آئے اسے دوسرے پر چھوڑ دینا چاہئے۔“

اس نے ہتھیار ڈال ہی دیئے، کہنے لگا۔ ”اچھا میں نے سارا معاملہ تم پر چھوڑا۔“

”اب کی باتم نے ہوش مندوں کی سی بات۔“

میں نے اس پر جو فقرہ چست کیا، وہ لی گیا۔

”یوسف، میری جان! کچھ دن تم میرے بغیر اکیلے رہ لو گے؟“ میں نے دانستہ یہ سوال کیا۔

”کیوں؟“ وہ چونکا۔ ”ابھی تو تم کچھ اور کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ ہندوستان.....“

”ایک پھر پہلے مجھے خود لگانا پڑے گا تاکہ تمہیں واقعی شہید عشق کا مرتبہ حاصل نہ ہو جائے۔“ اس بات سے میرا مقصد محض یہ چھپانا تھا کہ میں اسی کی طرح آدم زاد ہوں، جن زاد نہیں۔ اسے اعتماد میں لئے بغیر میرے لئے کوئی قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا۔

”تم جو چاہے کرو، جہاں چاہو جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”ہاں بس یہ ہے کہ اب تمہارے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔..... خیر دیکھا جائے گا‘ اللہ مالک ہے۔ اتنا تو اندازاً بتا ہی دو کہ کتنے دن میں ہندوستان حاکم لوٹ آؤ گے؟“

”ابھی ہندوستان کے لئے روانہ تو ہونے دو مجھے۔ کیا معلوم کتنے دن لگ جائیں۔“

”تو پھر میں اس عرصے میں کوئی کام تلاش کرتا ہوں۔“ اس کی آواز میں خود اعتمادی تھی۔ ”میں

پڑھا لکھا ہوں، کوئی بھی کام مل جائے گا۔“

”جندا باد!“

”نہیں مقصود! پاکستان زندہ باد کو۔“

”پاکستان زندہ باد! اب خوش؟“

اور وہ خوش ہو گیا، پوچھنے لگا۔ ”کب جا رہے ہو ہندوستان؟“

”کل صبح چلا جاؤں گا۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ حالانکہ مجھے کہیں بھی آنا جانا نہیں تھا۔ مجھے تو یوسف کے ساتھ ہی رہنا تھا اور اس سے الگ بھی لیکن مقصود بن کر نہیں، علیا پیش کی حیثیت سے۔ اس پچارے کو کیا پتا تھا ”کس نئی پر سد کہ بھیا کیتی!“ اس وقت پڑھا بے پڑھا، سب ہی برابر تھے۔

کون سنتا ہے فغان درویش

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے تھے اور انسان؟ مجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سرکاری دفاتر کا حال مجھ پر عیاں تھا، جو عیاں نہیں تھا، میں نے معلوم کر لیا۔ نجی ادارے لوٹ کھسوٹ میں لگے تھے۔ کون عزت دار ہے، کون ہندوستان میں بے عزت تھا، کون تیلی اور کون واقعی فارسی پڑھا ہوا تھا، کس کو پڑی تھی کہ پوچھتا۔ جن کا سب کچھ اجڑ گیا، چپ رہے اور جنہوں نے نفع کمایا، مظلوم بن گئے۔ ظالم اور مظلوم کی پہچان ختم ہو گئی۔ سبھی مظلوم بنے ہوئے تھے۔ ”ہم تو ہندوستان میں کئی پشتوں سے امیر تھے۔“ کوئی کتا، چاہے کئی پشتوں سے بھیک مانگتا پیشہ رہا ہو۔ کوئی دون کی لیتا کہ جناب، ہمارے بارے میں کیا پوچھتے ہیں، فیکٹریاں تمہیں ہماری۔ ایک ایک فیکٹری میں کئی کئی سولازم تھے۔ اگر کھوج لگاؤ تو پتا چلے کہ وہ حضرت کسی چھوٹے سے کارخانے میں ”ہڈ حرام“ قسم کے معمولی کاریگر تھے اور ان کے ”قبلہ ابا حضور، دادا حضور“ بھی کاریگر ہی تھے۔ وہ جن کی واقعی فیکٹریاں یا کارخانے تھے، ایک حرف زبان پر نہ لاتے۔ اس بہتی میں اگر سبھی سچے تھے تو انہوں نے خود کو جھوٹا کھلوانا قبول کر لیا۔ ایسے خانہ خراب تو نظر جھکائے گزر جاتے کہ انہیں کوئی پہچان نہ لے۔ عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ قاتل کہتے کہ ہم تو سدا کے اللہ والے ہیں اور اللہ والے ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ کوئی دل جلا حسب نسب کھول کے رکھ دیتا کہ ابے تو اور تیرا باپ بھی اٹھائی گرا تھا تو مار پیٹ پر نوبت پہنچ جاتی۔ ایک بڑے کو میں نے کہتے سنا، ہندوستان میں ہماری بہت بڑی جائیداد تھی، یہ بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ یہاں میں نے کلیم داخل کر کے اپنی جائیداد کے بدلے کئی بلڈنگیں لے لی ہیں۔ ہم نے آخر پاکستان کی خاطر قربانی دی ہے۔ پاکستان پر ہمارا حق ہے۔ میں نے سراغ لگایا تو پتا چلا، وہاں ایک چھوٹے سے گھر میں پورا ”میر“ رہتا تھا جن کی جائیداد تھی، وہ یہاں جھگیوں میں پڑے تھے، کوئی بھیم پورہ میں، کوئی قائد آباد میں۔

ہائے رے آدم زاد، تو واقعی ”اشراف المخلوقات“ ہے۔

ایسے میں بھلا میں یوسف کو کس طرح اکیلا چھوڑ دیتا۔

”میں تمہیں اسٹیشن تک چھوڑنے چلوں گا مقصود!“ یوسف بول اٹھا۔

”وہ کس خوشی میں پیارے بھائی؟“ میں نے کہا۔ ”جب آنکھ کھلی نکل لوں گا، تمہاری نیند کیوں خراب کروں۔“

یوسف بھی ایک ہی ”اڑیل گھوڑا“ تھا، کہنے لگا۔ ”میں جاگ جاؤں گا۔“

”اور اس پکر میں تم رات بھر آنکھوں میں کاٹ دو گے۔“

اے علم نہیں تھا کہ میں اس پر نیند بھی مسلط کر سکتا ہوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن فجر سے پہلے میں، مقصود سے علیا پیش بن گیا۔ یوسف بے خبر سوتا رہا اور میں، قائد آباد کی اس جھگی سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

شراب انگڑائی لے کر جاگنے والا تھا۔ کچھ دیر میں ہر طرف سے اذانوں کی آواز آنے لگی۔ اللہ نے میرے دل میں نیکی ڈالی، سوچا کہ اے بد بخت علیا پیش! کبھی نماز بھی پڑھ لیا کر۔ اڑتا ہوا ایک مسجد میں پہنچ گیا۔ نماز پڑھنے کے لئے وضو کیا۔ ملا جی اذان دے کر لیٹ گئے تھے کہ کچھ دیر کو کمر سیدھی کر لیں۔ اسی وقت ایک نوجوان آدم زاد مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے گلے سے لگتا تھا کہ رات بھر کا جاگا ہوا ہے، بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر ہلاکی اداسی۔ لگتا تھا، وہ مسجد میں نماز پڑھنے نہیں کسی اور کام سے آیا ہے۔ لپک کر وہ ملا جی کے پاس پہنچ گیا۔ اب میں نے ذرا غور سے ملا جی کو دیکھا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی اور صحت مند بھی تھے۔

”ملا جی اٹھ کر بیٹھ گئے۔“ ”ارے شریف! تم۔“

”ہاں ملا جی! آپ سے ایک ضروری کام تھا۔“

”ابھی تو جماعت کھڑی ہونے والی ہے، پھر آنا.....“ بلکہ وضو کر لو، نماز پڑھ کر اللہ سے جو مانگنا ہے، مانگ لو۔ وہ تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ تم کس پریشانی میں ہو، مجھے معلوم ہے جب سارے نمازی چلے جائیں گے تو بات کریں گے، وہ بھی مسجد میں نہیں۔“

”اچھا۔“ شریف نے بس اتنا کہا اور وضو کر کے ایک طرف آ بیٹھا۔

اکا کا نمازی آنے لگے۔ پھر نماز کا وقت ہو گیا۔ ملا جی نے نماز پڑھائی۔ میں کیوں کہ آدم زاد نہیں، جن زاد تھا، اس لئے احتیاط سے کام لیا۔ کسی آدم زاد کو مسجد میں میری موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ ملا جی نے بڑی رقت آمیز آواز میں دعا مانگی۔ انہوں نے کیا دعا کی، میرے سوا کوئی نہ جان سکا۔ مجھے اس ملا پڑا غصہ آیا۔

وین ملا فی سبیل اللہ فساد

وہ جھلی ملا تھا، اوپر کچھ اندر کچھ۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ نماز پڑھ کر شرافت کے ساتھ وہاں سے نکل لوں گا، مگر مجبوراً مجھے رکنا پڑا۔

ملا نے مسجد کی حدود ہی میں ایک طرف اپنا حجرہ بنا رکھا تھا، حجرہ کیا، اچھا خاصا کمرہ تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ مسجد کی جانب اور دوسرا بیرونی سمت کھلتا تھا۔

دعا مانگ کر مائے مقتدیوں سے مصافحہ کیا۔ شریف بھی مصافحہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے مائے شریف کا ہاتھ دبایا کہ وہ کہیں پھوٹ نہ لے۔ جو مقتدی تھے، شریف کو قابل رحم نظروں سے دیکھتے ہوئے چل دیئے۔ وہ اسی محلے کے لوگ تھے اور شریف بھی وہیں رہتا تھا۔

”چلو اب حجرے میں چلتے ہیں، وہاں بات ہو گی۔“ مائے شریف سے کہا اور اسے حجرے میں لے آیا۔

حجرے کا بیرونی دروازہ پہلے سے بند تھا، مائے مسجد کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی لگا دیا۔

”بیٹھو۔“

شریف نرم و گداز گدے پر بیٹھ گیا جس پر سفید شفاف چادر بچھی تھی۔ کمرہ عطر حنائے مہک رہا تھا۔

”دیکھو شریف! تین مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر عورت کی طرف رجوع کرنے کی گنجائش نہیں۔ وہ تمہاری بیوی تھی لیکن اب نہیں رہی۔ اسے اپنے ”کوارٹر“ سے نکال دو۔“

”مگر وہ جائے گی کہاں؟ اس کا تو کوئی عزیز رشتہ دار زندہ نہیں بچا۔“ شریف نے جیسے فریاد کی۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ وہ تم پر حرام ہو گئی۔ اگر تم نے اسے اپنے ”کوارٹر“ سے نہیں نکالا تو ایک دن محلے والے نکال دیں گے۔ شرع کی رو سے بس ایک ہی.....“

”لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں اور..... اور وہ..... وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔“

”پھر تم نے اسے طلاق کیوں دی؟“

”غصے میں زبان پر یہ لفظ آ گیا۔“

”کچھ بھی ہو، طلاق تو طلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے طلاق کو ناپسند فرمایا ہے۔“

”تو اب کیا ہو مائے جی! نہ میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں، نہ وہ مجھے۔“

”شرع کی رو سے میں اس مسئلے کا ایک حل بتا رہا تھا، مگر تم بول اٹھے۔“

”بولوں بھی نہیں مائے جی! پھر کیا کروں؟ جی چاہتا ہے، دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤں۔“

شریف رونے لگا۔

”خودکشی حرام ہے۔“

”حرام..... حرام..... حرام! کیا زندہ رہنا بھی حرام ہے؟“

”حرام اور حلال میں بال برابر فرق ہے۔ تلواری و حار پر چلنا پڑتا ہے میاں! تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھو گے۔ اگر تم شاہین سے اس کا ذکر نہ کرو تو تمہیں ایک بات.....“

”مائے جی!“ شریف تقریباً چیخ اٹھا۔ ”تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”آرام سے بیٹھو شریف! اونچی آواز میں بولے تو تمہاری ہی رسوائی ہو گی، میرا کچھ نہیں جائے گا۔“ مائے ایک طرح سے دھمکی دی۔

”دیکھو جی مائے جی! تم..... تمہاری زبان پر اب اگر میری بیوی.....“

”اب وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ کتنی دفعہ میں یہ بات کہوں اور جب وہ مجھ سے ملنے خود آئی تو بھی تمہارے نکاح سے باہر ہو چکی تھی۔“

”تو شاہین تم سے ملنے بھی آچکی ہے..... ٹھیک ہے..... اس نے مجھے..... مجھ سے یہ بات چھپائی۔“ شریف نے مائے کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔ ”مائے جی! اگر یہ بات غلط لگی تو میں کم سے کم تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہتے ہی شریف تیزی سے اٹھا۔

شریف لاکھ نوجوان سہی مگر مائے اس سے کہیں زیادہ طاقتور اور عیار آدم زاد تھا۔ وہ بھی تیزی کے ساتھ اٹھا اور شریف کی کلائی پکڑ لی، پھر سخت آواز میں بولا۔ ”بیٹھ جاؤ، زیادہ بہادر بننے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اتنا ہی گھمنڈ ہے تو اپنی کلائی چھڑا کر دکھا دو۔“

شریف جنونی ہو رہا تھا۔ اس نے مائے کا چیلنج قبول کر لیا اور زور لگایا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں خاموش تماشا کی بنا رہا۔ ابھی مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مائے نے چولا بدلا اور نرمی کے ساتھ شریف کو مخاطب کیا۔ ”میں تمہارا اور شاہین، دونوں کا بھلا چاہتا ہوں، مجھے غلط مت سمجھو۔ جس معاملے میں تم مجھ سے مشورہ لینے اور مسئلہ پوچھنے آئے ہو، وہ بھی اسی لئے آئی تھی۔ میں نے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں کوئی اسے میرے حجرے میں نہ دیکھ لے، اس خیال سے دروازے ضرور بند کر دیئے تھے۔“ یہ کہہ کر مائے نے شریف کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔“

شریف کے چہرے پر پہلے الجھن نظر آئی، پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مائے اس سے پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔

”مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میری طرف سے تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی۔ میں تو تم دونوں کا گھر بنا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ شریف نے ایک دم سراٹھا کر سوال کیا۔

”ہاں ہاں، اور کیا۔ مجھے تم دونوں ہی سے ہمدردی ہے۔“

”ہمدردی اسے کہتے ہیں کہ میں اسے اپنے گھر سے نکال دوں؟“

”وہ تو میں نے شرعی مسئلہ بتایا تھا۔ مسئلہ تو اپنی جگہ مسئلہ ہے لیکن اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے۔“ مائے بولا۔ ”اپنے کسی ایسے دوست یا عزیز کو تلاش کرو جو تمہاری خاطر قربانی دے سکے، تم اس پر پوری طرح بھروسہ کر سکو، اس کے ذریعے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”لیکن کیسے؟“ شریف اعتدال پر آنے لگا۔

”تمہارا وہ بااعتماد دوست یا عزیز عارضی طور پر شاہین سے نکاح پڑھوا لے اور پھر اسے فوراً طلاق دے دے۔ شاہین عدت میں بیٹھے اور عدت کے دن پورے کر کے دوبارہ تم سے نکاح کر لے۔ اب سمجھ گئے پورا مسئلہ، اسے حلال کہتے ہیں، یعنی وہی عورت کہ جسے طلاق دی جا چکی ہو، دوبارہ اپنے خاوند پر حلال ہو سکتی ہے۔“

شریف سوچ میں پڑ گیا، کرے تو کیا کرے۔

”شاہین نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میں نے اسے سمجھا بھرا کر ٹال دیا کیوں کہ یہ بات اس سے کہنے کی نہیں تھی۔“

ملا کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ شریف پھر پہلے کی طرح ”ملا جی“ کہنے لگا۔ بولا۔ ”میرا ایک دوست تو ہے ملا جی! وہ بھی آکرے گا ہے لیکن اس معاملے میں..... نہیں، میں اسے جانتا ہوں۔ وہ کناری بازار کے پھیرے بھی لگاتا رہا ہے۔“

”توبہ توبہ۔“ ملا نے کہا۔ ”وہ بازار تو..... مجھے تمہارے ہی شہر کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہاں تو طوائفوں کے کوٹھے تھے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟“ ملا بھولا بن گیا۔

”ہاں ملا جی! آپ کو جس نے بھی یہ بات بتائی ہے، وہ غلط نہیں۔“ شریف نے تصدیق کر دی۔

”پھر کسی عزیز رشتے دار سے بات کرو۔“

”کون عزیز؟ کس کا رشتے دار؟..... رشتے دار تو سلگتی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہیں۔ ایک ہی خاندان کے لوگ، تاج گنج میں برسوں ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ یہاں آکر تو دنیا ہی بدل گئی ملا جی! کس پر بھروسہ کیا جائے؟ کسے اپنا کہا جائے؟ اگر اپنے ہی اپنے ہوتے تو میں اس حال کو کیوں پہنچتا..... کچھ بھی ہو جائے ملا جی! مجھے چاہے یہ شہر چھوڑنا پڑے، اپنا کوارٹر بیچنا پڑے، در بدر ہونا پڑے، شاہین کو میں کسی دوسرے سے حوالے نہیں کروں گا۔“ شریف کے آخری الفاظ فیصلہ کن تھے۔

میں نے سوچا، ان آدم زادوں میں ہر ایک کی الگ الگ پتا ہے۔ شریف نے جب خود ہی ایک فیصلہ کر لیا ہے تو پھر مجھے اس معاملے میں اپنی ”نادیدہ ٹانگ“ پھنسانے کی کیا پڑی ہے۔ جعلی ملا کو پھر کبھی بھگت لوں گا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے بے چارے شریف کی بیوی شاہین پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا، یہ بات میں نے اچھی طرح سمجھ لی تھی۔

شریف اور یوسف میں بڑا فرق تھا، ایک کی سکونت کوارٹر میں تھی، دوسرا جھگی نشین تھا، ایک میں زمانے سے ٹکر لینے کی ہمت تھی، چالاک تھا، دوسرا بالکل سیدھا سادا تھا۔ یوسف کو تو کوئی کھڑے کھڑے بچ بھی دیتا تو اسے خبر نہ ہوتی اور کتا، اچھا تو مجھے بچ دیا گیا ہے، خیر کوئی بات نہیں۔ اسے کس نے بیچا؟ کس کے ہاتھ اور کتنے مین بیچا؟ وہ ہرگز ایسے سوالات کر کے اپنا ”قیمتی دقت“ ضائع نہ کرنا۔ خود کو بیچ جانے پر وہ ممبر کر لیتا۔ بڑے شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور کراچی شہر میں بڑا شہر بن جانے کے تمام ”جراثیم“ موجود تھے۔ بندرگاہ کسی بھی بڑے شہر کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، خواہ وہاں ”بندر“ ہوں نہ ہوں۔ پھر یہ کہ ہر ملک کا دارالحکومت ”سکندر و دارا“ کا مسکن ہوتا ہے، خواہ وہاں آدم زادوں کو دار ہی پر کیوں نہ کھینچا جاتا ہو۔ ریوڑیاں بانٹنے اور ریوڑیاں کھانے والے، سبھی دارالحکومت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں اس وقت کراچی کا معاملہ دوسرے دارالحکومتوں سے ذرا مختلف تھا۔ یہ دارالحکومت ابھی ”ان میٹنگ“ تھا۔

میں وہاں سے سیدھا قائد آباد میں یوسف کے پاس پہنچ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ اٹھنے کو بے

قول رہا تھا۔ (پر تو نا بھی ایک معاوہ ہے، ورنہ آدم زادوں کے پر نہیں ہوتے، اگر پر ہوا کرتے تو وہ بے پر کی نہ اڑایا کرتے)۔

یوسف نے کروٹ لی اور کلمہ پڑھ کر اٹھا، پھر بڑبڑایا۔ ”معلوم نہیں، کیا ہو گیا تھا مجھے..... ایسی سہری نیند تو مجھے بہت دن کے بعد آئی ہے۔“ اسے میرا خیال آیا تو آنکھیں مل کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ ”مقصود سے میں کہہ رہا تھا، جاگ جاؤں گا اور وہ چلا گیا..... معلوم نہیں چلا گیا ہو گا وہ کہ اب تک کسی ٹرین کے انتظار میں ہو گا۔“ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ ”خیر اب تو چلا ہی گیا، کیا کیا جاسکتا ہے..... لیکن مقصود کو جانے سے پہلے مجھے جگا لینا چاہئے تھا۔ عجب ہے وہ بھی۔“

میں اس کی بڑبڑاہٹ سنتا رہا، کچھ بولا نہیں کہ وہ کہیں ”ہشک“ نہ جائے۔ بعض آدم زاد بڑے وہمی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اس پر بھی شک کرنے لگتے ہیں کہ ان کا وجود ہے بھی کہ نہیں، سوچتا ہوں تو ہوں مگر کیا ہوں؟ اب انہیں کون بتائے کہ بھائی میرے، تم آدم کی نسل سے ہو، آدم زاد ہو لیکن وہم کی دوا تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ یہ بھی آدم زاد کہتے ہیں، میں نہیں۔ ایک آدم زاد شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

سب تو ہم کا کارخانہ ہے

یاں دی ہے جو اعتبار کیا

یہ آدم زاد اعتبار اور بے اعتباری کے درمیان جھولا جھولتے رہتے ہیں۔

یوسف کو یاد تھا کہ اسے کوئی کام تلاش کرنا ہے۔ اسے پڑھا لکھا ہونے پر بھی تھوڑا بہت ناز تھا۔ یہ ”چائس“ سو فیصد تھا کہ اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس لگ جائے۔ ”خیال خاطر یوسف“ کے سبب کہ اس کے آکھینے کو ٹھیس نہ لگ جائے، میں اس کا ”کبل“ بنا ہوا تھا۔ جیسے تیسے وہ تیار ہو کر جھگی سے نکلا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔